سیستان
حصہ اول
DIGITAL COPY
مصنف
جی-پی-ٹیٹ
ترجمہ
پروفیسر ایم انور رومان

سیستان دریائے ہلمند کی کارگاہ ہے۔ اس کی سرسبزی وزرخیزی اسی کی آوردہ ہے۔ اسی کے کناروں پر یہاں کی تہذیب و ثقافت نے آنکھیں کھولیں اور انہی پر یہاں کے عظیم الشان شہر آباد ہوئے۔

لیکن سیستان ہلمند کی جولانگاہ اور آماجگاہ بھی ہے۔ ہلمند اس کے اطراف و اکناف میں کھلے بندوں گھومتا پھرتا رہا ہے اور اس کے قرای و مدائن کو اپنی لپیٹ میں لیتا رہا ہے۔

جب سیستان کا انسان خود متحد و مستحکم ہوتا تھا تو ہلمند اُس کے حکم کا پابند ہوتا تھا لیکن جب یہ انسان سیاسی عدمِ استحکام کا شکار ہوتا یا باہمی چپقلشوں میں اُلجھ جاتا، یا چنگیز خان، امیر تیمور اور نادر شاہ کے گرداب میں پھنس جاتا تو ہلمند بھی من مانی پر اُتر آتا۔

انسان اور دریا کی یہ کشمکش اس کتاب کا خاص موضوع ہے۔ چونکہ بلوچستان اور سیستان ایک دُوسرے سے ملحق ہیں اور ان کے طبعی خد و خال بھی جزوی اختلافات کے باوجود ایک جیسے ہیں لہٰذا ان میں آباد قدیم و موجودہ انسانی جمعیتیں بھی ایک ہی ہیں یعنی تاجیک، بلوچ، جاٹ وغیرہ۔ اسی لئے یہ کتاب بلوچستان اور بلوچوں پر بھی روشنی ڈالتی ہے جو گو ضمنی ہے تاہم انتہائی حقیقت کُشا اور تاریخ نما ہے۔ لہٰذا یہ کتاب بلوچستانیات میں بھی ایک گرانقدر اضافہ ہے!

اسے جی پی ٹیٹ نے تحریر کیا جو ایک مشن کے ساتھ بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں سیستان گیا تھا۔ اسی کا اُردو ترجمہ پروفیسر ایم انور رومان نے کیا ہے۔

عابد بخاری

سیستان
حصہ اوّل

سیستان

تاریخ، جغرافیائی خدوخال، آثارِ قدیمہ اور باشندوں کا تذکرہ

حصہ اوّل ۔ حصہ دوم

مصنّفہ: مسٹر جی پی ٹیٹ ۔ ایم ۔ آر ۔ اے ۔ ایس ۔ ایف ۔ آر ۔ جی ۔ ایس
سروے آف انڈیا ۔ اور مصنّف قلّات ۔ احمدزئی خوانین قلّات
کے خاندان اور ملک کا تذکرہ ۔

ترجمہ: پروفیسر ایم انور رُومان
ڈائریکٹر بیورو آف کریکولم ۔
بلوچستان ۔

نساء ٹریڈرز
۷ ۔ جناح کلاتھ مارکیٹ ۔ کوئٹہ
فون: ۷۴۶۸۱

طابع ——— عابد بخاری

مطبع ——— علی پرنٹرز، پیسہ اخبار، لاہور

طبع اوّل ——— اپریل سنہ ۱۹۸۰ء

تعداد ——— ۱۵۰ جلدیں

قیمت ——— دوسو روپے (مکمل دو جلدوں میں)

کتابت ——— اے ایس ممتاز

اصل کتاب :

"SIESTAN — A MEMOIR ON THE HISTORY, TOPOGRAPHY, RUINS AND PEOPLE OF THE COUNTRY."

کے نام سے جی پی ٹیٹ نے تحریر کی جس کی اوّل اشاعت ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ اردو ترجمہ پروفیسر الیم آزوری نے کیا۔

اشاعتی ادارہ :- نساء ٹریڈرز ۔ جناح کلاتھ مارکیٹ۔ کوئٹہ (پاکستان)
فون : ۷۴۶۸۱

تقسیم کار : میسرز گوشۂ ادب، سرکلر روڈ۔ کوئٹہ (پاکستان)
فون : ۷۵۰۰۲

مندرجات

اِنتساب

"کیا فردوس بر رُوئے زمین" محض ایک شاعرانہ ترکیب ہے یا یہ واقعی کہیں موجُود ہے ؟

اگر موجُود نہیں تو کیا یہ ممکن الوجُود ہے ؟

بعض لوگ اسے باغات سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض نخلستانوں سے۔ بعض اسے عظیم الشان عمارات میں متشکّل پاتے ہیں اور بعض اسے زندگی بے آزار گردانتے ہیں !

میرے خیال میں اس کے ہلکے پُھلکے اور جزوی پَرتو بے شمار ہو سکتے ہیں لیکن اگر اسے مکمل طور پر مجسّم دیکھنا ہو تو وہ کائنات کے دلفریب ترین رُوپ، بے لوث محبت کے حقیقی و مثالی پیکر "ماں" میں ہی نظر آ سکتی ہے !

میں خود اپنی عظیم و جلیل ماں کا ترجمہ ہوں اور اپنی یہ ترجمہ کردہ کتاب انہی کے نام نامی سے منسُوب کرتا ہُوں ؎

آفاقہا گردیدہ اُم — مہرِ بُتاں ورزیدہ اُم
بسیار خوباں دیدہ اُم — امّا تو چیزے دیگری

(امیر خسروؒ)

انور رُومان

دیباچہ

آئندہ صفحات میں سیستان کا تذکرہ میرے ذاتی مشاہدات اور اُن معلومات پر مبنی ہے جو مجھے (سَر آرتھر میکیمہون کی سَرکردگی میں) حد بندی کمشن کے دوران قیام میسّر آتے اور جنہیں میں نے بہ کمال احتیاط تاریخ خراسان کے سالہاسال کے گہرے مُطالعات کے نتائج سے منسلک کر دیا ہے مقصد معلومات کو محفوظ کرنا تھا، لہٰذا رپورٹ کچھ زیادہ ہی طویل ہوگئی اور ادبی تاثر بھی مجروح ہُوا۔

رَوایات ماضیہ کا وجود مخدوش ہے کیونکہ ۱۹۰۵ء میں صرف ایک دو بزرگ حضرات تھے جو ان معلومات کی کچھ سُدھ بُدھ رکھتے تھے یا علم کو محفوظ رکھنے میں محتاط تھے سیستان کی آبادی زیادہ تر قبائل یا قبائل کے فاضل حصّوں سے وجُود میں آئی ہے جو نسبتاً ماضیٔ قریب میں یہاں متمکن و متوطن ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ملک کی تاریخ ماضیہ سے قطعاً نابلد ہیں اور جہد للبقا نے انہیں اپنی روزمرّہ زندگی کے مسائل کے سوا ہر چیز سے ماوٴف کر رکھا ہے۔

فرائضِ منصبی سے فرصت کے معدودے چند، دزدیدہ لمحات میں مَیں اس رپورٹ پر نظر ثانی کرسکا ہُوں لہٰذا کماحقہٗ تصحیحات ممکن نہ ہوسکیں۔ اس بنا پر مَیں خامیوں کے لئے چشم پوشی کا اُمید وار ہُوں ——————

جی۔ پی۔ ٹیٹ

مقدّمہ

(پروفیسر ایم انور رُومان - ڈائریکٹر بیورو آف کریکولم، کوئٹہ)

مادری زبان انسان کا قدرتی ذریعۂ اظہار ہے۔ وہ جس روانی سے اس میں سوچ سکتا ہے اور جس مؤثر اور بھرپور انداز میں اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتا ہے وہ غیر مادری یا ثانوی زبان میں ممکن تو ہے لیکن یقینی نہیں۔ زیرِ ترجمہ کتاب کے مصنّف جناب جی۔ پی۔ ٹیٹ انگریز تھے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر اور رائل جیاگرافیکل سوسائٹی کے فیلو تھے، مصنّف تھے اور انگریزی ان کی مادری زبان تھی لیکن ان کی تحریری زُبان سلیس، رواں اور بے تکلّف ہونے کے باوجود کم از کم ایشیائی قاری کی توقعات پر پوری نہیں اُترتی۔ اس میں تکرار ہے۔ بعض فقرے ناگوار طور پر طویل ہیں۔ غیر ضروری جُزئیات ہیں۔ غرضیکہ حشو و زائد کافی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مادری زبان قدرتی ذریعۂ اظہار ہونے کے باوجود لازماً قدرتی ذریعۂ تحریر نہیں ہوتی۔ لکھنے کے لئے ایک خاص مذاق اور طویل مشق کی ضرورت ہوتی ہے اور جو مصنّف ان سے عاری ہو وہ مادری زُبان میں لکھنے کے باوجود پھُسپھُسا اور صبر آزما ہو سکتا ہے۔

اس میں انگریزی زبان کا بذاتِ خود کوئی قصُور نہیں کیونکہ یہ موجُودہ دنیا کی امیر ترین زبان ہے۔ اس کے سرمایۂ الفاظ کا اندازہ تین سے پانچ لاکھ تک ہے اور یہ واحد زبان ہے جو دونوں نصف کرّوں، پانچوں برّ اعظموں اور ہر برّ اعظم کے متعدّد ملکوں میں سمجھی، بولی اور لکھی جاتی ہے۔ اس کے مصنّفین میں انگریزی النّسل، یوروپی نژاد، آسٹریلوی، ایشیائی اور افریقی سبھی شامل ہیں گویا یہ پورے کرّہ ارض کی ایک نمائندہ و ترجمان زبان ہے اور اس کا دائرہ فکر و نظر اور حلقۂ اظہار و ابلاغ اتنا ہی وسیع ہے جتنا کرّہ ارض۔ موضوعات و مفاہیم کے اعتبار سے بھی یہ وسیع ترین ہے۔ حقیقتاً یہ زبان قادر الاظہار ہے۔ لیکن زبان اپنی جگہ کتنی بھی پُر امکان کیوں نہ ہو جب یہ تحریر کی صُورت میں جلوہ گر ہوتی ہے تو اس کی

ساری خوبیاں، لطافتیں، پہنائیاں اور گیرائیاں صاحبِ قلم سے متعیّن ہوتی ہیں۔ وہ جتنا صاحبِ ذوق و قدرت ہوگا زبان اتنی ہی شیریں اور پُر اظہار ہوگی۔ اس لحاظ سے زبان زمین سے مشابہ ہے۔ ایک بنجر یا گھٹیا زمین ایک جفاکش اور پُرعزم کسان کے تصرّف میں آکر بار ور ہوسکتی ہے لیکن ایک زرخیز قطعۂ زمین ایک لااُبالی اور بے نیاز کسان کے قبضے میں آکر بے برگ و بار رہ سکتا ہے: ؎

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذّتِ درد　　　کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

لیکن زبان کی اظہاریت سے کماحقہٗ متمتّع نہ ہونے یا اسے اجاگر نہ کرنے کی وجہ صرف مصنّف ہی نہیں بلکہ موضوع بھی ہوسکتا ہے۔ بعض موضوعات آمد والقا کے موضوعات ہیں اور بعض آورد وجبر کے۔ اوّل الذّکر میں تو مضمون اور اس کے الفاظ و پیرایۂ بیان یکبارگی ذہن میں آجاتے ہیں لیکن آخر الذّکر میں نگارندہ کو کافی جد وجہد کرنا پڑتی ہے۔ اوّل الذّکر زیادہ تر شاعری اور فنِ لطیف پر محیط ہے لٰہذا ہم اسے علم وفضل کا ذریعۂ اعظم نہیں کہہ سکتے۔ یہ ذریعہ مؤخر الذّکر ہی ہے، جسمیں تحقیق، تنقید، تاریخ، معاشرتی و طبعی علوم اور سائنس وغیرہ شامل ہیں لیکن یہاں بھی ایک ہلکی سی تمیز ضرور ہوسکتی ہے۔ زیادہ تر علوم ایسے ہیں جنہیں ہم صرف آرٹ یا صرف سائنس کہہ سکتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو دونوں کا امتزاج ہیں۔ کم ازکم تاریخ ایسا ہی علم ہے۔ اس کا واقعاتی و تجزیاتی پہلو تو خالصتاً سائنس ہے لیکن شخصیاتی اور ڈرامائی پہلو آرٹ یعنی ادب ہے۔ لٰہذا قلمکار بسااوقات خشک اور سپاٹ ہونے پر مجبور ضرور ہے لیکن بعض حصّوں میں مضمر لطافتوں پر اپنے قلم اور قوّتِ بیان کی بہار اور جولانی دکھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ خود ذوق ادبی سے بھی اتنا ہی مالامال ہو جتنا تشنگیٔ علم سے اور صاحبِ طرز ہو! ٹیٹ صاحب کا ایک تو موضوع خالص تاریخ نہیں بلکہ تاریخ، جغرافیہ، آثارِ قدیمہ اور باشندے ہیں جو ان کے ذہن و قلم کی زنجیر بنے رہے اور دُوسرے وہ خود ادبی چاشنی سے محرُوم تھے۔ ان کے قلم سے کوئی بھولا بھٹکا ادبی فقرہ بھی شاذو نادر ہی نکل سکا اور وہ شروع سے آخر تک اتنے ہی خشک اور بے کیف رہے جتنا ان کا موضوع یعنی سیستان تھا۔

لیکن یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہر لکھنے والا میکالے یا سٹینلے لین پول یا کم ازکم چارلس ڈوی ہیزن نہیں ہوسکتا۔ ایسے افراد تو نادرۂ روزگار ہوتے ہیں اور اکثریت ٹریوی لیئن، میریٹ اور ایڈمسن وغیرہ

کی ہوتی ہے۔ ٹیٹ صاحب اسی اکثریتی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور اوّل الذکر اقلیت متخیلہ سے نہیں۔ ویسے بھی یوروپ یا مغرب کے لوگ سرد خطّہ ارض کے ہیں لہٰذا سرد مزاج، سرد اندیش اور سرد نگار ہیں اسی لئے سائنس کا جو مذاق انہوں نے پایا ہے مشرق میں وہ اتنا نمایاں نہیں۔ انہیں کائنات اور انسان میں محض شاعری سے زیادہ ان کی اناٹومی اور توانائی سے سروکار رہا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدانخواستہ اہلِ یوروپ شعر و فن میں اپنا اظہار نہ کرسکے یا اپنا لوہا نہ منوا سکے۔ انہوں نے شعرِ نفیس اور فنِ لطیف میں وہ کارہائے نمایاں کئے کہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی تو وہ مشرق کو بھی گرد راہ بنا گئے! مشرق آب و ہوائی لحاظ سے گرم خطّہ ارض ہے لہٰذا اس کے لوگ گرم جوش ہیں۔ احساسات کی جو آنچ انہیں نصیب ہے وہ بابد و شاید ہی اہلِ یوروپ کے حصّہ میں آئی ہے۔ رکھ رکھاؤ، نوک پلک، تزک و احتشام، جاہ و جلال اور ٹیپ ٹاپ وغیرہ کے جو نظریات اہلِ مشرق کے ہیں اور ان کے جو عظیم الشّان تاریخی مظاہرے انہوں نے کئے ہیں وہ اہلِ یوروپ کو کہاں میسّر؟ لہٰذا اہلِ مشرق کو لطفِ فن کی اسی نمود میں آتا ہے جس میں لطافت و نفاست کی چاشنی ہو۔ اَب بیچارے ٹیٹ صاحب کو بھلا مشرق کے مزاج کا کیا شعور تھا؟ وہ حسِ لطیف سے شاید بہرہ ور تو ہوں لیکن اس سے کتراتے ہیں۔ ڈرامائی لمحات انہیں پکارتے رہیں یا واقعات کی معنویّت اُن کا دامن پکڑتی رہے۔ اہم سے اہم شخصیات (جیسے چنگیز خان، امیر تیمور، نادر شاہ، احمد شاہ) اُن کے نوکِ قلم پر آتی رہیں یا تاریخ کے فیصلہ کن موڑ انہیں ٹوکتے رہیں، وہ اپنی سلامتی ان سب سے دامن بچا کر گذر جانے میں ہی سمجھتے ہیں! لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ٹیٹ صاحب نرے ٹھیٹ اور ٹھس تھے۔ اُن کے محاسن و مکارم کچھ کم نہیں ہیں۔

اوّلاً یہی کیا کم ہے کہ انہوں نے مشرق کو اپنا مرکز دلچسپی بنایا اور پھر مشرق سے بھی وہ خطّہ چنا جو تاریخ کے پسماندہ حصّوں میں سے ہے یعنی سیستان! لیکن یہ ایک تاریخی سنگھم ضرور رہا ہے مختلف نسل پاروں اور انسانی جمعیتوں کا مورد عتاب رہا ہے۔ مختلف حملہ آوروں اور قسمت آزماؤں کا تختۂ مشق رہا ہے۔ یکے بعد دیگرے طبعی و سیاسی تغیّرات کا اور جولانگاہ رہا ہے دریائے ہلمند کی

طغیانیوں اور حشر سامانیوں کا ہمہ اتنے مختلف المناظر خطے میں قدرتی جغرافیائی وحدت کے پہلو بہ پہلو کسی تاریخی اور ثقافتی وحدت کے رشتے کو تلاش کرنا اور پھر اس کے شکستہ و ریختہ حصّوں کو تاریخ ما قبل تاریخ کے ملبے سے کڑیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جوڑنا آسان کام نہ تھا۔ ٹیٹ صاحب نے اس دشوار اور ملکا لینے ہوئے کام کو لبیک کہا اور وہ اس سے گتھم گتھا ہو گئے۔

ثانیاً موضوع پر یوروپ میں مواد نہ ہونے کے برابر میسّر تھا لہٰذا انہوں نے عربی و فارسی مآخذ کی چھان بین کی اور پھر جو کچھ ان سے ملا، جو کچھ یوروپی سیاحوں یا سرکاری عمّال یا مسیحی مبلّغین سے ملا اُسے اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کے ساتھ منسلک کر کے پیش کر دیا۔ مسلمان علم التاریخ کے موجد تو نہ تھے لیکن انہوں نے اسے زندہ کیا، صیقل کیا اور زندہ رکھا لیکن مشکل یہ ہوئی کہ ایرانی مورخین قبولِ اسلام کے بعد بھی اپنی ایرانیت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے اور ایرانیت کے تشکیلی عناصر میں غالباً اہم ترین ان کی شہنشاہ پرستی تھی۔ اُن کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا مرکز و محور شہنشاہ تھا۔ اسلام نے شہنشاہیت ختم کر دی تھی لیکن وہ کسی شہنشاہ کو ہی ڈھونڈتے رہے اور جونہی موقعہ ملا یا جونہی کوئی اس کے قابل نظر آیا وہ فوراً اسے چشمۂ شیریں سمجھ کر مور و ملخ کی طرح اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اسلام کے مخصوص جمہوری نظامِ معاشرہ کی ناکامی اور بادشاہت کی بحالی میں ایران کا اثر بہت نمایاں ہے لہٰذا ایرانی مورخین کی تحریرات کے ہیرو بادشاہ، سلاطین اور ملوک رہے اور تاریخ واقعی "بادشاہوں" درباروں اور اُن کی فتوحات کا روزنامچہ بن کر رہ گئی۔ ٹیٹ صاحب بھی نتیجتہً مجبور تھے کہ وہ اپنے مآخذ کی معلومات پر انحصار رکھتے۔ بہر حال انہوں نے نہایت جاں فشانی اور عرق ریزی سے کام لیا اور جو کچھ دستیاب ہوا وہ پیش کر دیا۔

ثالثاً ٹیٹ صاحب اپنی تحریر میں ادبی چاشنی تو پیدا نہ کر سکے لیکن اس کا عظیم ترین فائدہ یہ ہوا کہ ان کی کتاب شروع سے آخر تک اُن کے داخلی میلانات اور پسند و ناپسند کی آلودگی، جزوّیت اور افراط و تفریط سے بچ گئی اور ہمیں اکثر خالص اور ٹھوس حقائق، واقعات اور روایات اپنی اصلی شکل میں مل گئے اور یوں ان کی بنیاد پر مزید کام آسان ہو گیا۔ اگر ٹیٹ صاحب کی داخلیت بھی در آتی ہوتی تو نہ جانے کتنے سال بعد ان غلافوں کو اتار اتار کر "یار آشنا" کی شکل دیکھنا نصیب ہوتی! موجودہ شکل میں

کتاب سرتاپا سیستان کی آئینہ دار ہے جسمیں مصنّف کی رنگ آمیزی قطعاً نہیں۔ ٹیٹ صاحب کی فراہم کردہ معلومات نہایت قیمتی ہیں اور آج پون صدی گذرنے کے بعد بھی اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ البتہ ٹھوس معلومات اور دستاویزات کی کمیابی کے باعث اُن کی قیاس آرائی بعض اوقات مشکوک معلوم ہوتی ہے مثلاً سینکڑوں میلوں کے فاصلے کے باوجود جھلاوان کے مینگلوں (کہ بنیادی جمعیّت یا ملغوبہ ہیں جن سے غالباً ذگر مینگلوں کا شرارہ بھی پھوٹا) کو نوشکی کے ذگر مینگلوں کا ریزہ جیں اور حاشیہ نشیں کہنا شاید صرف اسی بنا پر معاف کیا جا سکتا ہے کہ ٹیٹ صاحب کے وقت ان علاقوں کے متعلق اہلِ یوروپ کا جغرافیائی علم بہت محدود تھا۔

کتاب کا حصّہ سوئم "سیستان کے آثارِ قدیمہ" بالخصوص قابلِ داد بلکہ مصنّف کی محنتِ شاقہ، دروں بینی، دیدہ ریزی، جُزرسی، کُل جوئی اور ماحول آفرینی کا شاہکار ہے۔ اُس کے سامنے نہ تو صحیح سالم عمارات تھیں اور نہ ہی اکثر و بیشتر واضح کھنڈرات تھے لیکن جس ہمّتِ مردانہ سے وہ اِن اجاڑ ملبوں، متعفن ڈھیریوں اور بے ہنگم انباروں میں گھومتا پھرتا رہا، جس عرق ریزی سے اُس نے پنڈول، کہگل اور سنگ و خشت کا معائنہ کیا خواہ یہ صحیح سالم تھے یا پارہ پارہ، جس غور سے اُس نے در و دیوار، طاق و محراب، فرش و سقف اور کرسی و بام کو دیکھا خواہ یہ جُزوی طور پر سلامت تھے یا پاش پاش ہو چکے تھے، جس ژرف نگاہی سے اُس نے نکاسِ آب رسانی، ہوا رسانی اور دفاع کے انتظامات کو سمجھا اور جس محنت و تصوّر سے اُس نے پتھر کے کسی ٹکڑے، اینٹ کے کسی پارے، لوحِ مزار کے کسی حِصّے، آرائش کی کسی لکیر اور سکّے کے کسی مدّھم کتبے سے ایسے نتائج اخذ کیے جو کافی حد تک قرینِ قیاس ہیں ——— وہ سب عدیم المثال ہے اور صرف اسی کا حصّہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حصّہ کتاب کی جان اور اُس کا حاصل ہے اور گو بقیہ تینوں حصّے بھی اپنی اپنی جگہ بے حد اہم اور معلومات افزا ہیں تاہم یہی حصّہ اُسے زندۂ جاوید کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اِس لئے کہ اُس نے بمصداق "عجم زندہ کردم بدیں پارسی" (فردوسی) سیستانِ باستان کو زندہ کر دیا!

کتاب کے مُطالعہ سے سیستان کی جو تصویر اُبھرتی ہے وہ دلنواز و دلآویز تو نہیں لیکن سبق آموز ضرور ہے ۔ یہ انسان اور قوائے فطرت (دریا وغیرہ) کی طویل اور مُسلسل آویزش کی کہانی ہے۔ سیستان کی زرخیزی اور بار آوری ہلمند کی مرہونِ منّت ہے لیکن اس کی پیداواری صلاحیت کا دار و مدار اس انسانی صلاحیت پر موقوف رہا ہے جو انسان کو دریا پر قابو پانے میں حاصل رہی ۔ کہانی کی ابتدا سے آج تک قاری کو یہ احساس مسلسل ستاتا ہے کہ اگر یہاں کا انسان مزید علم و فضل سے مزّین و مسلّح ہو کر مخفی قوائے فطرت کو زیادہ سے زیادہ اپنے تمتّع کے لئے استعمال کرسکتا تو کتنا اچھا ہوتا ! سیستان کے لق و دق صحرا بھی متبسّم و مترنّم ہو کر تمتما اٹھتے اور امریکہ کے چپّے چپّے سے جو سونا برآمد ہوتا ہے وہ شاید یہاں سے بھی اُبل سکتا !

کوئٹہ

۵ ر اکتوبر ۱۹۷۹ء

(پروفیسر) انور رُومان

○

حصّہ اوّل

تاریخ سیستان

تاریخ سیستان

باب اوّل

وسط ایشیا کے نخلستان، جو سمرقند، مرو، بلخ اور زرخیز وادیٔ ہرات کے گرد و پیش کے خوش قسمت اور مشہور و معروف اضلاع پر مشتمل ہیں، منظر تاریخ پر آنے سے صدیوں پہلے زرعی آبادی کے مساکن و مراکز رہے ہیں۔ سیستان میں دریائے ہلمند کا ڈیلٹا بھی رقبے کے سوا ہر لحاظ سے دیگر مشہور تر علاقوں کا ہمسر تھا۔ لیکن اوّل الذکر مرور زمان کے ساتھ ایک بدبختی نسل کے فرمانرواؤں کے قبضے میں چلا گیا اور قدیم نسلیں نوواردوں کی دبیز تہہ کے نیچے دب گئیں۔ لیکن سیستان طویل و عریض صحراؤں یا نیم غیر آباد علاقوں میں محصور ہونے کی وجہ سے ایک دُور اُفتادہ خطّہ تھا اس لئے ایک صدی بیشتر تک حکمرانوں کے ایک خانوادہ یعنی کیانی ملوک کی میراث بنا رہا جو ماقبل تاریخ کی ایرانی سلطنت کے قدیم ترین خاندان کے چشم و چراغ ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں۔

یہ دعوٰی بہت صدیاں پہلے کیا گیا اور شاید اس لئے قائم رہا کہ اس کے خلاف کوئی شہادت پیش نہ کی جا سکی اور اب اس کی تردید یا تکذیب بعد از وقت ہے۔ لیکن سیستان کے کیانی واحد خاندان نہیں ہیں جو ایران کے نیم تاریخی فرمانرواؤں کو اپنے آباؤ اجداد بتلاتے ہیں ہندوستان میں متوطّن پارسی جاتی میں بھی ایسے خاندان ہیں جو کیانی کہلاتے ہیں اور جاتی ان کے ان دعاوی کو برداشت یا تسلیم کرتی ہے۔ مشرقی قلمکار، جو ایرانی قدیم سلطنت کے یکے بعد دیگرے حکمران خاندانوں کی تاریخ لکھتے ہیں، عموماً خالص مقامی شاہی خاندانوں کو ایک ہی نسل یا نسبت سے منسوب کر دیتے ہیں جو ابتدائی خاندانوں کے ابا و اخلاف تھے جن کا تختہ

اُلٹ دیا گیا اور جو فاتحین کے حملوں اور استیلا کی وجہ سے کچھ عرصے تک قعرِ گمنامی میں چلے گئے۔

پارسیوں کا عقیدہ ہے کہ ایرانی کشور کشاؤں کا قدیم ترین خاندان کیانی تھا اور اسفندیار کا باپ اور بہمن کا دادا، گشتاسپ اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اُن کا دارالخلافہ بلخ تھا جو خراسان کا قدیم ترین شہر تھا۔[1]

ہخامنشی خاندان کیانیوں کے ہی کسی جانشین کا بنا کردہ تھا یا انہی کا تسلسل تھا۔ اس خاندان کا دارالحکومت پسار گادے اور شوستر تھا۔ ان دونوں خاندانوں کے درمیان ایک طویل وقفہ ہے جس کے دوران اہلِ ایران پر آشوری غالب رہے اور اُن کے بعد اہلِ میڈیا کا پانی بھرتے رہے۔ ایسی صورتِ حال میں دارالحکومت کی تبدیلی بعید از قیاس نہ تھی بلکہ بحیرہ روم کی ساحلی ریاستوں کے ساتھ تعلقات نے دارالحکومت کو مغربی جانب منتقل کرنا ضروری بنا دیا تھا۔

دربارِ شاہی اور درولیست کا صدر مقام کسی بھی خوشگوار مقام پر ہو سکتا تھا جہاں شاہی خیمے

---

[1] اکثر سیاحوں نے بلخ (اوستا کا قدیم بخدی) کا ذکر ہی نہیں کیا۔ بعد کے تذکرے لوگوں کی دسترس سے باہر رہے۔ مندرجہ ذیل بیان ڈاکٹر گیرارڈ' برنز کے رفیق سفر کی بیاض سے ماخوذ ہے جو سفرِ بخارا میں اُس کے ساتھ تھا۔ موخر الذکر نے لکھا کہ موجودہ باشندے آپ کو بتائیں گے کہ "بلخ اور کابل کے درمیان کا علاقہ باختر زمین کہلاتا ہے"۔ (جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال' جلد دوم' صفحہ ۳۰۷)

اس نام کا اطلاق کابل کے جنوبی علاقوں پر بھی ہوتا تھا۔ ملفوظاتِ صاحبقران اور روضتہ الجنّات کے مطابق موجودہ قندھار کے ارد گرد اور جنوب کا علاقہ باختر زمین کہلاتا تھا۔ ڈاکٹر گیرارڈ بلخ کے بارے میں لکھتا ہے: "کھنڈرات زیادہ تر مٹی کے ہیں اور وسیع ہیں لیکن وہ صرف شہر کی موجودہ جگہ کے مظہر ہیں۔ بلخ کی غیر صحت بخشی مشہور ہے..... اس کو سیراب کرنے والی اٹھارہ خوبصورت کاریزیں کاشتکاروں کے زیرِ استعمال نہیں رہیں اور ان کا پانی علاقے بھر میں پھیل گیا ہے اور رسہلنے بڑی منظر کو بدبودار دلدل میں بدل دیا ہے" (ایضاً' ص ۱۵) برنز اور گیرارڈ نے مورکرافٹ اور اس کے رفقائے سفر' ٹریبک اور گتھری کی قبروں کی زیارت کی۔ یہ شہر کئی نسلوں تک جنگ کے اُلٹ پھیر کا شکار بنا رہا جو سلطنت تیموری کے حصول کے سلسلہ میں امیر کبیر کے بیشمار جانشینوں کے درمیان جاری رہی۔ روضتہ الصفا کے مصنّف کے مطابق بلخ کی تباہی شیبانی خان اُزبک کے ہاتھوں مکمل ہوئی جس نے ۹۰۹ھ /۱۵۰۳ء کی سردی میں محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔

گاڑ دیئے جاتے تھے لیکن شاہی خاندان کے دستاویزات اور مذہب کے مرکز کے لیئے ایک شہر منتخب کیا جاتا تھا۔ جس پہ قدرت زیادہ فیاض ہو اور جہاں سال کا کچھ حصہ گیتی پناہ ضرور سکونت رکھتے ہوں۔ یہی برسرِ اقتدار خاندان کا دارالحکومت بن جاتا تھا۔ سلطنت بجائے خود بے لگام حد تک وسیع تھی اور بڑے بڑے صوبوں پر مشتمل تھی جن پر مرکزی حکومت کے مقرر کردہ خشتراپون حکومت کرتے تھے۔ بیشتر حالات میں یہ خشتراپون یا گورنر اُن علاقائی خاندانوں کے افراد ہوتے تھے جن کے بیشمار پیرو ہوتے تھے اور جو بصورتِ جنگ انہیں میدانوں میں لاسکتے تھے لہٰذا وہ اپنے اپنے صوبے کا طاقتور ترین طبقہ ہوتے تھے۔

ان بڑے بڑے خاندانوں کی اطاعت گذاری گیتی پناہ کو طاقتور اور فتحیاب بناتی تھی اور ان کی اطاعت گریزی اسے ان کا تعاون و اشتراک حاصل کرنے کے لیئے منت سماجت کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

گیتی پناہ کے ذاتی اوصاف و خصائل ایسی وسیع سلطنت کے متخالف و متصادم اجزا کو یکجا رکھنے کا ذریعہ ہوتے تھے۔ ایک عظیم سپاہی جو خود ایک کامل جنگ آزما ہو اور ایک مدبّر دانشمند بھی اپنی رعایا کو اطاعت شعاری پر مجبور کر سکتا تھا۔ اُس کے ذاتی اور متصادم مفادات کو دبا سکتا تھا اور ہمسایہ سلطنتوں پر بھی اپنا رُعب داب قائم کر سکتا تھا۔ البتہ ایک کمزور جانشین کے تحت نسلی مخاصمتیں اور ذاتی رقابتیں اور طاقتور سرداروں کی چپقلشیں اُبھر آتیں اور یُوں کسی وقت کی محترم و مرعُوب کن سلطنت کسی ایسے دشمن کے رحم و کرم پر ڈال دی جاتی جو تعداد میں کم ہونے کے باوجُود کسی یک رُخ لشکر کا قائد ہوتا اور جس کی باگ ڈور کسی مسلّمہ مرکز کے ہاتھ میں ہوتی۔

قدیم سلطنت ایران کے سیاسی ڈھانچہ کی اس حالت کو شاہنامہ میں بہت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ شہزادہ خراسان کی ذاتی جوانمردی اور مسلح طاقت کی امداد کے بعد ہی شہنشاہ سیتھی حملہ آوروں کو پسپا کر سکا۔

دیو مالائی بادشاہ فریدوں نے اپنی تعمیر کردہ سلطنت اپنے تین بیٹوں میں بانٹ دی اور

بعض شہادتوں کے مطابق اُس نے صُوبہ خراسان بمعہ بحرہ ہائے ہند و سندھ اپنے بیٹے ایرج کو دیئے۔ ضحاک تازی اپنی باری پر مغلوب ہُوا اور اُس کے متعدد لواحقین ضلع غور میں پناہ گزین ہُوئے اور فریدوں کی رعایا بن گئے۔

رُستم کا مورث اعلیٰ، کرشاسپ فریدوں کی طرف سے کابل، زابل اور سیستان کا گورنر تھا گویا بنو ضحاک بھی اُسی کے ماتحت تھے۔ اُس کے بھتیجے نریمان کے ہاں ایک بیٹا، سام پیدا ہوا جو زال کا باپ بنا۔ کہا جاتا ہے کہ سام زابل اور کابل تا بہ حدودِ ہند پر حکومت کرتا تھا اور فرمانروایان ایران کا باجگزار تھا۔ زال اپنی آبائی جاگیر کا مالک بننے کے بعد زرنج (نبا کردہ کرشاسپ) سے زابل چلا گیا اور بنو ضحاک کا محراب شاہ بحیثیت باجگزار حکمران زال سے ملنے آیا اور اُس کی اطاعت بھی قبول کر لی۔ محراب شاہ نے اپنی بیٹی کی شادی بھی زال سے کر دی جو رستم کی ماں بنی۔

اسی محراب شاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بعد میں اُس نے اوّلین کیانی فرمانروا، کیقباد اوّل کی فوج کے دائیں بازو کی قیادت کی جب موخر الذکر کو افراسیاب اور ترکوں کے خلاف نبرد آزمائی کرنا پڑی۔

لیکن جامع التواریخ میں یہ مرقوم ہے کہ جب یہ حملہ آور جیحوں پار کر کے خراسان میں داخل ہوا تو اُس نے ایک حصّہ فوج سام کو روکنے کے لئے علیحدہ کر دیا۔ اُس وقت محراب شاہ زال کے نائب کی حیثیت سے زابل کے شہر اور قلعہ کا حکمران تھا۔ جب حملہ آور ہرمند پہنچے تو اوّل الذکر نے غنیم کے سالار کو ایک پیغام بھیج کر دھوکہ دینے کی کوشش کی کہ وہ نہ زابلی تھا نہ ایرانی بلکہ ضحاک (جو درحقیقت غیر ملکی تھا) کی نسل میں سے تھا لہٰذا افراسیاب سے وفاداری کی طرف مائل تھا۔

زال کا باجگزار علاقہ حدود خراسان میں شامل تھا۔ روضتہ الجنّت فی اوصاف مدنیتہ الہرات کے مصنّف نے اس عظیم صوبے کے شہروں کے مختصر کوائف قلمبند کئے ہیں۔ اُس نے اپنی تاریخ ۸۹۸ھ میں لکھی اور گو وہ قدیم مصنّف نہیں ہے تاہم اس نے خراسان کے عظیم شہروں کی بنیاد کے متعلق اپنے صدیوں پہلے کے پیشرؤوں کے بیانات اور علاقے کی صدری روایات سے اکثر و بیشتر

استفادہ کیا ہے۔

بلخ یا اس کے قریب ہی ایک مشہور و معروف آگ مندر تھا جس کا نام بہار تھا اور دنیا بھر کے آتش پرست اس کی تعظیم کرتے تھے۔ اس آتشکدہ کے کھنڈرات مصنف کے وقت تک موجود تھے اور اس نے ذکر کیا ہے کہ ایک روایت زبان زد خاص و عام تھی کہ ان کھنڈرات کے نیچے گنجہائے گرانمایہ مدفون تھے۔

یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ پارسی روایات کے مطابق یہ شہر گشتاسب کا دارالحکومت تھا۔ ہرات کا شہر، جو بعد میں خراسان کے دارالحکومت کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ شمیران، خندوز' اور خیابان' یا آوٗیہ سے بہت بعد میں بسایا گیا لیکن یہ ان سب پر سبقت لے گیا اور مرور زمان کے ساتھ یہ قصبے، دیہات یا اضلاع شہر ہرات کے مضافات یا تابع بن کر رہ گئے۔

ملا معین نے ایک رباعی پیش کی ہے جو اس عہد میں مشہور تھی اور جو تعمیر ہرات کے سلسلہ میں ایک مختلف نظریہ پیش کرتی ہے۔

لہراسپ نے ہری کی بنیاد رکھی۔
گشتاسپ نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔
اس کے بعد بہمن نے عمارات تعمیر کیں۔
اور سکندر رومی نے اسے ہر لحاظ سے انجام تک پہنچا دیا"۔

لیکن زابل یا زاول خراسان کا بڑا شہر تھا جبکہ بلخ سلطنت کی راجدھانی تھا۔ زال ابن سام کے باجگزار علاقے کے صوبوں کے بڑے شہر بھی تین تھے یعنی زابل، کابل اور زرنج۔ زال کے بعد یہ باجگزار علاقہ اس کے بیٹے رستم کے قبضہ میں آیا۔

ملا معین کے زمانہ تک زابل یا زاول کا نام چلتا رہا۔ یہ اس وقت اسفرار یا سبزوار کا ایک ضلع تھا جو اس مصنف کی جائے پیدائش تھی۔ زاول کنولی کے نقشہ میں بھی ظاہر کیا گیا ہے جو اس نے اپنی سیاحت سیستان کے سلسلہ میں کھینچا اور جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں ۱۸۴۰ء میں شائع ہوا۔ شاید یہ نام اب بھی موجود ہو۔ ملا معین کے مطابق اس کے زمانے میں

ضلع زاول ۳ فرسخ دور تھا۔ اس میں ۸۰ کاریزات تھیں جن میں سے ہر ایک سے اتنا پانی خارج ہوتا تھا کہ ایک پن چکی کو چلا سکے اور بعض میں تو پانی اتنا زیادہ تھا کہ ان کی صفائی یا مرمت ناممکن تھی کیونکہ اگر پانی کا بہاؤ روک دیا جاتا تو وہ فوراً کنوئیں کی منڈیر و سے اچھل کر زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔

اِسفرا[؟]ر یا سبزوار کے متعلق اُس کا کہنا ہے کہ لوگ اسے ہرات کی نسبت بہت قدیم سمجھتے تھے اور اُس کے دور سے ...۳۰۰ سال پرانا بتلاتے تھے اور اُس کا دور ۴۲۵ سال پہلے کا تھا۔ وہ ایک قدیم حصن حصین کا بھی بیان کرتا ہے جو ملکہ بلقیس کا شاہرستان کہلاتا تھا۔ اس کی دیواریں چٹان کی ایک اُبھری ہوئی پرت پر ایستادہ ہیں جو سطح زمین سے کم و بیش ایک گز بلند ہے۔ قلعہ کے ارد گرد دہری بھری چراگاہیں ہیں اور پانی سطح زمین سے ایک گز سے زیادہ نیچے نہیں ہے۔ اس وجہ سے اور چٹان کی بدولت بھی جس پر اس کی دیواریں کھڑی ہیں، اس کی مورچہ بندی کو تباہ کرنا ممکن نہ تھا۔ شہر اسفرار اس قلعہ اور ایک اور قلعہ کے درمیان واقع تھا جو مظفر کوہ پر بنا ہوا تھا لیکن مؤخر الذکر ایک جدید تعمیر تھی کیونکہ اس کی بنیاد الب غازی[1] سے منسوب کی جاتی تھی۔ جبکہ

---

[1] الب غازی ۶۰۰ ھ (= ۴-۱۲۰۳) میں ہرات کا گورنر تھا جس نے شہر سلطان شہاب الدین غوری کے حوالے کر دیا۔ وہ شہزادگان غیاث الدین اور شہاب الدین غوری کا بھانجا تھا۔ میجر راورٹی کی طبق ناز، صفحہ ۴۷۵ کے مطابق الب غازی غالباً مظفر کرہ کے قلعہ کا بانی تھا۔ لیکن قوی امکان یہ ہے کہ اس نے اسے صرف بحال کیا جبکہ یہ ماقبل تاریخ دور کا ایک قلعہ تھا۔

ملاّ معین سبزواری نے ۴۲۵ سال پہلے اس مشہور قلعہ کو یوں بیان کیا۔ پختہ اینٹوں اور چکنے گارے سے پہاڑیوں کی ایک شاخ پر بنا ہوا جو ایک سنگلاخ چٹان تھی، بہت اونچا اور ہیبت میں پُرشکوہ اور محیط میں تقریباً ایک فرسخ۔ (= چار میل کے لگ بھگ)

اُس کا بڑا دروازہ دریائے اسفرار کے کناروں پر پہاڑی کے دامن میں ہے جبکہ قلعہ پہاڑی کی چوٹی پر ہے اور بہت بلند اور پر ہیبت ہے۔ قلعہ کے اندر جامع مسجد، بازار، بلند عمارات اور کاروانسرائے ہیں جن کی بلا استثنا گچکاری کی گئی ہے۔ دیواریں اتنی چوڑی ہیں کہ سات گھوڑا سوار بیک وقت گذر سکتے ہیں۔ باب عالی کے اندر

ملکہ بلقیس کا قلعہ ماقبل تاریخ ادوار کا تھا۔ کنولی کے نقشہ کے مطابق اِسفرار یا سبزوار کا شہر ضلع زاول کے مغربی حصّہ میں واقع ہے۔ یہ رودِ بوزغانان کے اُدَرسکان سے سنگھم پر تعمیر کیا گیا تھا۔ مؤخر الذّکر ایک ندی تھی جس نے تین طرف سے شہر کو گھیرا ہوا تھا۔ یہ جگہ آبِ شیریں اور ہوائے جانفزا کے لئے مشہور تھی۔ اس کی چراگاہیں (اُلنگ) وسیع، اس کے اشجار خوبصورت اور اس کی قناتیں یا آبی گذرگاہیں شاندار تھیں اور نتیجتہً اس کے پھل خراسان بھر میں مشہور تھے۔

کرنل ییٹ اپریل ۱۸۹۳ میں سبزوار گیا تو دیکھا کہ دارالحکومت کے کھنڈرات اس کے اردگرد کے باغات میں چھُپے ہوئے تھے۔ پانی وافر تھا اور کاشتکاری خوب ہوتی تھی۔ گورنر کی اقامت گاہ کی چھت سے نظر آنیوالے منظر کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ "مئی کی اس شام کو قصبے کے نیچے کی تمام زمین ہریالی کی ایک چادر معلوم ہوتی تھی اور فرح کی گرمی کے بعد ہوا خنک اور خوشگوار لگتی تھی" اس مصنّف نے مظفر کوہ کے قلعہ کا بھی ذکر کیا جو قصبہ کے جنوب میں قریباً تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ اُسے بتایا گیا کہ اس جگہ کا نام قلعۂ دُختر تھا لیکن چونکہ اس کا بیان ملّا معین کی فراہم کردہ معلُومات کے مُطابق ہے لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ مظفر کوہ کا قلعہ اور قلعۂ دختر ایک ہی ہیں جس کا حال سابقہ فٹ نوٹ میں دیا گیا ہے۔

کرنل ییٹ نے یہی ذکر کیا ہے کہ دریا کے دُوسری طرف "بھی قدیم شہر کی مٹّی کی دیواریں

ایک چشمہ تھا جس کا پانی دریا میں گرتا تھا۔ اب یہ کورٹکرکٹ کی وجہ سے بند ہوچکا ہے اور اندرون قلعہ کا پانی بھی غائب ہوگیا ہے گو آب باراں کے لئے پختہ اینٹوں اور چونے کے گارے سے بنے ہوئے بڑے بڑے حوض موجود ہیں کوئی گھوڑ سوار قلعہ کی کسی طرف سے دیواروں تک نہیں پہنچ سکتا سوائے اس دروازے کے جو کنارہ دریا پر واقع ہے۔ البتہ دو طرف سے پیدل آدمی دیواروں تک پہنچ سکتا ہے لیکن دوسری دونو طرف پرندہ بھی ان کی اُونچائی سَر نہیں کرسکتا۔ دروازے سے قلعہ کا فاصلہ ایک میل یا زیادہ ہے اور نصف فاصلہ گھوڑے پر طے ہوسکتا ہے۔ دیواریں اس طرح بنی ہیں کہ گھوڑ سواران کے پھیر کا زیادہ حصّہ ان کی چوٹی کے ساتھ ساتھ چل کر طے کرسکتے ہیں۔ دیوار سازی کے لئے اینٹیں اور گارا بنانے کے لئے جو جگہ کھودی گئی تھی وہ قریباً ایک فرسنخ دُور ہے۔ ایک رِوایت یہ تھی کہ قلعہ ان لوگوں نے بنایا جو بغداد سے اسی مقصد کے تحت لائے گئے تھے۔"

تھیں اور ان سے پرے پہاڑیوں میں ایک اور قلعے کی موجودگی کے بھی چرچے تھے"۔ جو غالباً شاہرستان بلقیس تھا۔

فرح بھی خراسان کے قدیم مقامات میں سے ہے۔ جس مصنّف سے ہم نے سبزوار کے حالات اخذ کئے ہیں وہ بتاتا ہے کہ یہ بہت زرخیز تھا اور اس کا ضلع گندم اور جو خوب افراط سے پیدا کرتا تھا۔ اس ضلع میں بہت سے مضبوط قلعے بھی تھے۔ قصبہ فرح بجائے خود ایک مضبوط و محفوظ مقام تھا۔

مسٹر فیریر ۱۸۴۶ء میں فرح آیا اور اسے ایک متوازی الاضلاع پایا جس کا رُخ شمالاً جنوباً تھا۔ باب ہرات شمالی رُخ کے وسط میں تھا اور باب قندھار جنوبی رُخ کے وسط میں قلعہ اس جگہ کے شمالی زاویہ میں تھا۔ دیواریں بہت جسیم تھیں اور یہ ایک کنارے پر ۳۵ تا ۴۰ فٹ بلند کھڑا ہوا تھا۔ یہ کنارہ اتنا مضبوط تھا کہ کوئی کدال اس پر اثر نہ کرتا تھا۔ باہر کی طرف ایک مسقّف راستہ قلعہ بندیوں کو گھیرے ہوئے تھا اور اس سے پرے پھر ایک چوڑی اور گہری خندق تھی جسے اپنی مرضی سے پانی سے بھرا جا سکتا تھا۔

ییٹ ۱۸۹۳ء میں فرح آیا تو باب قندھار سے داخل ہوا۔ وہ لکھتا ہے "فرح ایک مربّع دیوار بستہ جگہ ہے جو قندھار جیسے میدان کے وسط میں واقع ہے لیکن ہرات جیسی فصیلوں کی مالک ہے، یہ اب قصبہ نہیں رہا"۔

وہ ایک اور نمایاں ڈھیری کا بھی ذکر کرتا ہے جس کے پاس وہ فرح سے جاتے وقت ٹھہرا۔ اسے قلعۂ سام کہتے ہیں، سام جو شیرِ سیستان رُستم کا جدّ امجد تھا۔ یہ ایک بلند مربّع ڈھیری ہے جس کے ارد گرد ایک دلدل ہے جو بظاہر کسی قدیم خندق کا اثر باقیہ ہے"۔

جن مقامات کی زمین اچھی تھی اور پانی بھی خوب تھا اور جن میں سے بعض کا اُوپر ذکر کیا گیا، وہ بلاشک وشبہ قدیم ترین ادوار سے آباد رہی ہیں جن کے کوائف ابھی تک شرمندۂ تحریر نہیں ہو سکے۔ یہ مقامات تاریخی ادوار میں بھی کئی صدیوں تک زرخیز اور گنجان آباد مرکز رہے اور ان کے ادبار و

انحطاط کی کہانی آئندہ صفحات میں بتائی جائے گی۔ یہ سب سیستان سے مربوط تھے۔ ان کے حکمران تاجیک خاندانوں کے افراد تھے لیکن ملوک فرح اگر نسلی لحاظ سے نہیں تو کم از کم رشتہ و پیوند کے اعتبار سے کیانیوں سے ضرور منسلک تھے۔

وہ اس مخصوص خاندان سے ہوں یا نہ ہوں لیکن وہ اس قدیم ایرانی نسل سے ضرور تعلق رکھتے تھے جو عظیم صوبۂ خراسان کی آبادی کا جزو اعظم تھی جن سے کیانی بر آمد ہوئے اور صدیوں تک ایہ ان پر حکومت کرتے رہے۔

ملّا معین سبزواری نے اپنے مولد ہرات اور دیگر مقامات کی جو تواریخ بنیاد دی ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں۔ وہ ان تواریخ کی کوئی دلیل نہیں دیتا غالباً اس لئے کہ اس کے منابع اس ضمن میں خاموش تھے۔ اس نوعیت کی صرف چند اور تواریخ سیستانی روایات میں ملتی ہیں۔

لیکن ان میں سے ایک ابھی قابل توجہ ہے۔ یہ رستم سے متعلق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہزار سال پہلے گذرا ہے۔ یہ الفاظ مبہم ہیں لیکن اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ آنحضورؐ کی پیدائش سے ایک ہزار سال پہلے ہوا تو پھر اس روایت کے مطابق دورِ رستم سن عیسوی کے آغاز سے پانچویں صدی پہلے تھا اور سکندر کی مہم سے صرف قریباً ۱۰۰ سال پہلے۔ یہ تاریخ کسی مسلّمہ سند پر مبنی نہیں لیکن یہ ایک دلچسپ نمونۂ معلومات ضرور ہے اس لئے قابلِ تحفّظ ہے گو اسے صحیح یا قریباً صحیح بھی نہیں مانا جا سکتا۔

یہ عجیب بات ہے کہ اگر یہ عظیم ہیرو ایرانیوں کا یہ محافظ اور تورانی قشون قاہر کے خلاف اپنے وطن کی پشت پناہ سکندر کی مہم سے صرف چار پانچ نسلیں پہلے ہوا تو مؤخر الذّکر کو کیونکر اس کے کارناموں کا علم نہ ہوا کیونکہ اس شہزادہ خراسان کی جنگی شہرت اور جوانمردی یقیناً اس کے لئے خصوصی دلچسپی کا موجب ہوتی اور اس کا ذکر ان دستاویزات میں بھی محفوظ ہوتا جن کی بنا پر اُریئن نے اپنی

لے ایک سیستانی روایت کے مطابق سرو تار کا قصبہ یا قلعہ ۱۷۰۲ سال پہلے چھوڑ دیا گیا تھا۔ آثار قدیمہ کے باب میں اس کا ذکر آئے گا اور دیگر تواریخ بھی زیر بحث لائی جائیں گی۔

تاریخ مُرتب کی۔ یہ دستاویزات نامکمل ضرور تھے لیکن بدقسمت شہنشاہ داریوش سے باختری خشترا پون، بَیس نے جو احسان فراموشی اور غاّازی کی اُس کے مقابلے پر رستم نے اپنے آقا سے جس وفاداری و استواری کا مظاہرہ کیا وہ یقیناً سنسنی خیز تھا جو بیرونی دُنیا سے مخفی نہ رہ سکتا تھا۔

یہ وفاداری استوار شاہنامہ کے اشعار میں محفوظ ہے جو اُس جانباز اور اُس کے نااہل و ناشناس آقا کے تعلقات کے آئینہ دار ہیں۔

زادل جو رستم کو اُس کے والد سے ملنے والی جاگیر کا صدر مقام تھا، غالباً سبزوار (بعد کے ادوار کا) تھا جس پر محراب شاہ تازی قابض تھا۔ اس طرح تاریخ خراسان کی ابتدا سے ہی غوریوں نے (کیونکہ بنو ضحاک اس پہاڑی ضلع میں آباد ہو گئے تھے) خراسان کے معاملات میں نمایاں حصہ لینا شروع کر دیا تھا جو بعد کے ادوار تک جاری رہا۔ سیحوں پار کے لشکروں کے حملے بھی قدیم الایام سے جاری تھے جنہوں نے بعد میں مشرقی ممالک کی ہیئت ہی تبدیل کر دی۔ افراسیاب کے تحت ترکوں کا عظیم حملہ چنگیز خان کے تحت اسی قسم کے حملوں کا پیش خیمہ تھا جو نسبتاً تاریخی ادوار میں وقوع پذیر ہونے والے تھے۔

سام نامہ بمعہ گرشاسپ (کرشاسپ) نامہ ایک قدیم تر جنگ نامہ تھا، جس پر فردوسی نے اپنے مشہور رزمیہ کارنامے کو تعمیر و تخلیق کیا، سر ہنری رالنسن مرحوم کے مطابق سام کی تین مہمات پر مشتمل تھا جو اُس نے فریدوں کے حکم پر ساکسران (ایک سیتھی نسل) کے خلاف انجام دیں۔

"یونانیوں کے ہاں ایک قدیم روایت تھی جو بظاہر اُنہوں نے سکندر کی مہم کے دوران اخذ کی، کہ کوروش کی حالت سیتھی جنگ میں دگرگوں ہوگئی تو اُس نے ڈرینگیانہ کے جنوب میں سکونت پذیر ایک قبیلہ موسومہ بہ اگری اسپویا ارہی اسپو سے مدد حاصل کی اور اس مدد کے بدلے انہیں یرگتوئی یعنی محسنین کا اعزازی خطاب دیا"۔

ڈرینگیانہ لفظ زرنج کی یونانی شکل تھی اور بعد میں آنے والے عرب سیستان کو زرنج کہتے تھے۔ قدیم سیستان کا حدود اربعہ موجودہ زمانے کی نسبت بہت وسیع تھا جو قریباً ۱۰۰ سال پہلے تک قائم رہا۔

موجودہ سیستان میں اُس خاندان کے مفلس وقلّاش باقیات موجود ہیں جو کبھی وقت ایک طاقتور اور بارُعب جمعیّت تھی اور جسے دشمن کے خلاف مؤثر امداد دینے پر کسی سابق شہنشاہ ایران نے متعدّد خصُوصی مراعات عطا کر دی تھیں۔ رئیس[1] خاندان کے لوگ کسی وقت سیستان کے ڈیلٹا کے جنوب اور سَرحد کے مُلحقہ اضلاع میں چھائے ہُوئے تھے لیکن اب وہ قریباً نیست و نابود ہو چکے ہیں۔ وہ

---

[1] رئیس کسی وقت بمپور کے شمال میں سَرحد کے جنوب مشرقی ضلع کی نامی گرامی اور بااثر نسل تھی۔ غُز قبائل کا کچھ حصّہ اُن کے ساتھ آباد ہو گیا اور رشتوں ناطوں کی بدولت غُز رئیس کہلانے لگا۔ سیستان کے رئیس ان سب کے سردار تھے۔ جب ہلمند نے جنوبی ڈیلٹا چھوڑ دیا تو سَردار قبیلہ اس امید موہوم پر حوز دار سے چمٹا رہا کہ دریا اپنا رُخ بدل لے گا یا نہر ہلمند بحال ہو جائے گی اور وہ افغانوں سے محفوظ رہیں گے لیکن اُنہیں بالآخر حوز دار چھوڑنا پڑا اور سہ کوہا آنا پڑا جو اُن کے اور کیانیوں کے درمیان حد فاصل تھی۔ اُس وقت محمدؐ رضا خان سَر بندی سہ کوہا پر قابض تھا اور رئیس سردار کے ساتھ رشتہ کی وجہ سے اُس نے اُسے زمین دے دی۔ جب سیستان میں امن و امان مفقود ہو گیا تو کچھ رئیس افراد کاہ کو ہجرت کر گئے جہاں اُن کے اخلاف موجود ہیں۔

پُرانے وقتوں میں کہا جاتا تھا کہ سیستان کے شمال میں کیانی اور جنوب میں رئیس "آقائے زمین" تھے اور تمام دیگر قبائل اور ان کی ملکیت انہی دو خاندانوں کے ماتحت تھے۔

رئیسوں کے سردار خیل کا شجرۂ نسب، جو دستیاب ہو سکا، مندرجہ ذیل ہے:۔

- رئیس محمد علی
  - رئیس غلام محمدؐ
    - رئیس اکبر
      - رئیس حُسَینا (کوئی بھائی نہ تھا، بچپن میں یتیم ہو گیا)
        - رئیس حسن (لاولد)
        - حاجی (لاولد)
  - رئیس محمدؐ
  - رئیس نخ محمد علی
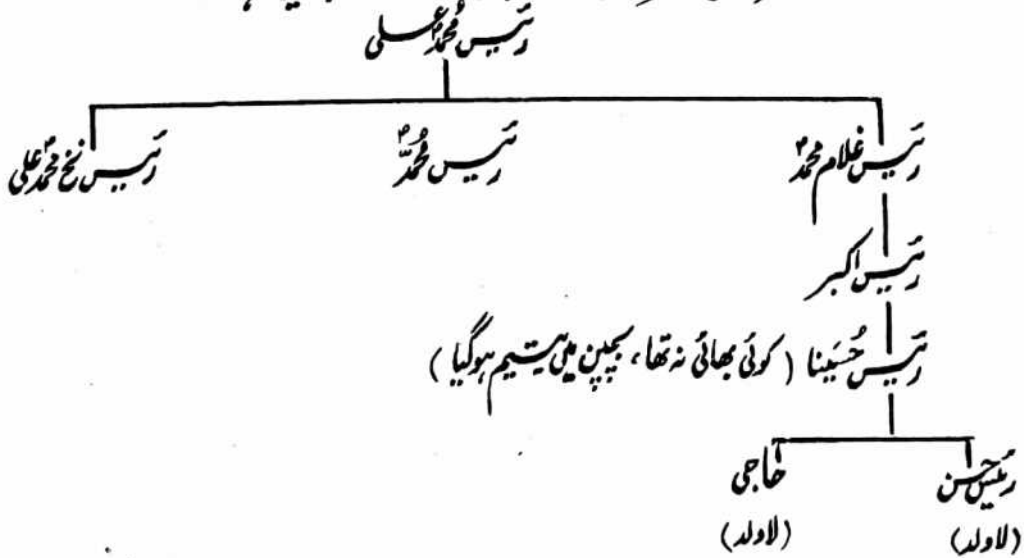
رئیس غلام شاہ حوز دار میں رہا لیکن آخر کار چھوڑنا پڑا اور تھوڑے عرصہ بعد فوت ہو گیا۔ رام رودی اسی قبیلہ سے ہیں لیکن غالباً اس کا کمین حصّہ ہیں۔ وہ بھی تھوڑے سے ہیں۔ پہلے اُن کے ۴۰۰ آدمی رامرود اور حوز دار کی نہروں کی حفاظت و مرمّت کے لئے ہمیشہ موجود ہوتے تھے۔

فارسی بان تھے یعنی قدیم ایرانی آبادی سے تعلق رکھتے تھے لیکن بعد میں جنگجو عربوں کے گروہ بھی اُن میں آملے اور یوں وہ مخلوط النسل ہوگئے تھے۔

رَوایات کے مُطابق رئیس "رُوشناس" تھے یعنی شہنشاہ کے حضور شرفِ باریابی رکھتے تھے اور انہیں مقامی خودمختیاری کی مراعات حاصل تھیں جس کی وجہ سے وہ کیانیوں یا سیستان کے دیگر حکمرانوں کے تابع نہ تھے۔ یہ مراعات اُنہیں بہت عرصہ پہلے دی گئی تھیں اور کچھ پتہ نہیں کہ کس بادشاہ نے یہ عطا کیں یا وہ کونسے خانوادہ کا تھا لیکن یہ اُنہیں دشمنوں کے خلاف شاہ کو مؤثر امداد دینے کے بدلے دی گئی تھیں۔

یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ رئیس اس قدیم قبیلہ کے باقیات ہیں جس نے کوروش کی مدد کی تھی لیکن اس قریباً معدوم قبیلے کا جغرافیائی محل وقوع اور اس کو عطا کردہ مراعات کی داستانیں اسی روایت سے مربوط معلوم ہوتی ہیں جو یرگتری یعنی محسنین کے متعلق مشہور تھی۔

تھوڑے سے رئیس خاندان یا ان کے کمین قبیلے اب بھی سیستان میں موجود ہیں جو انتہائی قلاّش ہیں اور معمولی کاشتکاروں کی حیثیت سے اپنی گذربسر کرتے ہیں۔

خراسان کے شمالی اضلاع سیحون پار کے حملہ آوروں کی زد میں تھے اور ان بالوقفہ حملوں میں بعض سیتھی قبائل بھی مفتوحہ اضلاع میں آباد ہوتے گئے۔ لہٰذا اس عظیم صوبے کی آبادی میں ماقبل تاریخ ادوار سے نئے قبائل کا اضافہ ہوتا رہا ہے اور خراسان کے رگ و پے میں مسلسل نیا اور تازہ خون دوڑتا رہا ہے۔

سکندر کی مہم نے اس پُورے سیاسی اور معاشرتی ڈھانچے کو اُتھل پتھل کر دیا جو دارپوش کے آباؤ اجداد نے یہاں تعمیر کیا تھا۔ اہلِ فارس، میڈ، سیتھی اور آر یہ سب فیلقوس مقدونی کے نڈر اور شہ دماغ بیٹے کے سامنے جُھک گئے اور تھوڑے عرصے کے لئے دُنیائے مشرق اور اس کی اقوام اس سے مغلوب و مرعوب ہو کر رہ گئیں۔

سیستان یقیناً کریٹیروس کی فوج کا امدادی اڈہ بنا ہوگا جب وہ بالائی سندھ سے

کرمانیہ میں داخل ہوا لیکن یہ علاقہ بابل اور ہندوستان کے درمیان رسل و رسائل کے اہم راستوں سے اتنا دُور تھا کہ اسے ایک نوآبادی نہ بنایا جا سکتا تھا لہٰذا یہاں وقتاً فوقتاً ملنے والے یُونانی باختری سکّے غالباً تجارتی تعلّقات کی وجہ سے لائے گئے۔

جب یُونانی باختری سلطنت پارتھوی اور سیتھی دشمنوں سے مغلوب ہوگئی تو مؤخر الذکر کے بلا روک ٹوک داخلے کی راہ ہموار ہوگئی اور یہ خانہ بدوش اور گھوڑ سوار قبائل، جنہیں قدیم مؤرخین سیتھی پکارتے تھے، سیستان میں سیلاب کیطرح پھیلتے گئے۔ حتیٰ کہ یہ علاقہ انہی کے نام پر ساکستان کہلانے لگا جو آج بھی ایک بگڑی ہوئی شکل میں موجود ہے۔

پانچویں صدی عیسوی میں ارمنی مؤرخ مُوسئے خورینی نے رُستم کو ایران کی رزمیہ شاعری کا مرکزی کردار بناتے ہُوئے اُسے سَکجِک یا ساکن کا خطاب دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقامی نظام تسمیہ میں اُس کے دور تک نسلی تمیز ختم کر دی گئی تھی۔ آج کل بھی ایک مشہور قبیلہ ہے جو ہاموں کے شمال میں کُشش اور جوین کے ارد گرد، قلعہ کاہ میں اور ہاموں کے مشرق میں خَش اور نخلستان میں آباد ہے، اپنے آپکو ساک زی کہتا ہے۔ وہ افغان ہیں یعنی اُن مختلف النسل قبائل میں شامل ہیں جو لفظ افغان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ باہر کے لوگ اس قبیلہ کو اسحاق زئی پکارتے ہیں لیکن یہ لوگ بجائے خود اپنے آپ کو اسحاق زئی نہیں کہتے بلکہ واضح طور پر ساک زئی کہتے ہیں۔ یہ غالباً ساکا لوگوں کے آثار ہیں جو سیستان میں پھیلے تھے۔ جاٹ عنصر بھی ان دنوں سیستان میں موجود ہے گو بہت تھوڑے سے لوگ اپنے آپ کو جاٹ کہتے ہیں۔ آبادی کا کافی حصّہ فارسی دان ہے جو نسلی لحاظ سے اُن قبائل کے باقیات ہیں جو سیحوں پار سے قریباً ۲۰۰۰ سال پہلے سیستان میں وارد ہُوئے تھے۔

اردشیر بابک نے پارتھیوں کی زوال پذیر طاقت کا خاتمہ کر دیا اور ایران میں آخری شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ وہ اپنے آپ کو قدیم مقامی شاہی خانوادوں کا چشم و چراغ کہتا تھا جنہوں نے ایرانی سلطنت پر حکومت کی تھی لیکن اس کی سلطنت ان قدیم سلطنتوں کی وسعت نہ پا سکی۔ صاحب روضۃ الجنّت، ملا معین سبزواری خراسان کے مشہور شہر نیشاپور کی وجہ تسمیہ یوں بیان کرتا ہے:-

کہا جاتا ہے کہ اسے شاپور ابن اردشیر نے بنوایا۔ قدیم فارسی زبان میں شہر کو نیہہ کہتے تھے۔ پس شہر نیشاپور کو نیہہ شاپور کہتے تھے جو وقت کے ساتھ ساتھ نیشاپور میں مخفف ہو گیا۔[1] یہ اردشیر کی سلطنت کے بڑے شہروں میں سے ایک بن گیا۔[2]

ایک روایت جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے، یہ تھی کہ پارتھوی سلطنت کے دوران ہرات ایک ایسے گورنر یا شہزادہ کا دارالحکومت تھا جسے آشنگ کہتے تھے۔ سیستان بھی غالباً اسی نسل کے خاندان یا حکمران کے تحت تھا جن کا صدر مقام سُردتَر تھا۔

اردشیر بابک کے جانشینوں نے اس کا شروع کیا ہوا کام پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ پارتھوی سلطنت کے مشرقی صوبے غالباً وفاداری سے منحرف ہو گئے کیونکہ اس نسل کے آخری بادشاہوں کا ان پر اثر و رسوخ تھا اور مشرق کی طرف وادیٔ سندھ کے آس پاس کے علاقے ساسانی سلطنت میں شامل ہو گئے تھے۔ سیستان کے خشترا پون شاید مقامی شہزادے تھے جو سیستان کے مقامی خاندان سے تعلق رکھتے تھے یا ایسے خاندان کے لوگ تھے جس نے خراسان کے دیگر سرداروں سے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔

---

[1] اسحاق زئی یعنی اسحاقؑ ابن ابراہیمؑ خلیل اللہ کے ابنا و اخلاف (بموجب انجیل) جب ان ملکوں کے قدیم ترین یا دیر سے آباد قبائل نے اسلام قبول کیا تو نسلی امتیازات اُلٹ پلٹ ہو گئے اور قبائلی یا نسلی نام، جو ان کے نسلیاتی مظاہر تھے، مٹا دیئے گئے۔ ان قبائل نے مرورِ زمان کے ساتھ اسلام کے ابتدائی پیروکاروں کے ساتھ اپنا حسب و نسب جوڑ لیا۔

[2] اسی خاندان کا دارالحکومت استخر تھا لیکن بعد میں اسے مدائن میں بدل دیا گیا جو فرات کے سیراب کردہ میدانوں میں واقع تھا لیکن استخر شاہی دستاویزات کا محافظ خانہ بنا رہا اور زردشتی مذہب کی مؤخر شکل کا صدر مقام بن گیا۔ اس کی حیثیت پسارگادے جیسی تھی کیونکہ ساسانی اپنا رشتہ اسی خاندان سے ملاتے تھے جسے سکندر نے لتاڑا تھا۔ استخر چند سال پہلے تک ایک شہر تھا۔ یعقوب ابن لیث نے مؤبدوں کو اکٹھا کیا اور انہیں عرب تسخیرِ ایران سے پہلے اپنے آبا و اجداد کی تاریخ مرتب کرنے پر مامور کیا۔ ابو اسحاق الاستخری جو مشہور جغرافیہ دان تھا اور چوتھی صدی ہجری یا ...۱ سال سے کچھ زیادہ عرصہ پہلے رقم طراز رہا، اسی جگہ کا باشندہ تھا۔

اردشیر بابک کے جانشینوں کو مستقلاً اپنی سلطنت کو وسط ایشیا کی مشرقی حدود سے مغرب کی طرف یلغار کرنے والے خانہ بدوش قبائل سے بچانا پڑتا تھا اور آہستہ آہستہ انہوں نے اُن کی پیش قدمی کو روک دیا۔

ساسانی خاندان کی تاریخ ان خانہ بدوش لشکروں کیخلاف مہمات کی ایک طویل دستاویز ہے۔ بعض اوقات یہ لشکر شہنشاہی افواج پر غالب آجاتے تھے اور بعض اوقات یہ افواج فتحیاب ہوتیں اور انہیں پسپا کر دیتیں۔ یہ رزم و پیکار صوبہ خراسان کے شمالی حصوں میں جاری رہتی تھی کیونکہ جیحوں پار کے علاقوں پر ساسانیوں کا کبھی قبضہ نہیں ہوا۔ اور یہ ترک و تاتار قبائل کا گڑھ بن گئے تھے۔ سن عیسوی کی ابتدا کے قریب کشان باختر میں متمکن ہو گئے تھے اور رُومیوں نے اپنے دشمن پارتھیوں کے خلاف مدد حاصل کرنے کے لئے اُن سے سفارتی تعلقات قائم کئے۔ ساسانی خاندان کے دوران خانہ بدوش یلغاریں بھی مشرقی یا بازنطی رومی سلطنت کے لئے آیۂ رحمت تھیں کیونکہ شہنشاہِ ایران کے ہاتھوں اس سلطنت کو بار بار شکست کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ شاہی خاندان کے تفرقات نے بھی ایران کے بیرونی دشمنوں کو شہ دی۔ خانہ بدوشوں نے بہرام گور کے ایک پوتے کا ساتھ دیا جو اپنے بھائی کا مدِ مقابل تھا اور اس خانہ جنگی نے ایران کو غیر محفوظ بنا دیا۔ یہ صورتِ حال خسرو اوّل یعنی انوشیروان عادل کی تخت نشینی تک جاری رہی۔ اُس کے طویل عہد کا نصف سے زیادہ حصّہ ایرانی سیادت کو بحال کرنے میں صرف ہو گیا جسے تُرک لشکروں نے یزدگرد سوم کے بیٹوں، ہرمز سوم اور پیروز کے مابین جنگ تخت نشینی میں شریک ہو کر بُری طرح مجروح کر دیا تھا۔ بالآخر ترکوں کو جیحوں پار دھکیل دیا گیا اور ایرانیوں نے طخارستان اور بلخ کے اضلاع پر تصرّف جما لیا۔ شہنشاہ نے ترک سالار کی بیٹی سے شادی رچائی اور انوشیرواں کا جانشین اسی کے بطن سے پیدا ہُوا۔ یہ سب واقعات ۸ ستمبر ۵۳۱ء سے مارچ ۵۷۹ تک ہوتے۔

۵۷۹ یا ۶۵۹۰ء

اگلی پشت میں ابنِ انوشیرواں رومیوں سے اُلجھ گیا اور ایک تُرک لشکر نے بادغیس اور ہرات کے اضلاع پر قبضہ جما لیا۔ خزر قبائل اور دو عرب سرداروں نے اپنے اپنے مُچّے لے کر ہرمز چہارم ابن نوشیرواں

کی مشکلات میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

میدانِ جنگ جہاں ترکوں کو شکست ہوئی تھی سیستان سے بہت دور تھا۔ ساکا قبائل کا وہ حصّہ جو مدّتوں پہلے یہاں آیا تھا اب امن پسند کاشتکاروں کی زندگی اختیار کر چکا تھا اور چونکہ وہ ترکوں کے ہم نسل و ہم نسب نہ تھے اس لئے مؤخر الذکر کے حملوں نے سیستان کی خوشحالی کو کوئی ضعف نہیں پہنچایا۔

ساتویں صدی عیسوی میں ضلع کیچ سندھ کے ہندو راجوں کے تحت تھا اور ایک ہندو راجہ تو نمروز کے خشتر اپون سے لڑتا ہوا مارا بھی گیا جس نے کیچ پر حملہ کر دیا تھا۔ اس خشتر اپون کا دائرہ اقتدار سندھ کی سلطنت کی مغربی حدود تک تھا اور اس میں موجودہ قندھار[1] بھی شامل تھا۔

سیستان اور مشرقی اضلاع (جو اس علاقے کے خشتر اپون کے تحت تھے) کے درمیان براہِ راست رشتۂ مواصلات دریا کے ساتھ ساتھ نخلستان خاش تک تھا جہاں ان دنوں قصبہ خشت بھی موجود تھا۔

یہ ضلع سیستان کا حصّہ شمار کیا جاتا تھا۔ یہ ایک زرخیز علاقہ ہے جس کا رقبہ خاش رود سے نکلنے والی نہروں سے خوب سیراب و شاداب ہے۔ گندم اور جَو افراط سے پیدا ہوتے ہیں۔ آبادی تاجیک ہے اور وادئ ہلمند ارابیب سے منسلک ہے جن کے مقدّم اب بھی اس چھوٹے سے ضلع کا نظم و نسق چلاتے ہیں، گو کافی افغان قبائل بھی یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ خاش کی ابتدائی تاریخ میں ہی تاجیک لوگوں نے باسرگ تک کا علاقہ قبضا لیا تھا اور اس قبضے کے نشانات آج تک تباہ شدہ کاریزات کی شکل میں موجود ہیں جو خاش سے باکوا تک جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی راستے پر باسرگ (خوش لیپت رود کے بائیں کنارے کا چھوٹا سا ضلع) واقع ہے جو

---

[1] چچ نامہ کے مطابق یہ واقعہ پہلی ہجری (۲۳ - ۶۲۲ ء) میں ہوا تھا جس سے سندھ میں راج گھرانا بدل گیا۔

ان دونوں اضلاع سے قریباً مساوی الفاصلہ ہے۔

کیانی خانوادے یا وہ خاندان جو ماقبل اسلام ایرانی شاہی دُودمان کے باقیات ہونے کا دعوٰے کرتے ہیں اردشیر بابک کے ابناو اخلاف سے ہی اپنا حسب و نسب اخذ کرتے ہیں۔

۵۹۰ تا ۶۲۸ء بعد

خسرو پرویز آخری ساسانی بادشاہ تھا جس نے ایران پر با اختیار حکومت کی۔ اس کے بعد کٹھ پتلی حکمران آئے، مرد بھی اور عورتیں بھی لیکن وہ صرف محلّاتی سازشوں کے کاشتہ و کشتہ تھے۔

شاہی نسل کا انحطاط اُن افراد کے قتل سے تیز ہوگیا جنہیں خطرناک سمجھا گیا اس لیے کہ وہ بہت قریب الوراثت تھے اور ملک یکے بعد دیگرے انقلابات سے تباہ ہوگیا اور مختلف گروہوں میں بٹ کر چند سالوں میں ہونیوالے عربوں کے پُرزور و پرجوش حملے کے مقابلے کی سکت کھو بیٹھا۔

خسرو پرویز کو ہی "قبول اسلام کی دعوت دی گئی لیکن اُس نے برملا اس دعوت نامے کی توہین کی اور اُسے پھاڑ دیا اور سفرا کو بے عزتی سے نکال دیا۔

سیستانی کیانیوں کی بدقسمتی مندرجہ ذیل ناپاک اعمال سے منسوب کی جاتی ہے۔ "برکت ندارند" یعنی اُن کی قسمت یاور نہیں۔ اُن کی مساعی پھیلتی پھولتی نہیں اور کامیاب نہیں ہوتیں، سیستان میں ایک عام کہاوت ہے اور یہ اُن کے مورث خسرو دوم کے قبولِ اسلام سے انکار کی وجہ سے اُن کے متعلق مشہور ہوئی۔

عرب تسخیر ایران کی تفصیلات میں یہاں جانے کی ضرورت نہیں، وہ ہر ایک کو معلوم ہیں لیکن یزدگرد کی شکست کے بعد شاہی خاندان کا ایک فرد، کیخسرو اپنے افراد خاندان اور جاں نثاروں کے ساتھ سیستان میں پناہ گزیں ہوا جہاں انہیں صرف ایک مختصر وقفے کے لیے اپنے فاتحین سے نجات مل سکی۔

خلافت عثمانؓ کے دَور میں حکومت خراسان اُس عرب سالار کا انعام قرار دی گئی جو سب سے پہلے اس میں داخل ہوگا۔ عبداللہ ابن العامر کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ وہ حاکمِ البصرہ تھا اور یہیں سے وہ

صحرائے کرمان کے سیدھے راستے سے یہاں آیا۔ جب اُس نے کوہستان فتح کر لیا اور اُس کے سب حریف منہزم ہوگئے تو اُس نے والیٔ ہرات کو خلیفۃ المسلمین کا تابع ہونے کیلئے بلایا۔ مؤخر الذکر نے کہا کہ اس کا موقعہ اُس وقت آئیگا جب عرب سالار نیشاپور فتح کر لے گا۔ چنانچہ عبداللہ ابن العامر اس شہر کی طرف بڑھا۔

اُس وقت طوس اور ابیورد نیشاپور کے ماتحت تھے اور ان دونوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ قریباً ایک ماہ تک اس شہر کے گرد لڑائی ہوتی رہی حتیٰ کہ شدّتِ سرما نے عربوں کو محاصرے پر مجبور کر دیا۔ اس مقصد کے لئے ۴۰۰۰ سپاہی عبداللہ حرہم کے تحت متعیّن کئے گئے تاکہ شہر اور نواحیات کے درمیان رسل و رسائل کے ذرائع منقطع کر دیئے جائیں۔ بالآخر نیشاپور کے سردار اور کدخدا کُنز نے اطاعت قبول کر لی اور دیگر قیمتی اشیا کے علاوہ ۷۰۰۰۰۰ دینار نقد دینا منظور کر لیا اور طوس اور ابیورد کے لئے ذمہ دار بنا۔ والیٔ ہرات نے بھی فاتح سالار سے معمول کی شرائط خراج پر صلح کر لی اور ۱۴ رمضان ۳۱ھ (= ۲ اپریل ۶۵۲ء) کو طرفین کے درمیان معاہدہ پر دستخط ہوگئے۔

ایرانی سلطنت کا آخری صوبہ بھی چند سالوں میں مطیع کر لیا گیا۔ سیستان پر بھی حملہ کیا گیا اور کرمان سے فرستادہ مہم نے اسے فتح کر لیا۔ ایران کا قدیم سیاسی ڈھانچہ اور مذہب دبا دیئے گئے اور فاتحین کی زبان و مذہب کے اسما قدیم ایرانی ناموں پر غالب آگئے۔

کیخسرو کی تیسری نسل سے سیستانی کیانیوں کے شجرۂ نسب سے ایرانی نام غائب ہو جاتے ہیں۔

باب دوم

سر اَیچ رالنسن نے بلاذری کی سند پر سیستان پر پہلے عرب حملے کا جو حال بیان کیا ہے اُس میں اس علاقے کے متعلق بعض دلچسپ معلومات بھی ہیں۔ ۳۰ھ میں ربیعہ کے تحت ایک دستہ کرمان کے سرجان سے سجستان کیخلاف بھیجا گیا۔ وہ پہلے فہرج آئے جہاں سے ۷۵ فرسنگ (رالنسن کیمطابق ۲۳۰ انگریزی میل) صحرا عبور کر کے ضلع زلق میں پہنچے جو سجستان سے ۵ فرسنگ کے فاصلے پر تھا۔ مہرجان کے تہوار پہ اس جگہ پر حملہ کیا اور اسے تاخت و تاراج کیا گیا۔ پھر وہ ایک گاؤں کرکویہ پہنچے جو زلق سے پانچ میل دُور تھا۔ اس نے بلامقابلہ اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد وہ علاقہ ہسُن آئے جس کے لوگوں نے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا۔ پھر وہ زلق واپس آئے اور زرنج کے لئے راہنماؤں کا بندوبست کیا۔ پھر وہ چلتے چلتے ہندمند پہنچے اور نُنک نامی بھری ہُوئی نہر عبور کر کے رُشت آ گئے جو زرنج سے صرف ایک تہائی میل تھا۔ اس کے باشندے باہر نکلے اور جان توڑ کر لڑے اور مسلمانوں کو کچھ نقصان بھی پہنچایا۔ ربیعہ پیچھے ہٹ کر پلٹا اور حملہ آور ہُوا اور دشمن کو شہر میں دھکیل دیا۔ پھر ربیعہ نشرُود گاؤں گیا اور فتح پائی۔ اس کے بعد شرودعہ پر قبضہ کر لیا اور بہت سے کشت و خون کے بعد اُس نے شہر زرنج کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے اَبرِوِج نامی مرزبان نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے اور شرائط تسلیم کر لیں۔ اُس نے خراج بصُورت ...را غلام ادا کیا جن میں سے ہر ایک کے پاس ایک زرّیں صراحی تھی۔ اس کے بعد ربیعہ شہر میں داخل ہُوا اور پھر نہر سینارود سے گذر کر کرنین آیا جہاں رُستم کے اصطبل کا منتظم رہتا تھا۔ وہاں اُسے ایک اور

فتح حاصل ہوئی اور وہ زرنج واپس آگیا جہاں وہ دو سال تک ٹھہرا"۔ سیستان میں عرب افواج کی کارروائیوں کا اعادہ ۷۵۰ سال بعد تیمور کے تحت بھی کیا گیا۔ اُس کے ہلکے پھلکے رسالے نے باشندوں کو کھلے میدانوں سے قلعوں اور صدر مقام میں دھکیل دیا۔ پھر اُس نے اس کا محاصرہ کر لیا اور قبضہ کر لیا۔ گو تھوڑے عرصے کے لئے سخت لڑائی ہوئی۔

کرمان کے سرجان اور فہرج کے محل وقوع جانے پہچانے ہیں۔ مؤخر الذکر سیستان میں شیلا کے سرے سے تجارتی شاہراہ کے ساتھ ساتھ ۱۵۷ میل ہے۔ یہاں سے ۵۸ میل آگے چل کر حملہ آور دَرَک یا قلعہ نو کے علاقے میں پہنچ جاتے تھے'۔ ۱۵ میل شمال کی سمت میں مزید سفر عربوں کو سیستان کے اس حصّہ میں لے آیا جہاں موجودہ دیہات نُنجر اور قاسم آباد واقع ہیں۔ کرکوئیہ کا بیان آگے آئیگا۔ اور ہُسین شاید ابن رُستہ کا ہسانک ہوگا۔ عربوں نے یہ تمام اضلاع فتح کر لئے، اور طویل صحرائی سفر کے بعد سامان رسد اکٹھا کر لیا۔ اُن کی مہم بلاشک و شبہ موسم بہار میں ترتیب دی گئی تھی جب سیستان کی فصلیں اُن کے گھوڑوں اور اونٹوں کیلئے چارہ مہیا کر سکتی تھیں۔ محمدؐ بن قاسم کا حملہ سندھ بھی موسم بہار میں ہوا۔ ابھی پچھلے سالوں میں سردار آزاد خان خارانی کے پے بہ پے چھاپے بھی اسی موسم میں وقوع پذیر ہوئے کیونکہ اس موسم میں وہ اپنے جانوروں کو نوخیز فصلوں سے خوب سیر کر سکتا تھا۔ اس موسم میں ہلمند کا پانی عموماً اونچی سطح پر ہوتا ہے اسی لئے عرب ہلیسُن سے واپس ہوئے کیونکہ اس علاقے کی زمینیں دریا سے قربت کی وجہ سے زیرِ آب آچکی تھیں۔ رہنماؤں کی بھی ضرورت تھی تاکہ وہ بِتن کے متعلق بتا سکیں اور اسی لئے وہ ذِرلق کیطرف واپس لوٹے۔ ہلمند یعنی زندہ رود ان کے اور زرنج کے درمیان تھا۔ نوکیں جُو اور اس کا مترادف نَوَرُ آج بھی حال میں کھُدی ہوئی نہروں کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ دونوں ماخذ کے اعتبار سے ایرانی ہیں اور یہ کہنا بعید از قیاس نہیں ہے کہ ربیعہ کو دریا پار کرنے کے بعد ایک چوڑی نہر بھی عبور کرنا پڑی جو دریا کے بِتن کے قریب سے ہی نکلتی تھی۔ زرنج جیسے بڑے شہر کیلئے پانی کی مستقل فراہمی ضروری تھی لہٰذا سیلاب کے موسموں کے درمیان نہروں کو صاف رکھنا ضروری ہوتا تھا۔

مذکورہ دیہات دارالحکومت کے مضافات سے ذرا ہٹے ہوئے تھے۔ دشمنوں کے شہر کے قرب و جوار کو قابو میں لا کر اس نے موخر الذکر پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اُس نے کرنین (یا قرنیتین) کا رُخ کیا اور نہر سینارود سے گذرا۔ یہ غالباً ایک شیلا تھی یعنی ہلمند کی ایک پُرانی گذرگاہ تھی جو قریباً ۱۳۰۰ سال پہلے شمالی ڈیلٹا میں تھی اور موجودہ ڈیلٹا اور اضلاع غُلغُلہ اور سرونز کے درمیان حدّ فاصل کے مغرب میں تھی۔ یہ دونوں گذرگاہیں خوابگاہ کے گاؤں کے پاس ایک دوسرے سے جُدا ہو سکتی تھیں۔ پرانی گذرگاہ دشت کے ساتھ ساتھ سوزُو کے موجُودہ گاؤں سے گذر کر آشکِنک میں موجُودہ گاؤں میمو کے پاس داخل ہوتی تھی جبکہ ہلمند بجائے خود اس گذرگاہ میں بہتا تھا جو بعد کی اِلیمدار نہر سے زیادہ دُور نہ تھی۔ شیلا دارالحکومت سے ۶ میل مشرق میں ہوگی اور ہلمند اس کے مغرب میں اور یہ مضافات اور شہر کے اردگرد کے باغات سے زیادہ دُور نہ ہوگا۔

سینارود کی طرف دوسرا اشارہ بھی سر ہنری رالنسن نے انہی مصنّفین سے نقل کیا ہے۔ "عبید ابن زیاد کو سیستان سے سندھ کی طرف بھیجا گیا۔ پہلے وہ سینارود آیا اور پھر پُرانی ندی (جوئے کہنہ) کے ساتھ ساتھ رود بار سیستان تک آیا جو ہندمند پر واقع ہے۔ اس کے بعد وہ کش پہنچا اور آگے چلتا گیا۔ ربیعہ کا جانشین ابنِ سائرہ ہُوا جس نے مرزبان زرنج کو مغلوب کیا اور اس سے دس لاکھ درہم اور ایک ہزار غلام وصول کئے اور پھر زرنج اور کش کے درمیان کا سارا ہندوستانی علاقہ قبضے میں کیا اور الرّوخج کی شاہراہ کے تمام اضلاع بھی سر کئے حتیٰ کہ وہ دادر کے علاقہ اور بست اور زابل پر بھی متصرّف ہو گیا۔"

ان اقتباسات میں مذکور کش کیچ نہیں ہے بلکہ خاش نخلستان کا کشت ہے۔ یہ اُسوقت بھی آج کی طرح قندھار کا ایک ضلع تھا جسے عرب ہمیشہ ہندوستانی علاقہ گردانتے تھے اور سندھ کو ہند کی انتہائی مغربی سلطنت سمجھتے تھے اور اس سے خوب آشنا تھے۔

مصنّف یقیناً نخلستان خاش کے کشت اور مکران کے کیچ یا کیچ میں تمیز نہ کر سکا۔ اس کا

تو ایک لمحہ بھی تصور نہیں کیا جا سکتا کہ عبیدابن زیاد یا ابن سامرہ قلعہ بست پر کیچ مکران کے راستے حملہ کرے گا۔ یقیناً مذکورہ مصنف جگہ کش ضلع خاش کی کُشت ہوگی۔ یہ بھی محال ہے کہ عبیدابن زیاد کشت پہنچنے کے لئے زرنج سے ہلمند پر واقع رود بار جاتا جبکہ قریب ترین راستہ خاش رود کے ساتھ ساتھ تھا۔ رود بار تو کسی بھی وادی کو کہہ سکتے ہیں جسمیں کوئی دریا بہتا ہو۔ عراق عجم کا ضلع 'جہاں اسماعیلی بہت سے قلعوں کے مالک تھے' رود بار کہلاتا ہے کیونکہ اسمیں شاہ رود بہتا تھا جو سفید رود کے معاونین میں سے ایک تھا۔ کرمان کے جنوب مشرق کیطرف رامپور کے نزدیک بھی ایک رود بار ہے۔

سینا رود کی شیلا (موجودہ سیستان کی ایک مروجہ اصطلاح) کو پہلے عبور کرنا پڑتا تھا اور سیستان کے مذکورہ بالا واقعات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہلمند شمالی ڈیلٹا کے اس حصہ میں قائم ہو چکا تھا جہاں وہ اب موجود ہے۔ اُس وقت اس کی دو شاخیں بھی تھیں۔ ایک شاخ نہر تھی جو کسی وقت قدرتی آبی گذرگاہ ہوتی تھی اور دوسری اصل دریا تھی۔

ابن رستہ میں جوین سے شہر سیستان کے متبادل راستے کا ذکر کرتے ہوئے ہلمند کو ہم دارالحکومت کے مشرق میں پاتے ہیں۔ اُس کا ہلمند اور بلازری کا سنیا رود اصل میں دونوں ایک ہیں۔

استخری اور ابن رستہ دو نو دسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل کے وقائع نگار تھے اور اُس وقت دریا کی گذرگاہ میں وہ عظیم تبدیلیاں نہ ہوئی تھیں جو پچھلے سَو سوا سو سال میں ہوئی ہیں۔ مضافات و باغات، مرکز تجارت اور مہذب لوگوں کے مشہور شہر' بنائے گئے کی موجودگی' جہاں تہذیب و تمدن کا ہر آرام و آسائش میسر تھا، اس بات کی اجازت نہ دے سکتی تھی کہ دریا اپنی من مانی کرتا رہے۔ کبھی اُسے پانی سے بھر کر پتن بنا دے اور کبھی اسے خشک سالی سے دوچار کر دے۔ تاریخ سیستان ہمیشہ سے دریا اور انسان کے درمیان کشمکش کی ایک دستاویز رہی ہے جو ہنوز شرمندۂ الفاظ نہیں ہو سکی' اور گو کبھی کبھار دریا کامیاب رہا ہے تاہم اہل سیستان کی کامیابی کا

پلڑا ہمیشہ بھاری رہا ہے۔ مرور زمان کے ساتھ یہ بدلتا بھی رہا ہے۔ جب لوگ حملوں سے تنگ آجاتے تھے اور گھریلو تنازعات اور پے بہ پے قتل و غارت ان کی رُوح کو کچل دیتے تھے تو وہ دَریا کے ساتھ اپنی غیر مختتم جنگ جاری نہ رکھ سکتے تھے اور اسے مغلوب کرنے کی بجائے اپنی عام ضروریات کو دَریا کے تغیر و تلوّن کے مُطابق ڈھال لیتے تھے جس کا نتیجہ آئندہ بیان ہوگا۔

عربوں کی تسخیر ایران وسطِ ایشیا کے لگاتار حملہ آوروں کی تخریب کاریوں سے مختلف تھی جو اپنے عقب میں تباہی و بربادی کے گہرے نشانات چھوڑ جاتی تھیں۔ جہاں مزاحمت ہوئی یا جہاں کے لوگ بغاوت پسند ثابت ہوئے وہاں عرب سالار واقعی بہت سخت و درشت رہے، لیکن بحیثیت مجموعی اُن کی فتح وسیع ظرفی اور دانشمندانہ تحمّل کی آئینہ دار تھی۔

جہاں تک سیستان کا تعلق ہے، رواداری کی اس حکمتِ عملی نے زندگی کے معمولات کو اتھل پتھل نہیں کیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ عرب مسلسل یہاں وارد ہوتے رہے لیکن یہ تعداد غالباً زیادہ نہ ہوتی تھی، حتےٰ کہ نئے میدانہائے فتوحات کے فقدان نے مذہبی اختلافات پیدا کر دیئے جو خلافت کے متضاد دعوے داروں نے شدید بنا دیئے۔

سیاسی رقابتوں اور مذہبی مخاصمتوں نے ایک عام ایذا رسانی کی فضا پیدا کر دی اور مجبور و مقہور لوگ خلفائے بنو اُمیہ کی سلطنت کے دُور دراز حصّوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ان دُور افتادہ مقامات پر انہیں ایذا رسانی سے کچھ نجات ملی، کیونکہ اُن کی بہادری ہندی یا ترک کافر قبائل کے حملوں کیخلاف فدا کاران اسلام کے لشکروں کیلئے باعثِ تقویت بن گئی۔ لیکن عربوں کے بعض ستم زدہ اور انتہا پسند گروہ بعض اوقات مذہبی اور سیاسی عدم رواداری کی وجہ سے اتنے نفرت آلود ہو جاتے تھے کہ وہ مذہب سے ہی برگشتہ ہو جاتے تھے اور یہ لوگ سندھ اور کابل میں پناہ گزین ہوئے جہاں مقامی شاہی خاندانوں نے اُن کی سرپرستی کی۔

ایذا رسانی کے اسی جذبے سے تنگ آکر بنو عباس خراسان آگئے اور سیستان، کرمان اور کوہستان کے علاقوں اور قلعوں میں پھیل گئے اور خارجی انتہا پسندوں سے مل گئے۔

جب عربوں نے سیستان پر پہلے پہل قبضہ کیا تو انہوں نے غالباً دارالحکومت کو قلعہ بند کر دیا اور اہم ترین آتش کدوں کو تباہ کر کے مساجد کی بنیاد ڈالی۔ عرب والی جزیہ اور خراج لیتے تھے لیکن مؤخر الذکر کے ضمن میں موجود انتظامی ڈھانچہ ہی برقرار رہنے دیا گیا۔ قصبوں اور دیہات میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی اور اُن کا نظام آبپاشی جاری رہا۔ وادی دجلہ و فرات، جیحوں کے کناروں پہ اور سستیان میں عربوں کو ایک نظام مالگزاری کے علاوہ دیہاتی کاشتکار آباد یہاں ملیں جو اپنے قدیم، موروثی عمّال کے تحت کام کرتی تھیں اور ان سب کا اپنا اپنا لیکن ایک ہی جیسا نظام آبپاشی تھا۔ فاتحین نے بلاشک وشبہ انہیں برقرار رکھا اور ان کی قدر و قیمت کو سمجھ کر ان کی سرپرستی کی گو ان کے اپنے علاقے میں اس قسم کے ادارے موجود نہ تھے۔ زردشت کا مذہب بھی لوگوں میں مدّتوں جاری وساری رہا حضرت عمرؓ کے فرمان نے ایرانی گبر کو بھی جزیہ کے فوائد و مراعات کا اہل قرار دیا جو عیسائیوں اور یہودیوں پر بھی عاید کیا گیا تھا کیونکہ وہ اسلام کی سیاسی سیادت کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنے اپنے مذہب پر قائم رہے تھے۔ لہٰذا قصبوں اور دیہات میں زندگی معمول کے مطابق رواں دواں رہی اور مرورِ زمان کے ساتھ کئی نئے قصبے اور گاؤں بھی وجود میں آتے گئے۔ اسوقت کے کھنڈرات اب سیستان میں بہت کم نظر آتے ہیں کیونکہ اُسوقت جو مقامات موجود تھے بلکہ قدیم دور سے موجود تھے اُن کا ذکر تو ہمیں ملتا ہے لیکن کھنڈرات اُن عمارات کے ہی ملتے ہیں جو ان قدیم عمارات کی جگہ پر تعمیر کی گئی تھیں۔ ان مقامات کے پرانے نام بھی اکثر حالات میں محو ہو گئے ہیں اور صرف معدودے چند بچے ہیں جو ایسی بستیوں سے منسلک ہو گئے ہیں جہاں اب کھنڈرات کا نام ونشان تک نہیں۔

تاریخ سیستان کئی نسلوں تک خوارج کے فتنہ و فساد کی ایک طویل دستاویز ہے جو یہاں اور خراسان میں بہت بڑی تعداد میں آباد ہو گئے تھے۔ ہرات کے قریب خوارج اور والئ نیشاپور کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ اس لڑائی کا میدان کارزار گاہ مشہور ہو گیا اور بعد میں ایک مشہور و معروف قبرستان بن گیا جہاں بہت سے نامور علماء فضلاء اور اولیاء سپرد خاک

کہے گئے۔ بعد میں اسے مخفف کر کے کازرگاہ کہنے لگے اور غالباً اب بھی یہ اسی نام سے مشہور ہے۔

۱۲۵ھ (= ۷۴۲ء) میں خلیفہ ہشام اموی فوت ہو گیا اور اُسکے یکے بعد دیگرے تین جانشین نہ تو مسند خلافت کے اہل تھے اور نہ اُن انقلاب انگیز واقعات کو لگام دینے کے اہل تھے جو بنو عبّاس کو برسرِ اقتدار لانے والے تھے۔

بنو عبّاس کے دُعاۃ نے خراسان کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا اور مختلف اضلاع کے لوگ بھی اُن کے حق میں فیصلہ کر چکے تھے۔ بنو مُضر (اسماعیلؑ کے اخلاف) اور بنو حُمیر (یمنی) کے درمیان قدیم منافشات بھی کھلّم کھلاّ پھوٹ پڑے تھے اور بنو امیہ کے زوال کے متعلق ایک مبہم پیشگوئی نے فضا کو گومگو کی کیفیت سے بھر دیا تھا۔ ۱۳۰ھ (= ۷۴۸ - ۷۴۷ء) میں ابو مسلم نے مَرو میں بنو عبّاس کا سیاہ علم لہرا دیا اور خطبہ آل عبّاس کا پڑھا جانے لگا۔ لیکن اس کے اعلان سے کچھ ہی عرصہ پہلے سیستان میں خوارج کی ایک زبردست بغاوت ہوئی جو بظاہر بنو امیہ کے خاتمہ کی پیشگوئی کی تکمیل معلوم ہوتی تھی[۱]۔

ان ہنگاموں نے سیستان کے کیانیوں کو (جو اب مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے) کوئی امتیاز نہیں بخشا اور ان میں سے کوئی بھی صفحات تاریخ میں مذکور نہیں ہے حتیٰ کہ تیسری صدی عیسوی میں ملوک الطوائف صفِ اوّل میں آگئے جو نویں اور دسویں صدی عیسوی کے مطابق ہے۔

اس صدی میں جیحون پار کے علاقوں میں آل سامان سر یر آرائے سلطنت ہوئے اور لیث کیانی صفار (تانبے کا ظروف گر) کے بیٹے برسر اقتدار آئے۔ اسی پیشہ کی بدولت یہ صفاری مشہور ہوئے۔ لیث کیانی کے دنوں سے سیستان میں بہت سے صفاری ہوتے ہیں قدیم

---

[۱] پیشگوئی یوں تھی کہ کوئی عبدالرحمٰن نامی فرد بنو امیہ کو اقتدار سے محروم کر دے گا اور جب سیستانی خوارج نے عبدالرحمٰن ابن الحمد الاشعث کے تحت یہ زبردست بغاوت کی تو لوگوں نے اسے پیشگوئی کی تکمیل سمجھا لیکن یہ بغاوت دبا دی گئی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد عبدالرحمٰن ابو مسلم مروی نے علم بغاوت بلند کیا جس سے بنو امیہ کا اقتدار واقعی ختم ہو گیا۔

قصبوں اور بستیوں کے کھنڈرات سے بہت سے زیورات اور خانگی ظروف ملے ہیں جو خالص یا مرکّب تانبے کے بنے ہوتے ہیں۔ گویا یہ پیشہ بہت نفع بخش تھا اور بہت سے لوگ اس سے وابستہ تھے لیکن صفّاری صرف بنو لیث کہلاتے ہیں جنہوں نے ایک مختصر المیعاد شاہی خاندان کی نیو ڈالی تھی۔

۸۶۵ء تا ۲۳ جون ۸۷۵ء۔

۲۵۱ھ میں یعقوب بن لیث سیستان کا حکمران بنا اور ۱۴ شوال ۲۶۵ھ کو وہ جندی شاہ پور میں فوت ہوا جو اہواز کا ایک قصبہ تھا۔ اسے یہیں دفن کیا گیا۔ پندرہ سال کے عرصے میں اس نے ایک وسیع سلطنت تعمیر کر لی تھی جو عراق سے سرحدات ہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سلطنت اس کے بھائی عمرو بن لیث کا ورثہ بنی۔ خلیفتہ المسلمین کے ساتھ اس کے تعلّقات کشیدہ ہو گئے تھے لہٰذا وہ آل سامان کو صفّاریوں کے خلاف اُکساتا رہتا تھا لیکن عمرو نے اس کشیدگی کو دُور کیا اور خلیفہ نے بھی امتیازی سلوک کیا اور اس کے نمائندے کو اسناد دیں جنہوں نے اسے خراسان، فارس، اصفہان، کرمان اور سندھ کی حکومت پر مستقل کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک عَلَم بھی بھیجا جسے عمرو نے تین دن تک قلعۂ زرنج پر لہرایا تاکہ شہرۂ اعزاز چار دانگ سلطنت میں پھیل جائے۔

لیکن اس کے بھائی کی زود ساختہ سلطنت اور اس کی اپنی ذاتی صفات اور مساعی کی بدولت اس کے استحکام کے باوجود اس میں انحطاط کے عناصر موجُود تھے۔ اس کی اپنی جوع الارض نے اسے بہت جلد ماوراالنّہر کے سامانی حکمران سے متصادم کر دیا۔ بلخ کی دیواروں کے سائے میں اسماعیل سامانی نے عمرو کو شکستِ فاش دی اور وہ تیرہ سالہ حکومت کے بعد قیدی بنا لیا گیا۔ فاتح نے اُسے بغداد بھیج دیا اور وہ خلیفہ کی جیل میں ہی مر گیا۔ دو سال بعد اس کے برادرزادہ اور اس کے اپنے اخلاف نے اپنی آزادی کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن وہ ایک ایک کرکے شکست کھاتے گئے اور خلیفتہ بغداد کے قید خانوں میں سڑتے رہے۔ یوں کیانی خاندان کی

شاخ کبیر ختم ہوگئی اور اُن کی سلطنت سامانیوں کے ماتحت ہوگئی جو ایک والی کے ذریعہ اس پر حکومت کرتے رہے۔

۲۲-۹۲۱ء:-

لیکن یہ خاندان سرے سے معدوم نہیں ہوا۔ ۳۰۹ھ میں احمد بن محمد بن خلف بن ابوجعفر بن لیث (جو غالباً لیث صفار کا ایک پوتا تھا) ہرات میں نہایت عسرت کی زندگی گذار رہا تھا کہ اتفاقیہ وہ آل سامان کے پانچویں حکمران، امیر ابوالحسن نصر بن احمد کی نظر میں آگیا اور اس نے اُسے والیٔ سیستان بنا دیا۔

۲۴-۹۲۳ء:-

۳۱۱ھ میں شاہ ملک ابن یعقوب لیث نے سنجریوں کا ایک دستہ لیکر ہرات پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن تھوڑے عرصہ بعد وہ فوشنج کیطرف چلا گیا۔ واپس آکر اس نے چار ماہ تک ہرات کا محاصرہ کئے رکھا لیکن ناکام لوٹا۔ احمد کے بعد اس کا بیٹا خلف غالباً ۳۴۴ھ (۵۶-۹۵۵ء) میں جانشین ہوا۔

۹۶۴ء:-

۳۵۳ھ میں خلف اپنے داماد طاہر ابن الحسین کو نائب بنا کر خود مکے روانہ ہوگیا۔ واپسی پر طاہر نے اسے زمام حکومت دینے سے انکار کر دیا اور موخر الذکر کو مجبوراً آٹھویں سامانی حکمران، امیر منصور بن نوح سے بنفس نفیس مدد کا طالب ہونا پڑا۔ خلف کو بحال کر دیا گیا، اور فوجیں واپس بخارا چلی گئیں لیکن طاہر واپس آیا اور خلف کو نکال باہر کیا۔ امیر منصور سامانی نے دوبارہ اس کی مدد کے لئے فوج بھیج دی، فوج کے پہنچنے تک طاہر فوت ہوگیا لیکن اس کے بیٹے حسین نے لڑائی جاری رکھی اور خود ایک سیستانی قلعہ میں بند رہا جس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اس نے سامانی حکمران کے پاس ایک سفیر بھیجا اور اسے بخارا حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ اُسے بخارا جانے کی اجازت دے دی گئی۔

۵- ۱۰۰۴ء تا -

اس وقت سامانی حکومت بہت کمزور ہوگئی تھی اور ۳۹۵ھ میں آخری حکمران ابوابراہیم قتل کر دیا گیا اور یوں ۱۵۰ سالہ خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ خلف کی کاروائیوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا سوائے اس کے کہ اُس نے نوح سامانی کےخلاف بغاوت کی اور سات سال تک اس کا دار الحکومت زیر محاصرہ رہا۔

اس حکمران کے تحت سیستان ایک خوشحال ریاست بن گئی۔ خلف اور اس کے والد احمد بن محمد دونوں نے اپنے نام کے سکے جاری کئے۔ مؤخر الذکر کے سونے اور تانبے کے سکے سیستان میں دریافت ہوئے ہیں اور جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی کے شمارہ برائے جولائی ۱۹۰۵ میں بیان کئے گئے ہیں۔ سونے کے سکوں میں حکمران کا شجرۂ نسب احمد بن محمد بن خلف دیا گیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سجستان میں مضروب ہوئے۔

۹۰ - ۹۸۹ء تا -

خلف کا ایک سونے کا سکہ بھی اُسی جرنل میں مذکور ہے اور اس کی تاریخ غالباً ۳۷۹ھ ہے۔ چونکہ اِن سکوں میں سامانی حاکمِ اعلیٰ کا کوئی ذکر نہیں ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ سیستانی حکمران آزاد حکمران تھے اور ان ابتدائی ایام میں بھی حاکمان اعلیٰ کا اقتدار رُو بہ انحطاط تھا اور سیستان عملاً اور واقعتاً ہر طرح ایک آزاد ریاست تھا۔ خلف بن احمد کے دور میں دار الحکومت بھی غالباً زرنج سے زاہدان تبدیل کر دیا گیا۔ مؤرخین کی تحریرات سے اتنا کچھ ہی اخذ کیا جاسکتا ہے لیکن وہ نئے پایۂ تخت کے نام کا کوئی ذکر نہیں کرتے گو تبدیلی دار الحکومت واضح طور پہ مذکور ہے۔

سیستان کے موروثی مجتہدین کا خاندان کئی صدیوں سے یہاں آباد رہا ہے اور جب تک کیانی ملوک کی حکومت رہی اس خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد مجتہد کے منصب پہ فائز ہوتا رہا شہزادوں اور امیر زادوں کی تعلیم و تربیت بھی اسی خاندان کے سپرد رہی۔ وہ شاہی کالج یا مدرسہ کے بھی منتظم رہے ہے

جن کی دو بعد کی عمارات کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں۔
ملّا خسرو اس مجتہد خاندان کی چھوٹی شاخ میں سے تھا اُس نے بیان کیا کہ اُن کے آباؤ اجداد اُسوقت سیستان آئے جب زاہدان پہلی دفعہ تعمیر ہُوا اور سیستان کی خوشحالی بحالی ہوئی۔ اُس وقت یہاں اہلِ علم موجود نہ تھے اور اُس کے آباؤ اجداد کو شیراز سے یہاں بُلایا گیا۔ ان نووارِدوں نے مسجد اور مدرسہ تعمیر کئے جن کے آثار اب بھی زاہدان کے شمال کیطرف میل قاسم آباد کے گرد دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں مینار کے شمال کی طرف بڑی ڈھیری مسجد تھی۔ چھوٹے چھوٹے کمرے جو مینار سے ملحق ہیں مدرسہ تھے اور مینار کے شمال، مشرق اور جنوب میں صحن کے آثار اس مذہبی وتعلیمی عمارت کی وسعت یا احاطہ کو ظاہر کرتے ہیں۔
تاریخی منابع سے معلوم ہوتا ہے کہ خلف ابن احمد اسلام کا پُرجوش داعی تھا۔ وہ علماء فضلا کو اپنے ملک میں آباد ہونے پر راغب کرتا تھا، علم وفضل کا زبردست مربّی تھا اور قرآن حکیم کی بہت سی تفاسیر اُس سے منسوب کی گئی ہیں جو اُن علماء ومفسّرین نے لکھیں جو اُس نے اپنے گرد جمع کر لئے تھے۔
لہٰذا یہ سمجھنا ایک خالی خولی مفروضہ نہیں ہے کہ اس مذہبی عمارت کی تعمیر اُس کے دَور میں ہوئی جس کے آثار اوپر مذکور ہوئے ہیں اور اس کی تعمیر کے لئے نئے شہر کی قربت سے زیادہ موزوں جگہ اور کوئی نہ تھی۔ زمین کی اُبھری ہوئی سطح (یالرگ) پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ عمارات سیلاب کی زد سے باہر تھیں اور یہ ڈیلٹائی علاقے میں تعمیر کے لئے شرطِ مقدم ہے۔ یہ حقائق اُس مشابہت کے بھی ذمہ دار ہیں جو بعد ازاں بنے ہوئے مینار کے گرد کے آثار اور علاقہ زاہدان کے اندر تعمیر شدہ ویسی ہی عمارت کے آثار میں پائی جاتی ہے۔

۹۹۸-۹ء:-

جب سامانی کمزور ہو گئے تو جیحوں کے جنوب کے مقبوضات سُلطان محمود غزنوی نے جذب کر لئے جو ہندوستان میں فتوحات کے لئے مشہور ہے۔ ۳۸۹ھ میں سُلطان نے آخری سامانی کو

شکست دی جو مقابلے پر نہ ٹھہر سکا اور اسی سال خلیفہ القادر باللہ نے امیر محمود کو خلعت بھیجی اور اُسے خطابات سے نوازا۔ اس وقت بلخ موسمی طور پر اس کا صدر مقام بنا رہا۔ ۳۹۰ھ میں اُس نے نیشاپور پر زبردست حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور سامانی حکمرانوں کا غلام ایک تزُون وہاں سے فرار ہو گیا۔

اسی سال خَلَف ابنِ احمد نے بھی توسیع سلطنت کی کوشش کی غالباً اس خیال میں کہ وہ اپنے سابقہ حاکمِ اعلیٰ کا کچھ نہ کچھ علاقہ تو قبضا ہی لے گا۔ اس پر اُس کی محمود سے ٹکر ہو گئی ــــ ۳۹۰ھ (= ۱۰۰۰ء) میں خَلَف کے بڑے بیٹے، طاہر نے محمود کے چچا، بُغراجک کو فوشنج میں قتل کر دیا۔ اس حادثے نے (کیونکہ بعض روایات کے مطابق بُغراجک نشہ شراب کی وجہ سے گھوڑے سے گر پڑا اور مر گیا) محمود کا غیظ و غضب خَلَف کی طرف منتقل کر دیا۔ سیستان پر حملہ کیا گیا اور خلف کو قلعہ تاک میں محصور کر دیا گیا۔ اغلب یہ ہے کہ اُس نے محمود کو اپنا حاکمِ بالا تسلیم کر لیا اور غزنوی فوج واپس بُلا لی گئی۔

۴- ۱۰۰۲ء:-

۳۹۳ھ میں خَلَف اپنے بیٹے، طاہر کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گیا لیکن جلد ہی پشیمان ہُوا اور اختیار دوبارہ سنبھال لیا اور بیٹے کو مار دیا۔ بعض اسناد کے مُطابق اس نے اپنے دونوں بیٹے، طاہر اور عمرو دونوں اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دیئے اور انہیں تاک کی دیواروں کے باہر دفن کر دیا۔ اس فعل نے اُس کے زوال کی رفتار کو تیز کر دیا۔ وہ غیر مقبول ہو گیا اور بیٹے کے قتل کے بعد سیستان کے کبارِ مشمولہ بہ قرابتداران اُس کی اطاعت سے منحرف ہو گئے، اور دارالحکومت میں ہی اُس کو محصور کر کے محمود غزنوی کے نام کا خطبہ و سکّہ جاری کر دیا۔

چونکہ باغی خَلَف کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہ کر سکے لہٰذا محمود نے خود سیستان پر حملہ کر دیا اور خَلَف کو قلعہ تاک میں محصور ہونا پڑا۔ ایک طویل محاصرہ کے بعد اُس نے ہتھیار ڈال دیئے اور محمود کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ تاریخ کا ایک نازک لمحہ تھا۔ خَلَف نے فاتح کو سلطان کہہ کر خطاب کیا،

جس پر محمود خوش ہو گیا، اُس کی جان بخشی کر دی اور اُسے اور اُس کے اہل و عیال کو جز جانان سامان سمیت منتقل کر دیا اور یوں خلف نے ہمیشہ کے لئے سیستان کو چھوڑ دیا۔

۸ - ۱۰۰۷ء:-

۳۹۸ھ میں اُسے محمود کے خلاف حاکم ترکستان، ایلک خان کے ساتھ خط و کتابت کرتے ہوئے پکڑا گیا جس پر اُسے قلعہ جزوینہ میں محبوس کر دیا گیا۔ وہ یہاں ۳۹۹ھ (= ۹-۱۰۰۸ء) میں فوت ہو گیا اور محمود نے حکم دیا کہ اُس کی جائیداد سب سے چھوٹے بیٹے ابو الحفص کو منتقل کر دی جائے جسے آخری کیانی اپنا مورث سمجھتے ہیں جیسا کہ شجرۃ الملوک سے معلوم ہوتا ہے جس کا ایک نسخہ ۱۹۰۳ میں سیستان میں ملا تھا۔

اپنے ظلم و تشدد اور خونخوار مزاج کے باوجود خلف تحریک نشاۃ ثانیہ کے اطالوی حکمرانوں کی طرح موقت الشیوخ علم و فضل کا بہت بڑا مربی تھا۔ اُس کے حکم پر اُس کے دور کے علماء فضلاء نے قرآن حکیم پر ایک تفسیر مرتب کی جو سو جلدوں میں تھی اور جس کے اخراجات اُس نے خود برداشت کئے۔ یہ اخراجات اُس وقت کی قیمت زر کے مطابق ۱۰۰,۰۰۰ (ایک لاکھ) دینار تھے۔

محمود غزنوی نے سیستان اپنے بھائی ناصر کے حوالے کیا اور یہ ملک سلاطین غزنی کیساتھ منسلک رہا حتیٰ کہ اُن کی طاقت جاتی رہی اور خراسان کی سیاست پر سلاجقہ چھا گئے۔

سلطان محمود غزنوی نے ۳۳ یا ۳۴ سال حکومت کی اور اُس کی وفات کے بعد اُس کا کوئی بھی جانشین ایسا نہ تھا جو ۱۰ سال سے زیادہ تخت پر متمکن رہا ہو۔ افراد خاندان یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوتے رہے اور جوں جوں اُن کی قوت کمزور ہوتی گئی، دُوں دُوں سلاجقہ کا ستارہ عروج پکڑتا گیا۔ آخر کار سلاطین الپ ارسلان اور محمود شاہ کی پشت پناہی کی بدولت خلف کے ایک پڑپوتے طاہر بن محمد بن طاہر بن خلف نے اپنے وطن کی حکومت دوبارہ حاصل کر لی۔ الپ ارسلان بن داؤد بیگ کو ربیع الاوّل ۴۶۵ھ (نومبر دسمبر ۱۰۷۲ء) میں

قتل کردیا گیا اور ملک شاہ اس کا جانشین ہوا۔

۶۸-۱۰۶۷ء :-

طاہر بن محمدؒ بن طاہر بن خلف کو ۴۶۰ھ میں سیستان کی حکومت پر بحال کیا گیا اور اس نے سلاطین الپ ارسلان اور ملک شاہ کے باجگزار کی حیثیت سے ۲۰ سال حکومت کی (۴۶۰ تا ۴۸۰ھ = ۶۸-۱۰۶۷ء تا ۸-۱۰۸۷ء)۔ الپ ارسلان کے قتل کے بعد تخت کے بہت سے دعویدار اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "بہاؤ الدولہ طاہر بن ناصر بن احمد بدر الدولہ شمس الملوک امیر ابو العباس عرب، عباس اور امیر شاہنشاہ"

تاریخ سیستان کی ابتدا سے ہی یہاں دو عربی النسل خاندان آباد رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بہت با اثر تھا اور میران سیستان کہلاتا تھا۔ ان کے باقیات اب بھی سیستان میں موجود ہیں اور امیر عباس اسمٰعیلی مرحوم کے بیٹے ان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دعویدار امیر ابو العباس کے نام کے ساتھ لفظ 'عرب' کا اضافہ ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کیانی نہ تھا بلکہ سیستان میں آباد عرب خاندان سے متعلق تھا۔

دوسرا خاندان چکانسر کے میر عرب کا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ سلطان الپ ارسلان کے قتل کے بعد انہی خاندانوں کے کسی فرد نے سیستان کی حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی ہو۔

امیر شاہنشاہ یقیناً کیانی تھا اور اس نے زرنج پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا اور بالآخر شہر سیستان پر بھی ۴۸۰ھ (۸۸-۱۰۸۷ء) میں قابض ہو گیا۔ طاہر بن محمد جنت الفردوس کے مطابق ۴۸۰ھ میں ہی فوت ہوا اور بہاؤ الدولہ طاہر بن ناصر بن احمد ملک شاہ کے دور کے اواخر میں اس کے باجگزار کی حیثیت سے حاکم سیستان بنا، وہ ۴۸۱ھ (=۱۰۸۸ء) میں فوت ہوا۔

لیکن حکومت طاہر بن محمدؒ کی اولاد میں مستقل کر دی گئی اور اس کا بیٹا تاج الدین اور بقول بعض ابو الفضل ناصر بن طاہر حاکم بنا۔ وہ ۴۸۰ھ میں برسر اقتدار آیا۔ یہ تاریخ میجر راورٹی نے دی ہے۔ ممکن ہے کہ بہاؤ الدولہ کا یکسالہ دور نظر انداز کر دیا گیا ہو یا اُن حضرات کو معلوم ہی نہ ہو جن سے فاضل

مترجم مستفید ہوا۔

ملک تاج الدین بن طاہر بن محمد کے حالات بیان کرنے سے پہلے خلف بن احمد کے پڑپوتے، طاہر کی بحالی پر ملکی حالات کا تفصیلی جائزہ لینا مفید رہے گا۔

"طاہر کے دَور میں سیستان کے قلعے اور دیگر عمارات بحال کی گئیں اور شاہی محل جو اُس نے قلعہ کے اندر بنوایا۔ اُسی کے نام پر موسُوم ہُوا۔ اس کے کھنڈرات سے ہی اُس کا جاہ و حشم نمایاں ہے"۔ یہ قلعہ زاہدان کے اندر قلعہ بند محل ہے جس کے آثار اب بھی اس ملک میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ محل بجائے خود شہر کے قلعہ یا ارَق کے اندر قلعہ بن گیا۔

سلاطین غزنوی کی سیستانی مہمات کے دَوران ملک پر اُن کے نائب حکومت کرتے تھے اور تمام قلعہ بندیاں غالباً کم و بیش مسمار کر دی گئیں یا ان کو بلا مرمت چھوڑ دیا گیا تاکہ بغاوت کاروں کے قبضہ کی صورت میں ان کی کوئی اہمیت یا افادیت نہ رہے۔ البتہ طاہر کو تخت کے عدم استحکام کی وجہ سے ایک ایسی جائے پناہ کی ضرورت تھی جہاں سے وہ بغاوت کاروں اور شر پسندوں کے دانت کھٹے کر سکے۔

دعویدار" امیر شاہنشاہ نے زرنج میں اپنے نام کا خطبہ رائج کیا۔ کئی سالوں تک بادشاہ اور اُس کے اُمراء بمعہ اہلِ ادک اور امیرانِ سیستان کے درمیان آویزش چلتی رہی حتیٰ کہ ۴۸۰ھ میں شہر امیر شاہنشاہ کے حوالے کر دیا گیا"۔ اُس نے غالباً طاہر کی موت پر زاہدان پر قبضہ کر لیا۔ جو تھوڑا سا عرصہ برقرار رہا۔ لہٰذا اسوقت کے سیستان میں یکساں اہمیت کے دو شہر تھے اور یہ دونو بلاشک و شبہ زاہدان اور بنائے کئے تھے۔ مشرق میں بڑے شہروں کی آبادی ہمیشہ پُرشورش اور تفرقہ پسند رہی ہے اسی لئے خلف بن احمد نے اپنا صدر مقام دُوسری جگہ بدلا اور اسے اپنے پیرو کاروں سے آباد کیا۔

۱۸-۹۱۷ء:-

زرنج یا بنائے کے کے متعلق ابو اسحاق الاستخری (قریباً ۳۰۵ھ) نے اس کی لبریز خندق

کا ذکر کیا ہے جو اس کے اندر قدرتی چشموں کے پانی سے بھر جاتی تھی۔ نشیبی حصوں میں جہاں زرنج واقع تھا، پانی سطح زمین سے زیادہ دُور نہیں تھا اور دیواروں کے گرد گہری کھائیاں تحت الزمین پانی سے بھر جاتی تھیں۔ نہروں کا فاضل پانی بھی اس کا ذمہ دار تھا گو یہ اسے معلوم نہ تھا۔ ہم نہایت آسانی سے اس گہری اور چوڑی خندق کا تصوّر کر سکتے ہیں جس کا پانی متعفّن تھا اور جس کے کنارے پر سرکنڈے اُگے رہتے تھے گو لوگ انہیں کاٹتے بھی رہتے تھے۔ یہ خندق بالکل ویسی ہی تھی جیسی آج کل سیستان کے دارالحکومت قلعہ ناصر آباد کے ارد گرد ہے۔

طاہر بن محمد کے دَور میں سیستان میں موجود مختلف گروہ جن سے پانچ دعویدار اُبھرے تھے، فطرت کے عین مطابق مقامی رنگ لئے ہوئے تھے۔ یہ گروہی جذبہ اور اس سے منتج ہونیوالے متضاد لائحہ عمل خارجی عنصر کا براہِ راست اثر تھے جو مدتوں سیستان پر حاوی رہا تھا۔ تاریخ کے ہر موڑ پر جب بیرونی حملے طاقتور حکمران کی وجہ سے اپنا زور کھو بیٹھتے تھے تو یہ گروہی اور فتنہ پرور جذبہ بار بار اُبھر آتا تھا۔ کیانیوں کی مختلف شاخوں نے ہمیشہ ایسے افراد پیدا کئے ہیں جو تخت کے دعویدار بن بیٹھتے تھے یا دسیسہ کاروں کے آلۂ کار بن جاتے تھے اور خاندانی و ملکی مفادات کو نقصان پہنچاتے تھے۔

ملک تاج الدّین ابوالفتح اپنے والد طاہر بن محمد کا جانشین بنا۔ اُس کا دور طویل اور خوشحال تھا۔ سلجوق سلاطین کے باجگزار کی حیثیت سے وہ سلطان سنجر کے جھنڈے تلے لڑنے کے لئے ایک سیستانی لشکر لے کر گیا جب سلطان موصوف نے قراخطائی کے خلاف مہم کشی کی۔ یہ ۵۳۴ھ (= ۴۰-۱۱۳۹ء) میں ہُوا۔ سُلطان سنجر شکست کھا گیا لیکن ۳۰۰ گھوڑسواروں کے ساتھ میدان سے بچ نکلا۔ ملک نیمروز (سیستان کا نیا نام جو اسوقت اسے دیا گیا) اس کے برعکس ڈٹا رہا اور سُلطان سنجر کی ملکہ، ترکان خاتون کے ساتھ قید ہُوا۔ یہ لڑائی سمرقند کی سرحد پر دشتِ قطران میں ہوئی اور شکست خوردہ بادشاہ نے قلعہ ترمذ میں پناہ لی۔

کافی عرصہ قید میں گذارنے کے بعد ملک تاج الدّین سیستان واپس آیا۔ میل قاسم آباد (جو گاؤں

کے قریب ہی ہے) کے عظیم مینار کے آثار کے زیریں کتبہ میں اس حکمران کا نام بھی مذکور ہے اور یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ یہ مینار اُس نے کافر قراخطائیوں کی قید سے نجات پہ تائید ایزدی کے شکرانے کے طور پر خود ہی شروع کیا اور اسے قریباً مکمل کر دیا۔ یہ کارنامہ اسلام کے ایک مخلص ہیرو کو زیب دیتا تھا اور اس نے اس جگہ پر موجود مذہبی عمارات کی شان کو دوبالا کر دیا۔ غالباً یہیں کی مسجد میں ملک تاج الدین نے وہ زنجیریں بھی لٹکا دیں جو اس نے وحشیوں کی قید میں پہن رکھی تھیں اور جنہیں طبقات ناصری کے مصنف نے سفر سیستان میں دیکھا۔ تاج الدین کے دور کے اواخر میں خراسان میں ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے جنہوں نے اسے سلاجقہ سے آزاد کر دیا۔ غز ترکوں کا سیلاب مغرب کی طرف اُمنڈنے لگا تھا اور سلطان سنجر نے اسے روکنے کے لئے ۵۴۸ھ (۴ - ۱۰۵۳ء) میں اُن پر حملہ کیا لیکن بہت بُری طرح شکست کھا گیا اور اپنی ملکہ ترکان خاتون کے ہمراہ قید ہوا۔ ۵۵۱ھ (= ۱۰۵۶ء) میں سلطان سنجر قید سے بھاگ نکلا لیکن ۵۵۲ھ (=۱۰۵۷ء) میں وہ مرو میں فوت ہو گیا۔ سلطان سنجر سلاجقہ کا آخری عظیم حکمران تھا گو ان کی سلطنت اس کی وفات کے ۳۲ سال بعد تک زندہ رہی۔ اسی قبیلہ کی ایک شاخ نے کرمان میں قدم جما لئے۔ ۴۶۶ھ (۴ - ۱۰۷۳ء) میں سلطان ملک شاہ کے بھائی، تاکش نے ہرات میں بغاوت کی تو اسے پکڑ لیا گیا اور اصفہان میں نظر بند کر دیا گیا۔ اسی سال کاوُرد شاہ نے کرمان میں بغاوت کی لیکن وہ لڑائی میں کام آیا۔ کاوُرد شاہ کے جانشینوں نے البتہ ۶۰۷ھ تک کرمان میں حکومت کی جب کرمان سلطنت خوارزم میں شامل کر لیا گیا۔ کاوُرد شاہ کے خاندان کے خاتمہ کے بعد لیکن کرمان کے الحاق سے پہلے غز قبائل[1] ملک دینار اور اس کے ماتحت سرداروں کی زیر سرکردگی اس صوبے میں بس چکے تھے اور ملک کی خوشحالی تباہ کر چکے تھے۔ سرحد یعنی کرمان کے مشرقی اضلاع کے بڑے بڑے

---

[1] غز یا غُز قبائل کا مندرجہ ذیل مختصر تذکرہ زیادہ تر ان قیمتی حواشی سے مرتب کیا گیا ہے جو میجر راورٹی نے طبقات ناصری کے ترجمہ پہ لکھے ہیں۔
جیحوں پار کے علاقہ میں ترکوں کی سرحد پرشش نامی ایک ضلع بھی ہے، ایک دریا بھی اور ایک

قبائل جیسے گمشادزئی، یاراحمدزئی، ناہروئی وغیرہ غالباً غز کے باقیات ہیں۔ ان کی عادات، طرزِ زندگی اور شورش پسندی اور تہذیب کی نچلی سطح جو عموماً ان قبائل اور نام نہاد براہوئی قبائل کو ممیز کرتی ہیں غالباً اس بات کی غماز ہیں کہ وہ غز کے نمائندے ہیں جو دیگر نسل پاروں کے ساتھ ارتباط و اختلاط سے کسی حد تک بدل گئے ہیں۔

شہر بھی۔ اسے فنکث بھی کہتے ہیں اور یہ موجودہ تاشقند ہے۔ اسے چتو اور نج بھی کہتے ہیں۔ اس کے باشندے غز اور خلج قبائل کے مسلمان تھے۔

غزوں نے ۵۴۵ھ میں غزنی پر قبضہ کر لیا لیکن سلطان غیاث الدین نے ۵۶۹ھ (۱۱۷۳-۴ء) میں اسے دوبارہ فتح کر لیا اور اپنے بھائی (اور جانشین) معز الدین کو دے دیا۔ سلطان معز الدین غوری نے ایک غز پارہ، سنکران کے لشکر کو ۵۷۱ھ (= ۱۱۷۵-۶ء) میں شکست دی۔

ایک غز لشکر نے ختلان اور خستدان سے آگے بڑھ کر سلطان سنجر سلجوقی کو ۵۴۸ھ (۲۰ مارچ ۱۰۵۶ء) میں شکست دی۔ غزوں نے خراسان کو تباہ کر دیا اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے عورتوں اور بچوں کے سوا ایک لاکھ آدمی مار دیئے۔ خوارزم شاہ کو خراسان کو غزوں سے بچانے کے لئے خاقان خطائی سے مدد مانگنا پڑی اور پھر سرخس میں متمکن ملک دینار پر حملہ کیا اور اسے بمعہ قبیلہ کرمان میں دھکیل دیا۔ ۵۷۰-۶ھ تا ۵۸۱ھ (۱۱۷۴-۸۱ء تا ۱۱۸۵ء) یہ لوگ کرمان منتقل ہوتے رہے حتیٰ کہ ۵۸۳ھ (اگست ۱۱۸۷ء) میں ماہ رجب میں اس نے اپنا اقتدار قائم کر لیا اور ۸ سال تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا جانشین ہوا۔

غز قبائل خلیفہ مہدی عباسی کے دور میں مسلمان ہوئے لیکن وہ مقنع خراسانی کے پیرو بن گئے۔ پھر اس سے تائب ہو گئے اور وہ جیحون پار چلا گیا۔

اس قبیلے کے پاس بھیڑوں کے بہت ریوڑ تھے اور یہ سالانہ ۲۴۰۰۰ بھیڑیں بطور خراج شاہ سلجوق کو ادا کرتے تھے۔ خراج میں اضافہ کا مطالبہ اس کی شکست و ریخت بن گیا۔ غز زمینداور، مرو، سرخس اور بلخ میں پھیل گئے اور قلعہ بست، گرم سیر حتیٰ کہ ہرات بھی ان کی لپیٹ میں آ گئے۔ انہوں نے نیشاپور کو لوٹا اور جامع مسجد کے گنبد سے ایک زنجیر سے لٹکائے ہوئے مشہور تانبے کے چراغ کو توڑ دیا اور اونٹوں پر لاد کر لے گئے۔ اس فانوس میں ۴۰۰ قندیلیں تھیں۔ مسجد کے سامنے کا تانبے کا حوض بھی توڑ دیا گیا اور اسے اٹھا کر لے گئے۔ غزوں کو سلطان معز الدین غوری نے زمینداور اور گرم سیر میں مطیع کیا۔ یہ قبائل بتدریج جنوب کی طرف آئے جہاں ان کے باقیات براہوئی اور ان کے ہم نسل قبیلہ میں موجود ہیں جنہیں بلوچستان میں نووارد سمجھا جاتا ہے۔

۶۴-۱۱۶۳ء:-

ملک تاج الدّین ۵۵۹ھ میں فوت ہُوا اور اُس کا بڑا بیٹا ملک شمس الدّین الملقّب بہ "جلّاد" مسند نشین ہُوا۔ اُس نے سرائے سیاستی یعنی شاہی محل بنوایا اور وہ ملک السائیس بھی پکارا جاتا تھا۔ وہ اپنی ریاست کو غزّوں کے حملوں کے باوجود قائم رکھ سکا جو اب تک خراسان اور غزنی پر قبضہ کر چکے تھے اور ایک دفعہ تو اُس نے غور کے برادر حکمرانوں غیاث الدّین اور معز الدّین کو شرف مہمانی بھی بخشا جن میں سے موخر الذکر ہندوستان کا فاتح بننے والا تھا۔

ملک شمس الدّین نے اپنے بھائی عزّ الملک کو بصارت سے محروم کر دیا تھا اور اپنے دیگر ۱۸ برادران اور سیستان کے سرکردہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اُس کی خود پسندی اور خون آشامی کی وجہ سے اُس کے خلاف سازش ہوئی اور اُس کے اپنے افسروں نے ہی اُس کا کام تمام کر دیا۔

ملک تاج الدّین حرب کو ملکِ سیستان بنا دیا گیا۔ وہ اندھے عزّ الملک کا بیٹا تھا جو ابھی تک زندہ تھا لیکن بے بصر ہونے کی وجہ سے وہ اپنے بھائی کے قتل کے بعد بھی تخت نشینی کا حقدار نہ ہو سکتا تھا۔ مسوّدہ احیاءُ الملوک کے مُطابق ملک تاج الدّین نے اپنے والد کی وفات کے بعد ہی مکمّل شاہی اختیارات واعزازات سنبھالے۔ طبقات ناصری کے مصنّف کے مُطابق ملک تاج الدّین حَرَب "سلاطین غور خراسان سے منسلک ہو گیا اور اُن کا باجگزار بن گیا"۔ اسی مصنّف کے بموجب سُلطان غیاث الدّین غوری نے ۵۷۱ھ (= ۷۶-۱۱۷۵ء) میں ہرات پر قبضہ کر لیا جو غالباً دیر پا ثابت نہ ہُوا اور جلد ہی خالی کرنا پڑا۔ خراسان کے مغربی اضلاع پر غوریوں کے متوقع قبضہ کے پیشِ نظر ملک تاج الدّین نے ان سے تعلّقات بڑھالئے کیونکہ وہ ہمسایہ طاقت بھی تھے اور مضبُوط بھی۔ مزید برآں سیستان و غور کے یہ باہمی تعلّقات اُس کے پیشرو کے دَور میں بھی موجُود تھے۔

۷۶-۱۱۷۵ء:- لہٰذا ملک تاج الدّین حرب کی تخت نشینی غالباً ۵۷۱ھ سے پہلے

ہُوئی۔ اِس تاریخ سے ملک السّائیس کا دَورِ حکُومت ۱۲ سال بنتا ہے جو ایسے خونخوار کے لئے غالباً بہت طویل ہے جس نے اپنے خاندان اور رعایا پر بیحد مظالم ڈھائے تھے۔ ملک اور اس کے جانشینوں کا لقب "حرب" غالباً اس لئے استعمال کیا گیا کہ وہ ایک زبردست جنگ آزما تھا اور بائی زنبلی سلطنت کے خطاب، مونو ماچُس[1] کا مترادف تھا۔ اسی نے اپنے جدّ امجد کا شروع کیا ہُوا مینار مکمل کیا جس کا حال پہلے آچکا ہے۔ کیونکہ میل قاسم آباد کے بالائی کتبہ پر "تاج الدّین ابوالفتح حرب بن محمدؒ" کا نام موجود ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا دَور طویل اور خوشحال تھا لیکن یہ بیان کہ یہ ۶۰ سال تک جاری رہا جو طبقات ناصری میں مذکور ہے (صفحہ ۱۹۳۔ میجر راورٹی کا ترجمہ) صریحاً غلط ہے۔ لیکن پچاس سال قرین قیاس ہو گا اور اُس کے ظالم چچا ملک السّائیس کا دَور صرف ۴ سال ہو گا۔

جب ملک تاج الدّین ابُوالفتح حرب کی بینائی جاتی رہی تو اُس نے اپنے بڑے بیٹے ناصر الدّین عثمان کو اپنا وکیل مقرر کر دیا۔ موخر الذکر کی شادی ملک خراسان، عمُر مراغانی کی بیٹی سے ہُوئی۔ روضتہ الجنّت کا مصنّف اسے عزالدّین عمر مراغانی پکارتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ سُلطان غیاث الدّین غوری کا مدارالمہام تھا۔ ملک ناصر الدّین عثمان کی اس شادی سے ملوک سیستان ملوک آل کُرت سے مربوط ہو گئے جنہوں نے بعد میں تاریخ خراسان پر اتنا اثر ڈالا اور یہ خاندان ملک تاج الدّین عثمان برادر عزّالدین مراغانی سے شروع ہُوا۔

۱ - ۱۲۰۰ء

ملک تاج الدّین عثمان سیستانی نے ۵۹۷ھ میں نیشاپور پر قبضے کے دوران نام بُردہ سُلطانِ غور کے جھنڈے تلے خدمات انجام دیں۔ طبقات ناصری کا مصنّف لکھتا ہے کہ اُس نے دریائے ہرمند کے کناروں پر شہر سیستان کے باہر ایک وسیع اور خوبصورت محل بنوایا۔ وہ اپنے والد

---

[1] مُونو ماچُس، یعنی تن تنہا جنگ آزما کانسٹنٹائن دہم (۵۶-۱۰۴۲ء) شہنشاہ ارضِ روم کا لقب تھا جو ملک سیستان الملقب بہ حرب سے قریباً سوا صدی پیشتر رہا۔

کی زندگی کے دوران ہی راہیئے ملک عدم ہوا۔

۱۶ - ۱۲۱۵ء:-

موخر الذکر کا جانشین ناصر الدین عثمان کا بڑا بیٹا ۶۱۲ھ میں برسرِ اقتدار آیا۔ احیاءُ الملوک میں اسے شمس الدین اور طبقات ناصری میں ملک الغازی یمین الدولہ والدین بہرام شاہ پکارا گیا ہے۔ وہ ایک مضبوط اور منصف بادشاہ تھا اور کوہستان کے ملاحدہ[۱] سے اُلجھ گیا اور چار فدائین نے

---

[۱] ملاحدہ حسن بن سباح کے پیرو تھے اور یورپی انہیں حشیشین پکارتے تھے حسن سباح عمر خیام (خیمہ ساز) کا نیشاپور میں ہم جماعت تھا۔ حسن کے پیرو جو المُوط کے علاوہ مغرب میں بہت سے مضبوط قلعوں کے مالک تھے اور اہل یورپ صلیبی جنگوں کے دوران اُن سے آشنا ہوئے تھے۔ اپنے کوہستان کے ساتھیوں کی نسبت زیادہ مشہور ہو گئے۔ کوہستان مشہد کے جنوب کا علاقہ تھا جسے اب کائنات کہتے ہیں۔ یہاں ان کے بہت قلعے تھے اور جب چنگیز خانی لشکر خراسان پر ٹوٹ پڑے تو انہوں نے بے شمار پناہ گزینوں مشمولہ بہ علماء وغیرہ کو پناہ دی جو ان کافر منگولوں سے بچنے کے لئے بھاگے تھے۔

کوہستانی ملاحدہ کا امیر محتشم (= قائد اجتماع حشم اس لفظ کا مادہ ہے) کہلاتا تھا اور اُسے الموط سے مقرر کیا جاتا تھا۔ حسن سباح کی جنم بھومی میں اب بھی ایک تباہ شدہ قلعہ ہے جسے میر اسماعیلی کہتے ہیں۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ ان علاقوں میں پیدا ہوا۔

منگول حملہ کے وقت ملاحدہ قصبہ کائن کے علاوہ سرتاخوت، تخت، سوار، شبیر اور فرمان دہ قلعوں کے مالک تھے۔ اُن کا امیر یا محتشم شہاب منصور ابو الفتح تھا۔

۶۲۲ھ میں (۱۲۲۵ء) مومن آباد، قارہ، طوُن اور طبس بھی ان کے قبضے میں تھے۔ روضتہ الجنّت کا مصنّف ۴۲۵ سال پہلے بتاتا ہے کہ اس کے زمانے میں بعض اضلاع کے لوگ حسن سباح کے افکار و عقائد کے قائل تھے۔

ہلاکو خان نے الموط پر قبضہ کیا اور اس فرقے کی مغربی شاخ کی کمر توڑ دی تو ایک عظیم اسماعیلی داعی، محتشم ناصر الدین کو بلایا جس کا صدر مقام قصبہ طوُن میں تھا۔ اس کے پاس ہی قلعہ سرتخت تھا۔ ناصر الدین اسماعیلی ۷ اجمادی الاوّل ۶۱۴ھ (۲۶، جولائی ۱۲۱۷ء) کو ہلاکو کے سامنے حاضر ہوا۔

۴۲۵ سال پہلے روضتہ الجنّت کے مصنّف نے لکھا کہ کوہستان کے ۹ ضلعے تھے یعنی طوُن طبس مسینا، دشت بیاض (سفید میدان ؟) مہرجان، مومن آباد، شاخِم، فنثرود، حِن آباد، زرکوہ اور نشبیش۔ طوُن اور مہرجان میں زیادہ تر اسماعیلی آباد تھے۔

۲۱، ربیع الاوّل ۸۹۸ھ (۶، دسمبر ۱۴۹۲ء) کو شام کے وقت اس علاقے میں ایک سخت زلزلہ آیا۔ نوزاد اور مسک کے دیہات اور مومن آباد میں بہت نقصان ہوا۔ بہت سے مکانات گر گئے اور بے شمار انسان لقمۂ اجل ہو گئے

اُسے بازار سے مسجد کو جاتے ہُوئے قتل کر دیا جہاں وہ نماز جُمعہ ادا کرنے جا رہا تھا۔

۱۷۔ ۱۲۱۶ء:۔

اسی مُلک کے دَور میں طبقات ناصری کا مصنّف ۶۱۳ھ میں سیستان آیا۔ اُس کا بیانِ شہر بہت مُبہم ہے اور ایسا معلُوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ زیادہ نہ دیکھ سکا۔ وہ اُمورِ سلطنت و رموز سلاطین پر مرکوز ہونے کی وجہ سے جغرافیائی حالات پر توجّہ نہ دے سکا۔ وہ شاہی مُلاقاتوں اور مُلاقاتیوں کے جھگھٹوں میں اِس بُری طرح اُلجھا رہا کہ ان کو الف کو کوئی وقت نہ دے سکا۔ اُس نے شہر کہنہ کے جن کھنڈرات کا ذکر کیا ہے اور جہاں باغی ملک السّابیس کیخلاف سَازشیں کرتے تھے یقیناً "رام شاہرستان" کا قدیم مقام تھا جسے مصنّف ہَشتُو کہتا ہے۔ شاہرستان کی ڈھیری زاہدان کے تباہ شدہ قصبہ کے جنوبی سرے کی عین سیدھ میں صرف چار میل دُور ہے جو معمولی فاصلہ ہے اور ایسی جگہ ہے جہاں سازشی بن دیکھے پہنچ سکتے تھے۔ یہ قدیم ڈھیریاں آج بھی بے فکروں کے ٹھکانے ہیں اور بچّوں کے کھیل کے میدان ہیں اور یہ عین قرین قیاس ہے کہ شاہرستان کی ڈھیریاں لیبٹ کے بیٹوں اور آن کے رُفقاء کا مرکز بن گئی تھیں جہاں اوّل الذکر کے حق میں ساز باز کی جاتی تھی۔ یہ بڑی ڈھیری زاہدان سے صاف نظر آتی ہے اور آج کل تو درمیانی مقامات کے نام بھی ذرا فاصلے پر کسی نمایاں نشان کے نام پر ہی رکھ دیئے جاتے ہیں۔

شاہرستان کی ڈھیری زاہدان کے عین جنوب میں ہے۔ چونکہ شہر بادِ صد و لبست روز، کی سمت میں بنایا گیا تھا یا شمال کے ۳۰ درجے مغرب کی طرف تعمیر ہوا تھا اور رہائشی مکانات میلوں تک اس سمت میں پھیل گئے تھے لہٰذا شمال و جنوب اور شرق و غرب کی اصطلاحات اس شہر پر عین منطبق نہیں ہوتیں جیسا کہ یہ کسی ایسی جگہ پر ہوں گی جو کسی معیّنہ رُخ پر ہو۔

قصبے کی دیواروں کے مشرقی زاویے پر پون چکیوں اور دیگر عمارتوں کے کھنڈرات ہیں جن کا فصیل

یہاں کے باشندے اسمٰعیلی سمجھے جاتے تھے۔ بُمسک اور نوزاد کے درمیان زمین شق ہوئی اور کئی میل تک ایک تنگ و طویل گھاٹی اُبھر آئی جس کے آثار اب بھی موجود ہیں۔

شہر کے باہر اپنا ہی ایک جھرمٹ تھا۔ شہر کے جنوبی یا جنوب مشرقی دروازے کو دارِ طعام کہنا بہتر ہوگا کیونکہ پیسا جانیوالا غلّہ اسی دروازے سے پون چکیّوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہ پون چکیاں کافی جسامت کی تھیں اور غالباً حکومت کے زیرِ انتظام تھیں۔

سرائے سیاستی کے شمال مغرب کی طرف، جو غالباً بیرونِ فصیل محل تھا جس کا بیان مذکورہ پیراگراف میں ہوا، ایک حوض کے کھنڈرات موجود ہیں جن کے اُوپر ایک گنبد ہے اور اس کے پاس ہی ایک مسجد اور دیگر ملحقہ عمارات کے آثار ہیں۔ لیکن یہاں منہاج سراج ٹھہرا وہ غالباً ان کھنڈرات کا ڈھیر تھا جو پون چکیوں اور شہر کے جنوب مشرق کیطرف تھا۔ یہ اب ملبہ بن چکے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ بھی مجمع تعمیرات کے آثار ہیں جس کا ذکر غالباً طبقات ناصری کے مصنّف نے کیا ہے۔

موخر الذکر نے لبست سے سیستان کا سفر خاش سے گذرنے والے سیدھے راستے سے کیا ہوگا گویا وہ ڈیلٹا میں بمقام چکانسُر داخل ہوا ہوگا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ گنبدِ بلوچ کہاں واقع تھا لیکن یہ شہر سے زیادہ دُور نہ ہوسکتا تھا کیونکہ یہیں اُسے ایک وفد ملا جو اُسے منزل تک لے گیا۔ ملک کے کھنڈرات گنبدِ بلوچ کے آثار ہو سکتے ہیں۔

طبقات ناصری میں مذکورہ شہنشاہی قلعہ، جو کوہستانی ملاحدہ اور ملک بہرام شاہ کے درمیان وجہِ نزاع بنا اور موخر الذکر کے قتل پر منتج ہوا، نیمروز یعنی سیستان کے علاقہ میں نیہہ کی حدود میں واقع بیان کیا جاتا ہے۔ یہ سب درست ہے لیکن یہ قلعہ اب شاہ دُز کہلاتا ہے۔ جس کے کھنڈرات قصبہ نیہہ کے قریب ہی ایک الگ تھلگ پہاڑی کی چوٹی پر ہیں۔ اس کا موجودہ مروّجہ نام غالباً شاہ دِیزہ سے بگڑا ہے کیونکہ قدیم فارسی میں لفظ دُز یا دِز قلعہ کا معنی دیتا تھا لہٰذا اس نام کا مطلب ہے شاہِ سیستان کا قلعہ جو منہاج سراج میں مذکور قلعہ شہنشاہی کا مترادف ہے۔ کھنڈرات میں حوض بھی شامل ہیں جنمیں بارش کا پانی جمع ہوتا تھا۔ مکانوں اور قلعہ بندیوں کے نشانات بھی صاف نظر آتے ہیں۔ ایک ڈھلوان پگڈنڈی چوٹی تک پہنچتی ہے۔

نیہہ بیشک قدیم فارسی لفظ ہے بمعنی قصبہ۔ جیسے نیشاپور، یہ ضلع کا واحد شہر تھا اور ہے، جو ہاموں کے مغرب اور کاتنات کے جنوب میں واقع ہے۔

ملک بہرام شاہ ۶۱۲ سے ۶۱۸ھ (= ۱۲۱۵ تا ۱۲۲۱ء) یعنی سات سال تک حکومت کرتا رہا۔ ملک بہرام شاہ کا منجھلا بیٹا، ملک نصرت الدین اپنے والد کا جانشین ہوا لیکن وہ اپنے بڑے بھائی، ملک رکن الدین کے ساتھ خانہ جنگی میں الجھ گیا جسے والد نے سنگین بدعنوانیوں پر قید میں ڈال دیا تھا۔ مؤخر الذکر کو سیستان کے ملاحدہ کی حمایت حاصل تھی جبکہ راسخ العقیدہ فرقہ اس کے بھائی کا حامی تھا۔ اس کشمکش میں تقدیر کبھی ایک اور کبھی دوسرے کی یاوری کرتی رہی۔ حتیٰ کہ دونوں کو ایک منگول لشکر نے ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ یوں ۶۱۸ھ (۲۲-۱۲۲۱ء) کا سال ختم ہوا۔

۲۳ - ۱۲۲۲ء:-

ملک شہاب الدین محمود ابن ملک ناصر الدین مرحوم گوشہ روپوشی سے باہر نکلا اور منگولوں کی واپسی کے بعد ۶۱۹ھ میں ملک سیستان بنا۔ سیستانی ملاحدہ نے اس کی مخالفت کی اور ناصر الدین عثمان ابن تاج الدین حرب کے پوتے، عثمان کو مقابلے پر لا کھڑا کیا۔

مؤخر الذکر نے کرمان سے مدد مانگی جو اس وقت براق حاجب قراخطائی کے ماتحت تھا۔ اس نے محمود خوارزم شاہ کے ایک عمزاد بھائی، تاج الدین نیالستگین کو روانہ کیا جو اس کا باجگزار تھا تاکہ اس چھوٹے مدعی کی مدد کی جا سکے۔ نیالستگین مؤخر الذکر سے ۶۲۲ھ میں نیہہ میں آملا۔ ملک شہاب الدین کے مارے جانے کے بعد اسے سیستان بلایا گیا۔ نیالستگین نے ناصر الدین ابن تاج الدین حرب کے پوتے کو ایک طرف کر دیا اور سیستان کی حکومت پر خود قبضہ کر لیا۔

ملک تاج الدین نیالستگین کو کوہستانی ملاحدہ اور سیستانی خوارج کے خلاف بھی برسرِ پیکار ہونا پڑا، لیکن وہ فتحیاب ہوا اور تون تاک اور اسفرار کے قلعوں پر بھی قابض ہو گیا۔ ۶۲۵ھ (۲۸-۱۲۲۷ء) میں ایک منگول لشکر نے سیستان پر حملہ کیا اور اسے قلعہ ارگ میں محصور کر دیا۔ ۱۹ ماہ یا شاید دو سال

کے مُقابلے کے بعد وہ ۶۲۷ھ (۳۰ - ۱۲۲۹ء) میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ بعد میں اُسے سفید کوہ کے پاس تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

قلعہ ارگ ڈیلٹا میں نہیں تھا بلکہ شاہرستان کے شمال مشرق میں تھا۔ شاہرستان وہ علاقہ ہے جہاں دائمی دیہات آباد ہوں اور یہ اصطلاح اب بھی مستعمل ہے۔

اس وقت قلعۂ کاہ اور فرح بھی سیستان میں شامل تھے اور گو یہ اغلب ہے کہ لاش قلعہ ارگ تھا جس کی طرف اشارہ کیا گیا تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ اوّل الذکر یا فرح کا کوئی اور قلعہ ہی وہ قلعہ تھا جس کا تاج الدین نیالتگین نے اتنے طویل عرصے تک دفاع کیا۔ قلعۂ ارگ پر قبضہ کرنے کے لئے منگولوں کو بھی شدید نقصانات اٹھانے پڑے کیونکہ یہ مذکور ہے کہ ان کا سالارِ لشکر مارا گیا یا محاصرے کے دوران فوت ہو گیا اور بہادر طائر اس کا جانشین ہُوا جو بعد میں تاریخِ خراسان میں بہت اہم بن گیا۔ قلعہ ارگ (جسے قلعہ اُک بھی کہتے ہیں) کے محاصرہ کے بیانات بھی متضاد ہیں۔ مؤخر الذکر ضلع ہوتات یا اوقات کا نام ہے۔ بعض بیانات کے مُطابق یہ محاصرہ دو سال جاری رہا جس کا مطلب یہ ہے کہ قلعہ بیحد مضبُوط تھا۔ چنگیز خانی منگولوں نے جتنے شہروں اور قلعوں پر حملے کئے ان میں سے کوئی بھی اتنی طویل مزاحمت نہ کر سکا اور باقی ماندہ قلعہ بند فوج نے اُسی وقت مجبوراً ہتھیار ڈالے جب اُن کا جری سالار خارش میں مُبتلا اور بُری طرح مجروح ہو کر پکڑا جا چکا تھا۔

خوارزم شاہی خاندان کی طویل و عریض سلطنت ہمسایہ سلطنت کی شکست و ریخت پر پلی تھی۔ اس میں صُوبہ بہ صُوبہ اضافہ ہوتا گیا تھا اور ۶۰۲ھ (۶ - ۱۲۰۵ء) میں فاتح ہندوستان سُلطان شہاب الدّین غوری کی وفات نے سُلطان محمدؒ خوارزم کو جیحوں پار کے ملکوں پر توجّہ مرکوز کرنے کا موقعہ دے دیا۔ اس سمت میں اُس کے توسیعی عزائم نے اُسے چنگیز خان کی اُبھرتی ہُوئی طاقت سے متصادم کر دیا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سُلطان محمدؒ کے خاندان اور خلفائے عبّاسیہ کے درمیان جانی دشمنی کی وجہ سے خلیفہ ناصر نے چنگیز خان کے پاس ایک ایلچی محض اس مقصد سے بھیجا کہ اُسے سُلطان محمدؒ پر حملہ کے لئے اُکسایا جا سکے جو اُس وقت عراق پر مہم کشی کا سوچ رہا تھا۔ سیستان خوارزم شاہ کی ایک

باجگزار ریاست تھی۔ ملک بہرام شاہ کی زندگی میں ہی سُلطان محمد خوارزم نے اُسے فرمان بھیجا کہ وہ سیستانی فوج کو منظم کرے اور اپنے حاکمِ بالا کی مدد کے لئے بھیج دے۔ یہ فوج ملک سیستان کے بڑے بیٹے' ملک رُکن الدّین کی کمان میں روانہ ہوئی لیکن جب یہ فوج خوشنگ پہنچی تو ملک زادہ نے غوری کے دوران خوارزمی سفیر کو قتل کر دیا۔ اس پر خوفزدہ ملک رکن الدّین سیستان واپس آگیا جہاں اُس کے والد نے اُسے قید کر دیا اور سُلطان کی مدد کے لئے ایک اور فوج روانہ کی۔ اسے وہاں پہنچنے پر اسے ترمذ کے سرحدی قلعہ میں متعین کر دیا گیا اور جب چنگیز خان اس جگہ پر قابض ہوا تو اُس نے ساری قلعہ بند فوج تہِ تیغ کر دی اور یوں سیستانی فوج بھی ختم ہو گئی۔

۲۲-۱۲۲۱ء :-

۶۱۷ھ کے اواخر یا ۶۱۸ھ کے اوائل میں چنگیز خان نے جیحوں پار کیا اور خراسان کو دبوچ لیا۔ تھوڑے سے عرصہ میں منگول لشکر ایران میں گھس گئے اور خراسان کے قلعوں پر قابض ہو گئے۔

"تین ماہ میں جہان کُش تولوئی نے
ان سب پر ابوابِ سیستان تک قبضہ جما لیا
اور مسمار کرتا گیا ، قتل کرتا گیا ، صفایا کرتا گیا اور قبضہ کرتا گیا
اور ایک متنفس بھی زندہ نہ رہا ، نہ صغیر نہ کبیر!"

اسی موقعہ پر منگول پہلی دفعہ سیستان میں داخل ہوئے اور دونوں مخالف دعویداروں، ملک نصرت الدّین اور اُس کے بھائی رُکن الدّین کو ٹھکانے لگا دیا لیکن ان خونخواروں کے ابتدائی حملے قتلِ عام اور شہروں کی تباہی سے مُبرّا تھے جو بعد میں معمول بن گئے۔ بہت خونریز جنگیں ہوئیں لیکن اگر کوئی شہر ہتھیار ڈال دیتا تھا تو عموماً اس سے اچّھا سلوک کیا جاتا تھا۔ ہرات کے سلسلہ میں بالخصوص یہی ہوا۔ تاریخ آصفی (یا سیفی) ہروی کیمطابق، جس کا اقتباس روضۃ الجنّت کے مصنّف نے دیا ہے، دشمن پہلے باب فیروز آباد کے مقابل نمودار ہوا' اور ۷ دن تک شہر کے

ارد گرد خوب لڑائی ہوتی رہی۔ اس کے بعد تولوئی خان اور اس کے افسر بڑی خندق کے سرے پر آئے اور شہر سے جان بخشی کے عوض ہتھیار ڈالنے کے لئے کہا اور یہ بھی اعلان کیا کہ اتنا ہی خراج لیا جائیگا جتنا اہل شہر سلطان جلال الدّین خوارزم کو ادا کرتے تھے۔ یہ اعلان حلفیہ کئے گئے چنانچہ شہر کے دروازے کھول دیئے گئے اور باقاعدہ ہتھیار ڈال دیئے گئے۔ جلال الدّین کے بارہ ہزار پیرو کاروں کے سوا کسی دُوسرے شخص کو ایذا نہ دی گئی۔ ملک ابوبکر مرجکی کو والئ شہر مقرر کر دیا گیا۔ اور تولوئی خان کا ایک منگول افسر، منگونیٔ چنگیز خانی مفادات کے لئے تعیّنات کر دیا گیا۔ حکومت اتنی نرم تھی کہ اس نے لوگوں کی ان جنگی تیاریوں کی کوئی پرواہ نہ کی جو وہ مزید مطالبات کیخلاف کر رہے تھے بالخصوص اگر وہ مزید فتوحات کے لئے تاجیکوں کی جبری بھرتی کے سلسلہ میں ہوتے!

نیشاپور نے بھی شرائط پر اطاعت اختیار کر لی اور فاتحین نے شرائط پر عمل کیا حتیٰ کہ جنگ پَروان میں جلال الدّین کی منگولوں پہ عارضی فتح نے خراسان کے اکثر حصّوں میں منگولوں کے خلاف ایک عام بغاوت برپا کر دی۔ ہرات کی آبادی نے بھی تحریک میں حصّہ لیا اور ملک ابوبکر اور منگونیٔ دونوں کو قتل کر دیا۔ تاریخ ہرات کا مصنّف بتاتا ہے کہ لوگوں نے قتلیوں (جو بعد ازاں نَرتُو مشہور ہُوا بادغیس میں) کی قلعہ بند فوج سے ساز باز کر لی اور ایک دستہ وہاں سے سوداگروں کا بھیس بدل کر مختلف دروازوں سے ہرات میں داخل ہُوا اور اہل ہرات کو برانگیختہ کر کے ملک کو چہار سُو میں قتل کر دیا اور منگونیٔ کو قلعہ کے باہر مار دیا۔ ملک مبارز الدّین کو تحریک کا قائد چُنا گیا جو فیروز کوہ سے ہرات آیا تھا۔ خواجہ فخر الدّین عبدالرحمٰن غیرانی اس کے نظم و نسق کا سربراہ بنا۔

دسمبر ۱۲۲۱ء:۔

ایلجک دائی نُوئین کو ہرات کے خلاف کارروائی کے لئے بھیجا گیا اور وہ ماہ شوال ۶۱۸ھ میں ہرات کے سامنے نمودار ہُوا۔ وہ غزنی سے باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہُوا تھا۔

ہرات رود پر خیمہ زن ہُوا۔

جولائی ۱۲۲۲ء

مُدافعت بہت سخت تھی اور ۶ ماہ ۱۸ دن کے بعد بھی منگول کوئی واضح کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ ۶۱۹ھ کے ساتویں مہینے میں الجک دائی نے مورچوں پر ایک عام حملہ بول دیا۔ ۵،۰۰۰ منگول مارے گئے لیکن اُس نے مینار خرکاک کو اپنا نشانہ بنایا اور بالآخر سُرنگ کاروں کی وجہ سے وہ دیواروں کے پاس کنارے پر قدم جمانے میں کامیاب ہوگیا۔ دیواریں کئی جگہ شگاف ڈالے گئے جس سے ۵۰ گز اُونچا پردہ یک لخت گر گیا اور ۴۰۰ آزمودہ کار منگول سُورما ملبے کے نیچے دب گئے۔

اہلِ شہر کا ناطقہ بند ہوگیا اور وہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ ہتھیار ڈالنے کے حق میں تھا لیکن دُوسرا تادمِ مرگ مزاحمت پر تُلا ہوا تھا۔

لیکن فیصلہ الجک دائی کے ہاتھ میں تھا اور اسی سال ماہ جمادی الثانی کے ایک جُمعہ کو اُس نے مینارِ خاک کی سمت میں شہر پر حملہ بولا اور مینار پر قبضہ کر کے ہرات میں داخل ہوگیا۔ قتلِ عام شروع ہُوا اور کہا جاتا ہے کہ سولہ لاکھ (۱۶۰۰،۰۰۰) نفوس مارے گئے۔ وہ آٹھ دن ہرات ٹھہرا اور شہر کو مسمار کر کے قلعہ زتو کو مسخر کرنے کے لئے روانہ ہُوا لیکن آوبہ سے اُس نے ۲،۰۰۰ سوار واپس بھیج دیئے تاکہ وہ چھُپے ہوئے لوگوں کو مار ڈالیں۔ دو ہزار آدمی نرغے میں تھے اور ان میں سے صرف ۱۶ بچ سکے جو پہاڑی چوٹیوں اور ڈھلوان دراڑوں میں چھُپے ہُوئے تھے۔ اُن میں کچھ اور بھی آملے تو ان کی تعداد ۴۰ ہوگئی اور یہ سب سُلطان غیاث الدّین غوری کی تعمیر کردہ جامع مسجد میں پناہ گزیں ہُوئے جس کے پاس ہی سُلطان مرحُوم مدفون تھا۔[1]

---

[1] روضتہ الجنّت کا مصنّف بتاتا ہے کہ اُس کے دَور میں مسجد کے بابِ عالی کی محراب پر ایک کُوفی کتبہ بدیں معنی موجود تھا کہ اس بادشاہ نے یہ مسجد ۵۹۷ھ (۱۲۰۰ء) میں بنوائی تھی۔

جلال الدین خوارزم شاہ کی فوج کے دس ہزار کان قُلی تین رہنماؤں، قراچہ، طُغان اور سیقر کے تحت نیشاپور اور طوس کی پہاڑیوں میں جمع ہو گئے تھے اور ان علاقوں کے راستوں میں لوٹ مار کرتے تھے۔ اُنہوں نے کچھ چنگیز خانی سفرا کو بھی مار دیا۔

منگول سردار جرماعون نے خوارزم سے ان کے خلاف ایک فوج بھیجی جس نے تین معرکوں میں اُن کو شکست دی لیکن کان قُلی پھر مجتمع ہو گئے اور سبزوار کی سرحد پر دوبارہ لڑائی ہوئی۔ کان قُلی فرار ہو گئے لیکن ....۲ منگول بھی مارے گئے۔ قراچہ سیستان بھاگ آیا اور طغان کوہستان چلا گیا۔ سیقر کا پھر کوئی ذکر نہیں ملتا۔ تین ہزار کان قُلی ہرات آ گئے اور چار ہزار منگول اُن کے تعاقب میں بھیجے گئے۔ مفروروں نے جامع مسجد میں مورچے بنا لئے جہاں حملہ آوروں کو کافی نقصان پہنچانے کے بعد وہ تین دن میں ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔

۱۵ سال تک ہرات منہدم رہا اور پناہ گزین اذاب اور شافلان میں ٹھہرے اور پھر پہاڑیوں میں دبکے رہے۔ قلیون یا ازنوپر بھی منگولوں نے قبضہ کر لیا اور اسے مکمّل طور پر تباہ کر دیا۔ نیشاپور اور شادیاک کا بھی یہی حشر ہُوا۔

۲۸-۱۲۲۷ ء :-

سیستان پر ۶۲۵ ھ میں دُوسرا حملہ شاید اس لئے کیا گیا کہ کان قُلی رہنما قراچہ اس طرف آ گیا تھا لیکن اغلب یہ ہے کہ جلال الدین خوارزم شاہ ہندوستان سے واپس آ گیا تھا اور اُس نے فارس میں ایک لشکر کھڑا کر لیا تھا۔ مزید براں اُس کا قرابتدار نیالتگین سیستان اور فرح میں آزاد حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا اور وہ تولک اور اسفرار پر منفارہ ہوس تیز کئے ہُوئے تھا۔ وہ خوارزم کے شاہی خاندان کا فرد تھا لہٰذا چنگیز خان اس سے بدکتا تھا۔ ان حالات نے دوسرے حملہ کو ضروری بنا دیا۔ چنانچہ ۲۰-۶۱۹ھ (۲۳-۱۲۲۲ء) کی سردی میں ایک منگول لشکر نیجگور کی حدود میں آ گیا۔ اس ضلع کا نام "جامع التواریخ" میں غلط دیا گیا ہے لیکن نام کا آخری حصّہ گور واضح

ہے اور آج تک روایات بتاتی ہیں کہ ایک منگول لشکر نے موسم سرما میں دزک کے گردوپیش میں پڑاؤ ڈالا تھا جو ضلع پنجگور کی سرحد پر مشہور و معروف قطعۂ زمین ہے اور پنجگور بذاتِ خود مکران کے اُس حصہ میں واقع ہے جو ریاست قلات کے ماتحت ہے۔

جبتک شہزادہ جلال الدین خوارزم زندہ رہا اور یکے بعد دیگرے لشکر اکٹھے کر کے منگولوں سے اٹل دشمنی کے مظاہرے کرتا رہا، اُس کے رشتہ دار نیالستگین کے عزائم بھی منگول خاقان کے لئے دردِ سر بنے رہے اور یوں اوّل الذکر کے خلاف دوسری مہم بھیجی گئی جس میں جلال الدین زخمی ہوگیا۔ پکڑا گیا اور مارا گیا۔

باب سوم

منگول حملے سے پہلے متعدد خاندان جو خراسان میں برسرِ اقتدار آئے اور ایک طرف موجودہ ایران کے صوبوں اور دوسری طرف ہندوستان پر مسلط ہو گئے، اُن افراد کے بنا کردہ تھے جو نا جیک یا فارسی دان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ملوک طاہریہ خراسان سے اُبھرے اور خلفائے عباسیہ کے روشن ترین دَور میں اتنے مشہور ہوئے، اپنے آپ کو منوچہر سے منسوب کرتے تھے جو شاہانِ ایران کی قدیم ترین نسل میں سے تھا اور سیستان کے کیانی بھی اسی نسل کے سَر برآوردہ ہونے کا دعوٰے کرتے تھے۔ آخری طاہری ملک کو یعقوب ابن لیث نے پہلے سیستان کی حکومت سے محروم کیا اور بعد ازاں خراسان سے بھی نکال لمبا کیا۔

آل سامان جو جیحوں پار کے علاقوں میں برسرِ اقتدار آئے اپنے آپکو بہرام چوبین کی اولاد کہتے تھے جس نے ہرمز بن نوشیرواں کے عہدِ حکومت میں بلخ کی دیواروں کے سائے میں خاقان ترکستان کے بیٹے اور اُس کے لشکرِ جرّار کو شکستِ فاش دیدی تھی۔ ہرمز نے اُس کی توہین کی، تو اُس نے بغاوت کر دی اور اُسے تخت سے اُتار کر ایک اور کو تخت نشین کر دیا۔

آل بویہ کا مورث دیلم کا ایک ماہی گیر تھا اور وہ غالباً اسی ضلعے کے کسی مقامی خاندان کا فرد تھا۔ اُن کا آخری حکمران سلاجقہ کا باجگزار تھا اور ۴۸۷ھ میں فوت ہُوا۔

کہا جاتا ہے کہ یمینی خاندان (جس کا دارالحکومت غزنی تھا) کا مورث بھی آخری شاہِ ایران یزدگرد کی اولاد میں سے تھا۔ اسی خاندان سے مشہور محمود غزنوی برآمد ہُوا۔

غوری سلاطین جن سے فاتح ہندوستان شہاب الدّین برآمد ہوا، غور کے تاجیکوں یعنی ضحاک تازی کی اولاد سے تعلق رکھتے تھے۔

خوارزم شاہی خاندان (جس کا تختہ چنگیز نے اُلٹا) قبچاق اور قنقلی تُرک قبائل سے برآمد ہُوا تھا لیکن اُس نے کسی قدیم نسل کے مملوکات و مقبوضات پر ہی قبضہ جما لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خوارزم مشہور ساسانی بادشاہ بہرام گور کا رشتہ دار تھا اور خوارزم شاہ کا لقب اس قدیم نسل کے حکمرانوں کا تھا جو غالباً تاجیک تھے۔

منگول حملوں کی ابتدائی شدومد کم ہونے کے بعد سارا خراسان غور کے ایک تاجیک خاندان کے تحت آگیا جو اپنے آپکو سلاطین غور کے دودمان کے نمائندے کہتے تھے جنہیں سے ہندوستان کا فاتح شہاب الدّین برامد ہُوا۔

یہ خاندان آل کُرت کہلاتا ہے۔ ایک تاجیک خاندان اسفرار اور دُوسرا فرح پر حکومت کرتا تھا۔ یہ دونو مقامی خاندان آل کُرت کے ماتحت سمجھے جاتے تھے لیکن اکثر اس سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔

روضتہ الجنّت کے مصنّف کے مطابق ملوک فرح سیستانی کیانیوں سے متعلق تھے اور ایک قدیم اور مُمتاز نسل تھے۔ آل کُرت کے ساتھ کاروباری تعلّقات کے دوران اکثر افراد کا نام نیاستگین آتا ہے جو بیّن طور پر ایک خاندانی نام تھا۔ قدیم زمانے میں فرح اور قلعہ کاہ سیستان کے حِصّے تھے اور جب تاج الدّین نیاستگین نے ملک سیستان کی سلطنت پر قبضہ کر لیا جس کی مدد کے لئے بُراق حاجب نے اُسے کرمان سے بھیجا تھا تو اُس نے فرح کو اپنا صدر مقام بنا لیا کیونکہ طبقاتِ ناصری کا مصنّف نیاستگین سے ۶۲۳ھ میں یہیں مِلا۔

حکومت سیستان غصب کرنے کے بعد تاج الدّین نیاستگین نے غالباً ملک عثمان کے خاندان کی کسی خاتون سے شادی کر لی اور یُوں اس خاندان سے مربوط ہو گیا۔ فرح کے آخری ملوک غالباً اسی نیاستگین کی اولاد تھے اور اسی لئے یہ نام اس خاندان میں مسلسل جاری رہا۔

چنگیز خان ۴ رماہ رمضان ۶۲۴ھ (= سولہ اگست ۱۲۲۷ء) کو فوت ہُوا۔ وہ ۵۴۹ھ میں پیدا ہوا تھا اور اُس سے ایک ہی سال پہلے غزوں نے سلطان سنجر سلجوقی کو شکست دیکر قیدی بنالیا تھا۔ ربیع الاوّل ۶۲۶ھ (فروری ۱۲۲۸ء) میں اکتائی بن چنگیز کو اسی کی وصیّت کے مُطابق اُس کا جانشین بنا دیا گیا۔ اُکتائی چنگیز خان کا دُوسرا بیٹا تھا اور سیرت میں وہ اپنے بڑے بھائی چغتائی کی ضد تھا۔ چغتائی اسلام اور اُس کے علمبرداروں کے سخت خلاف تھا۔ ۶۳۴ھ میں اکتائی نے ایک فرمان کے ذریعے اُن تمام شہروں کی از سرِ نو تعمیر کا حکم دیا جو اُس کے والد کے دَور میں تباہ کیے گئے تھے اور ہرات بھی اپنی آب وہوا کیوجہ سے تعمیرِ نو کیلئے چُنا گیا۔

۴۰-۱۲۳۹ء:-

امیر عزّالدّین نفیس پارچہ بافوں کا رہنما تھا اور ہرات کی تباہی کے بعد ۱۰۰۰ خاندانوں کے ساتھ بیش بالغ بھیج دیا گیا۔ اُسے بحالئ شہر کے لیے حکم دیا گیا کہ وہ ۱۰۰ خاندان لیکر ہرات میں دوبارہ آباد ہو جائے۔ ۶۳۷ھ میں ۲۰۰ مزید خاندان ہرات بھیج دیئے گئے۔ اسی سال ہرات کی نہریں اہلِ شہر میں تقسیم کر دی گئیں اور سیکُمر کی نہریں، جُوئے ملانی اور کچھ انجیلی نہریں صاف کر کے بحال کر دی گئیں۔

۴۱-۱۲۴۰ء:-

۶۳۸ھ میں ملک مجدالدّین قلیونی والئ ہرات بنا مُغل نگران قرلُوغ کے ساتھ مل کر اُس نے انجیلی نہروں کا نظام بحال کر دیا اور الینجان نہروں کو بھی دوبارہ چالو کر دیا۔

۶۴۰ھ (۴۳-۱۲۴۲ء) میں والئ کسی سازش کا شکار ہُوا اور مار دیا گیا۔ ۶۴۱ھ میں باتُو خان نے اُس کے بیٹے ملک شمس الدّین کو والئ ہرات مقرر کیا اور ۶۴۹ھ (۵۲-۱۲۵۱ء) میں اُس کے ایک خاص خدمتگار نے اُسے زہر دیدیا جسے اُس کے نائب شمس الدّین لاچین نے رشوت دی تھی۔ خدمتگار کو مروا دیا گیا۔

شمس الدّین لاچین ہرات سے بھاگ گیا اور علاقے کا نظم ونسق آلِ کُرت کے ہاتھ میں آگیا۔

۶۳۸ھ میں ملک مجد الدین قلیونی نے ہرات کی مردم شماری کرائی تو معلوم ہوا کہ یہ ۰۰۰ء۶ خاندانوں پر مشتمل تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ اس گورنر کے کردار کی وجہ سے جوق در جوق ہرات میں آرہے تھے۔ وہ یاد غیس کے رئیس اعظم کا بیٹا تھا جو ہرات کی تباہی کے بعد قلیون یا زنو پر ٹوٹنے والی قیامت میں اپنے اہل و عیال اور اہل شہر سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ مجد الدین کو بچپن میں اٹھا کر لے گئے تھے لیکن چنگیز خان کے ایک امیر ارسلان نامی نے اسے محفوظ رکھا۔

۴۶-۱۲۴۵ء:-

جب چنگیز خان کے بھیجے ہوئے مختلف لشکروں نے خراسان کے صوبوں پر غلبہ پالیا تو ملک رکن الدین کرت نے اپنے آپکو قلعہ خیسار میں بند کر لیا جہاں اس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ منگول قلعہ کو سر نہ کرسکے تو اس کی اطاعت قبول کرنے میں ہی مصلحت سمجھی اور اسے والئ غور تسلیم کر لیا۔ جس کی بنا پر اس کی اولاد غور کا موروثی مالک ہونے کا دعویٰ کرتی تھی۔ ملک رکن الدین ملک تاج الدین عثمان کا بیٹا تھا جو عزّ الدین عمر مرغانی کا بھائی تھا۔ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عمر مرغانی سلطان غیاث الدین غوری کا وزیر تھا۔ وزیر نے اپنے ہر بیٹے اور رشتہ دار کو ایک ایک صوبے کا ناظم مقرر کر دیا تھا اور اپنے بھائی تاج الدین عثمان کو قلعہ خیسار پر تعینات کیا جو اس کے بیٹے رکن الدین کو وراثت میں ملا۔ مؤخر الذکر ۶۴۳ھ (۴۷-۱۲۴۶ء) میں فوت ہوا۔

تاریخ وصاف کے مطابق ملک شمس الدین کرت کی اولاد میں سے تھا جو سلطان مودود کے دربار میں اس ضلع کی افواج کا سالار تھا اور وہ خود سلطان محمد خوارزم کے حریف سلطان شہاب الدین کا قرابتدار تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ ۶۴۴ھ میں ملک شمس الدین سلی نوین کے ساتھ ہندوستان گیا لیکن حریفوں کے حسد کی وجہ سے اس کا ساتھ چھوڑ گیا اور خراسان میں طائر بہادر کی فرودگاہ میں آگیا اور ۶۴۵ھ (۴۸-۱۲۴۷ء) میں اس کی وفات تک وہیں رہا۔

طائر بہادر کا بیٹا ملک پر مہربان نہ تھا لہٰذا وہ چنگیز خان کے جانشین، منگو خان کے دربار میں چلا گیا۔

منگو خان نے ملک شمس الدین کو ہرات کی حکومت بخش دی اور اُس کے تمام ملحقہ علاقے بھی اُس کے ماتحت کر دیئے جن میں ایک طرف جیحون تک جام، نجارز، کوہسویہ، فیروز کوہ، گرجستان، مرغاب، مروشک اور فاریاب اور دوسری طرف سرحد سندھ تک اسفزار، فرح، سجستان، تکیاباد، کابل اور افغانستانی تیراہ شامل تھے۔ خلعت ہائے فاخرہ کے علاوہ بہترین آلات جنگ اور ۱۰۰۰۰ دینار نقد بھی اسے عطا کئے گئے اور ساتھ ہی ارغون آکہ کو حکم دیا گیا کہ ملک کو ۵۰ تومان (دستے) فوج بھی دی جائے۔

۵۵-۱۲۵۴ء:-

ملک شمس الدین نے ہرات کی حکومت سنبھالی اور ۶۵۲ھ میں گرم سیر کی نیابت مستونگ کے قصبہ مستونگ کا محاصرہ کیا اور افغان علاقے پر حملہ کر کے پری، کوہ پرا، دُکی اور سجی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں ملک شمس الدین ہرات واپس آ گیا۔ دریں اثنا ہرات کے تاجیک حکمران کے خلاف سازشیں شروع ہو گئی تھیں اور باتو خان نے اپنے بھتیجے، بلغا خان کو حکم دیا تھا کہ ملک شمس الدین کو گرفتار کر لیا جائے۔ بلغا خان اُس وقت خراسان سے مازندران جا چکا تھا لیکن اُس نے ملک کو پکڑنے کے لئے ایک گماشتہ بھیجا اور حکم دیا کہ اُسے حراست میں لیکر اُس کے پاس بھیج دیا جائے۔ اسی دوران ملک شمس الدین معاملات سلطنت سلجھانے کے لئے سیستان روانہ ہو چکا تھا۔ راستے میں اُسے حاکم سیستان ملک علی ابن مسعود ملا جو قطبوغہ نوئین (جس کو ملک شمس الدین کے پروانہ گرفتاری پر عملدرآمد کیلئے مقرر کیا گیا تھا) کے پڑاؤ کی طرف جا رہا تھا۔ ملک سیستان نے ملک شمس الدین کو مطلع کیا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر واپس آ جائیگا اور والئی ہرات کے سامنے پیش ہو گا۔ اسی عرصے میں اُس نے سیستان میں اپنے عزیز و اقارب کو خطوط لکھے کہ وہ ملک علی کا قلعہ ملک شمس الدین کے حوالے کر دیں اور اُس کی موزوں عزت و تکریم کریں۔ ملک شمس الدین سیستان کو روانہ ہُوا لیکن ایک گماشتہ، امیر شمس الدین اسفراری بھیجا تا کہ وہ ملک علی سیستانی کے پیچھے پیچھے قطبوغہ نوئین کے پڑاؤ میں جائے۔ وہاں ملک سیستان کو ملک شمس الدین

کی گرفتاری کے معاملے کا بتایا گیا اور بُلغاخان کے ایلچی ملک سیستان کے ہمراہ بھیجے گئے تاکہ پروانہ گرفتاری پر عمل ہو سکے۔

خطرے کی اطلاع ملک شمس الدّین کُرت کو سیستان میں ہی مل گئی اور وہ ملک علی ابن مسعود اور مُغل شہزادہ کے ایلچیوں کے پہنچنے تک کارروائی کے لئے تیار ہو گیا۔ والیٔ ہرات کے ساتھ مذاکرات شروع ہو گئے اور طرفین نے ایک دُوسرے کو جھانسہ دینے کی کوشش کی حتیٰ کہ آخر کار ملک علی ابن مسعود نے اس امید پر مذاکرات کیلئے قلعہ میں داخل ہونے کی دعوت قبول کر لی کہ وہ موقعہ ملتے ہی اسے قتل کر دے گا۔ ملک شمس الدّین نے بھی ایسا ہی منصوبہ بنایا تھا اور جونہی ملک علی قلعہ میں داخل ہوا، اوّل الذکر نے دروازے کے پیچھے سے تیغ سے وار کر کے ملک سیستان کا سَر قلم کر دیا۔ اس واقعہ نے ملک علی کے ہمرکابوں اور مسلح آدمیوں کو منتشر کر دیا اور ملک شمس الدّین کو سیستان سے نکلنے کا موقعہ مل گیا۔ وہ تین سیستانی سرداروں کو قتل کرنے کے بعد سیدھا ایلخان کے دربار کو روانہ ہُوا اور علماً فضلار کو انعامات و جاگیرات اور ۷۰۰ معتبرین کو خلعت ہائے فاخرہ بخش گیا۔ ایلخانی دربار میں پہنچ کر ملک شمس الدّین اور اُس کے معاندین دونوں نے اپنی اپنی معروضات پیش کیں حتیٰ کہ ایلخان اوّل الذکر کی وفاداری کا قائل ہو گیا اور اُسے حکومت ہرات پر بحالی کا فرمان تازہ مل گیا۔

۵۹-۱۲۵۸ء :-

۶۵۷ھ میں ملک شمس الدّین نے افغان علاقے میں قلعہ بھکر سر کر لیا جو ایک چوڑے دریائی علاقے میں ایک سطح مرتفع پر بنا ہُوا تھا۔ قلعہ دار نے خراج دینا منظور کر لیا۔ فاتح کو نفیس پارچات کے پچاس خروار، ۵۰ غلام، ۱۰۰۰۰ دینار نقد، پانچ عربی گھوڑے اور دیگر نایاب اور بیش بہا چیزیں دی گئیں۔ وہاں سے ملک شمسرا ۔ زمیندا ور میں داخل ہوا جہاں اُس نے ملک میران شاہ کو پکڑ کر تہ تیغ کر دیا۔

۶۶۳ھ (۶۵-۱۲۶۴ء) میں ملک نے اپنے رشتہ دار ملک تاج الدّین کھر کو مار ڈالا۔

۶۶۵ھ (۶۷-۱۲۶۶ء) میں ملک، اباقہ خان کے دربار میں عراق گیا اور اُس کے جھنڈے

تلے اُس کے حریف، بَرَقْ خان کے خلاف لڑا، اور پھر ہرات وَاپس آگیا۔

۷۷-۱۲۷۶ء:-

۶۷۵ھ میں ملک دوبارہ ایلخانی دربار میں گیا لیکن خراسان اور اس کے ملحقہ علاقوں پر اس کے بے پناہ اثر و رسُوخ نے حاکمِ اعلیٰ کو خائف کر دیا تھا چنانچہ اُسے ایلخانی خیمہ میں حاضر رہنے کا حکم دیا گیا اور اُس کے بیٹے رُکن الدین اور اُس کے بھائی کو دربند با کو بھیج دیا گیا۔ آخر کار ملک شمس الدین اس زہر کے اثر سے مر گیا جو تبریز کے ایک حمّام میں اباقہ خان کے حکم پر ایک تربوز میں ڈال کر اُسے دیا گیا تھا۔ یہ ماہ شوال ۶۷۶ھ (۷۸-۱۲۷۷ء) کا واقعہ ہے۔ اباقہ خان مرحوم اور اس کی شاطرانہ فطرت سے اتنا ڈرتا تھا کہ اُس نے مُلکتُو نامی ایک منگول ایلچی محض اس لیے دربار میں بھیجا کہ وہ اُس کی لاش کا ذاتی ملاحظہ و معائنہ کر کے اس کی موت کی تصدیق کر سکے۔ ۶۷۷ھ (۷۹-۱۲۷۸ء) میں اباقہ خان ہرات آیا اور اُسے رُو بہ انحطاط دیکھ کر ملک رُکن الدین کو ہرات اور اُس کے ملحقات کا والی مقرر کیا اور اسے شمس الدّین کا خطاب بھی دیا۔ اسی لئے وہ آلِ کُرت کی تاریخ میں شمس الدّین صغیر مشہور ہوا۔

۶۸۰ھ (۸۲-۱۲۸۱ء) میں اُس نے تیرہ دن کی خُونریز لڑائی کے بعد قندھار پر قبضہ کر لیا کیونکہ اُس کے حاکم نے والیٔ ہرات کی حیثیت سے اُسے تسلیم نہ کیا تھا۔

۸۴-۱۲۸۳ء:-

۶۸۲ھ میں شمس الدّین صغیر نے اپنے بیٹے علاؤ الدّین کو ہرات کا نائب مقرر کیا اور خود خَیسار چلا گیا۔ کم درجے کے افسروں کے تحت منگول دستے اور منگول شہزادوں کے تحت بے محابا لشکر ایلخانی حکومت کے مشرقی اور شمالی صُوبوں میں من مانیاں کرتے رہتے تھے ۔۔ یہ شہزادے شاہی اختیار و اقتدار استعمال کرتے تھے اور ان کے فرامین کو صرف ایلخان ہی مسترد کر سکتا تھا۔ تاجیک حکمران سخت مشکل میں تھے اس لئے کہ مغل سردار اور شہزادے انکے خلاف لگاتار زہر افشانی اور کردار کشی کی مہم چلاتے رہتے تھے۔ ایک منگول باغی سردار کی زَر کشی کی وجہ سے

ملک شمس الدّین اور اُس کے بیٹے علاؤالدّین دونوں نے ہرات چھوڑ دیا اور قلعہ خیسار میں چلے گئے۔ ہرات کی آبادی دوسرے شہروں کو جانے لگی اور شہر قریب قریب ویران ہو گیا۔ نکودری سردار آباجی کے حملے نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اُس نے شہر اور متعلقہ علاقوں کو جی بھر کر لوٹا اور ان کے باشندوں اور خاندانوں کو قیدی بنا کر لے گیا۔

۱۲۹۱ ء :-

۶۹۰ ھ میں غازی خان نے ایک فرمان کے ذریعے حکم دیا کہ ملک حسام الدّین سبزواری (اسفزاری) ملک جلال الدّین فرحی اور ملک نصیر الدّین سجستانی ان کے علاقوں میں پناہ لینے والے اہل ہرات کو واپس بھیج دیں۔

ایلخان نے امیر نوروز کو ۵۰۰۰ سوار دے کر شہر اور صوبے کی حفاظت کیلئے بھیجا اور حکم دیا کہ کوئی منگول یا مسلمان باشندوں پر کوئی محصول یا مطالبہ عائد نہ کر سکتا تھا۔ اس طرح شہر دوبارہ شاد و آباد ہوا، اور لوگ امیر نوروز کو اس کی نگہداشت اور شفقت کیلئے دُعائیں دینے لگے۔

ملک شمس الدّین نے اپنے بڑے بیٹے، فخر الدّین کو سات سال سے قید کر رکھا تھا لیکن امیر نوروز نے اسے رہائی دلوائی، اپنی سرپرستی میں لیا، اسے تعلیم و تربیت دی اور اسے ایلخانی دشمنوں کیخلاف حسب ضرورت استعمال کیا۔ دیگر مہمات کے علاوہ ملک فخر الدّین کو ملک نیالستگین فرحی کیخلاف مہم کا سالار بنایا گیا۔ مؤخر الذکر نے اس لئے بغاوت کر دی تھی کہ اس کی عراق میں غیر حاضری کے دوران امیر نوروز نے اس کے بھائی ملک جلال الدّین کو گرجستان کے ایک قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ ملک نیالستگین نے واپس آ کر ان تمام قلعوں پر قبضہ کر لیا جو امیر نوروز کے آدمیوں کے قبضہ میں تھے، اور اپنے صوبے کے اس گروہ کو تہ تیغ کر دیا جو امیر نوروز کا حامی بن گیا تھا۔ ملک فخر الدّین نے ملک نیالستگین سے مذاکرات کئے اور اُسے ہتھیار ڈالنے پر اُکسایا اور وعدہ کیا کہ وہ اُس کی اور اُس کے بھائی جلال الدّین کی جان بخشی کیلئے پورا زور دے گا۔

خراسان میں بدنظمی اور ابتری کے دوران (جب اہل ہرات ہجرت کر گئے تھے) غالباً

ملوک فرح نے آزاد ہونے کی کوشش کی تھی۔ قریباً اسی وقت شہزادہ دُوآبن بُرَق خان ایک لاکھ آدمیوں کے ہمراہ خراسان میں داخل ہُوا اور ملک فخرالدّین کیساتھ کھلے مذاکرات کی کوشش کی۔ مؤخرالذّکر نے شہزادہ دُوآ کے ساتھ گفتگو سے انکار کر دیا اور امیر نوروز اپنے مہرے کو لیکر عراق میں غازی خان کے دربار میں چلا گیا۔

ایلخان نے حکومت ہرات ملک فخرالدّین کو بخش دی، دس ہزار دینار نقد اور دیگر بیش بہا تحائف دیئے اور ان کے علاوہ ایک ہزار منگول بطور محافظ دستہ بھی تعیّنات کر دیئے۔ رفتہ رفتہ امیر نوروز غازی خان سے اُلجھ گیا اور بالآخر قلعہ ہرات میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ امیر قتلغ ... ۷۰ سپاہی لیکر آیا اور ہرات کا ۱۸ دن محاصرہ کئے رکھا۔ اس مخمصے میں ملک فخرالدّین نے محسن کی بجائے ایلخان سے وفادار رہنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اُس نے محسن کو پکڑا اور دشمن کے سپرد کر دیا جس نے اُسے ۱۰ اگست ۱۲۹۷ء کو ہی تہ تیغ کر دیا۔

۹۹-۱۲۹۸ء :-

۶۹۸ھ میں امیر نکودر ...۳۰ آدمیوں کے ہمراہ عراق سے آیا اور اُنہیں ہرات کے اِردگرد زمینیں دے دی گئیں۔ وہ متکبّر اور فرومایہ لوگ تھے اور اُنہوں نے کوہستان، فرح، سجستان، اور جزرُوان میں یورشوں سے جو تباہی مچائی اور جو ظلم ڈھائے اُن پر ساری دُنیا اُن پر پھٹکار بھیجنے لگی۔

آخرکار غازان خان نے اپنے بھائی، خدا بندہ کو حکم دیا کہ وہ نکودریوں، سجزیوں اور غوریوں کو تتّر بتّر کر دے، جنہیں ملک نے ہرات کے گرد زمینیں دیکر آباد کر دیا تھا۔ ملک فخرالدّین نے یہ ماننے سے انکار کر دیا جس پر خدا بندہ ہرات کی طرف بڑھا لیکن جب وہ ہرات رود پر پہنچا تو ملک نے شہر چھوڑ دیا اور قلعہ امان کوہ[1] میں محصور ہو گیا۔ جسے بعد میں اسپاکلاچہ کہنے لگے۔

---

[1] امان کوہ ہرات کے قریب ہی جنوب مغرب میں تھا۔ یہ یقیناً موجودہ عزریان (= اہلِ غور) کے پاس تھا اور امان کوہ کی چوکی عزریوں کے قبضے میں ہی تھی۔

خدابندہ نے چار دن تک اس کا ناکام محاصرہ کیا جس کے بعد ایک خونریز لڑائی ہوئی جس میں محاصرین کے دو ہزار آدمی کام آئے اور دو ہزار زخمی ہو گئے۔ اگلی رات ملک اپنے چیدہ دستے کے ساتھ قلعہ سے باہر جھپٹا اور محاصرین کو کاٹتا چیرتا ہوا ہرات میں داخل ہوا اور پھر اسی رات غور کے لئے روانہ ہو گیا۔ خدابندہ نے ہرات کا محاصرہ ۱۸ دن تک کیا لیکن شیخ الاسلام نے کہا کہ ملک شہر میں نہیں تھا لہٰذا وہ محاصرہ اٹھا لے۔ چنانچہ محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ جلد ہی ملک فخر الدّین واپس آ گیا اور خیرات تقسیم کر کے وہ ہرات کی قلعہ بندیوں کو مضبوط کرنے لگا۔ شہر کی ساری آبادی اس کام پر لگا دی گئی اور ۶۹۹ھ (۲-۱۳۰۱ء) میں یہ کام مکمّل ہو گیا۔ ۷۰۱ھ میں ملک فخر الدّین، ملک حسّام الدّین سبزواری اور اُس کے بھائی رُکن الدّین کو مطیع کرنے کے لئے روانہ ہُوا، کیونکہ وہ دونو اس کی حاکمیّت سے مُنکر تھے۔ دریں اثنا ملک حسّام الدّین تو فوت ہو گیا لیکن اُس کے بھائی رُکن الدّین نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پھر قلعہ روبہ میں بند ہو گیا، جس پر ملک فخر الدّین واپس ہرات آ گیا۔

دُوسری دفعہ ملک فخر الدّین نے مسلمانوں اور منگولوں کا ایک عظیم لشکر تیّار کر کے سبزوار (اِسفرار) پر حملہ کیا لیکن اسے بے نیل و مرام لوٹنا پڑا۔

تیسری دفعہ ملک فخر الدّین نے ہراتیوں، طلاقیوں، بحرزیوں، خافیوں، غوریوں اور نکودریوں کے ایک لشکر جرّار کے ساتھ سبزوار پر حملہ کیا۔ اُدھر اُس کا بھائی علاء الدّین بھی تین ہزار اہلِ کوہ کے ساتھ اس کی مدد کے لئے غور سے آیا۔ سات دن کی خوفناک لڑائی کے بعد اسفرار پر قبضہ ہو گیا، بے پناہ قتل و غارت ہُوا اور بے شمار لوگ ہرات پکڑ کر لائے گئے جہاں اُنہیں مٹّی گوندھنے اور اینٹیں بنانے پر لگا دیا گیا۔

اس کے بعد ملک رُکن الدّین نے اطاعت اختیار کر لی اور دربار ہرات میں حاضر ہُوا، لیکن پھر دغا کے خوف سے بھاگ گیا۔ اس کے بعد اُس کا بیٹا ملک عزّ الدّین دربار ہرات میں حاضر ہُوا جہاں اُسے کچھ عرصہ بعد گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔

۷۰۳ھ (۴-۱۳۰۳ء) میں خدا بندہ اپنے بھائی غازن خان کا جانشین ہُوا، اور اُلجیتُو سُلطان کا لقب اختیار کیا۔ بارھویں ماہِ صفر ۷۰۵ھ (= ۴ ستمبر ۱۳۰۶ء) بروز پنج شنبہ ملک شمس الدّین کُرت خیسار میں عالمِ بالا کو سُدھارا، اور اُس کی نماز جنازہ جامع مسجد ہرات میں ادا کی گئی۔

۷۰۶ھ (۷-۱۳۰۶ء) میں ملک فخر الدّین اور اُس کے حاکمِ اعلیٰ کے درمیان اختلافات رُونما ہو گئے اور دانشمند بہادر کو دس ہزار سواروں کے ساتھ بھیجا گیا کہ وہ ملک فخر الدّین اور نکودریوں کو پکڑ کر اُلجیتُو سلطان کے حضور میں پیش کرے۔ ملک فخر الدّین قلعہ امان کوہ میں بند ہو گیا اور قلعہ ہرات (یا قلعہ اختیار الدّین) اُس کے بیٹے جمال الدّین محمّد سام کے قبضے میں رہا جس میں ایک چیدہ فوج بھی موجود تھی۔ منگولوں کی کچھ ابتدائی کارروائیوں کے بعد اُسے ایک چال کے تحت ایک دستہ سمیت قلعہ کے اندر داخل کر لیا گیا اور ملک جمال الدّین نے ایک ایک کو قتل کر ڈالا۔ ملک نیالستگین فرحی دانشمند کی فوجوں کے ساتھ باہر انتظار کرتا رہا کہ اتنے میں اُس کا ایک واقف سنجری قلعہ سے باہر نکلا جس نے استفسار پر بتایا کہ دانشمند بھی امیر نوروز کی طرح وادی خموشاں میں چلا گیا۔ اس خبر سے خوفزدہ ہو کر ملک نیالستگین باقیماندہ دستے کیساتھ فرار ہو گیا۔ جب بھگوڑے فیروز آباد کے دروازے پر آئے تو اُسے بند پایا لیکن اُن کے ایک ساتھی عُمر نامی نے جنگی تیشے سے تالا توڑا، اور زنجیریں کاٹ کر بھاگ گئے۔

دانشمند بہادر کے قتل کا بدلہ اُس کے بیٹے بوجائی نے لیا۔ محاصرۂ ہرات کے دوران ملک فخر الدّین بیمار ہُوا، اور ۲۴ شعبان ۷۰۶ھ (۱۶ جنوری ۱۳۰۷ء بروز اتوار) کو فوت ہو گیا۔ ملک جمال الدّین محمّد سام نے ہتھیار ڈال دیئے لیکن امیر بُوجائی نے اسے بالآخر تہ تیغ کر دیا۔

ملک فخر الدّین کا بھائی، ملک غیاث الحق والدّین ۷۰۷ھ (۸-۱۳۰۷ء) میں ہرات میں تخت نشین ہوا۔ اُس نے الجیتو خان کو حاکمِ بالا تسلیم کر لیا، اور ۷۰۸ھ (۹-۱۳۰۸ء) میں غور اور اسفرار پر اپنا اقتدار جمانے کے لئے گیا۔

خراسانی منگولوں کی سازشوں کی وجہ سے ملک غیاث الدّین ۷۱۱ھ (۱۲-۱۳۱۱ء) میں الجیتو

سلطان کے حضور پیش ہوا اور ۷۱۵ھ (۱۳۱۵-۱۶ء) تک اُسے حراست میں رکھا گیا۔ اس سال اُسے حکومت ہرات پر بحال کر دیا گیا اور سلطان نے اُسے غیر معمولی انعام واکرام سے نوازا۔

۷۱۶ھ (۱۳۱۶-۱۷ء) میں ملک غیاث الدّین اسفرار گیا اور ایک بڑے نکودری لشکر کو شکست دے کر تتر بتر کر دیا۔

اسی سال منگول شہزادہ یاسُر نے خراسان پر قبضہ کر لیا اور ۷۱۷ھ (۱۳۱۷-۱۸ء) کا سال انہی لٹیروں کے ساتھ لڑتے بھڑتے گذرا۔ اِس سال سلطان الجیتُو انتقال کر گیا اور اُس کا بیٹا ابوسعید سلطان تخت نشین ہوا۔ موخر الذکر نے ملک غیاث الدّین کو ہرات اور اُس کے ملحقات کی حکومت پر مستقل کر دیا۔

شہزادہ یاسُر ۷۱۹ھ (۱۳۱۹ء) تک خراسان کو تاخت و تاراج کرتا رہا اور اس کے بعد اپنے لشکر گرم سیر کی طرف لے گیا۔

اضلاع سبزوار (اِسفرار) فرح اور سیستان ملک غیاث الدّین کے ماتحت تھے لیکن شہزادہ یاسُر کے تحت منگول حملوں کے دوران سبزوار اور فرح کے ملوک نے اُس متکبّر شہزادے کے ساتھ دوستی کر لی تھی اور مؤخر الذّکر نے انہیں ملک غیاث الدّین کی اطاعت گزاری سے منحرف کر دیا تھا۔ ملک قطب الدّین سبزواری نے قلعۂ عیقل پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن ملک غیاث الدّین کے گورنر امیر علی خطائی نے اپنے آقا کے سب نمک خواروں کو جمع کیا اور ملک قطب الدّین کی قلعہ اِسفرار میں ناکہ بندی کر دی۔ ملک غیاث الدّین نے بھی لشکر اکٹھا کیا اور اپنے وفاداروں کی مدد کے لئے آیا اور ملک نیالتگین فرحی دس ہزار کا لشکر لے کر اپنے سبزواری دمساز کی حمایت کیلئے پہنچا۔ ملک غیاث الدّین کا لشکر وہ میدان شاکان کیطرف چلا لیکن ملک غیاث کی آمد کی تصدیق پر وہ اتنا ڈرا کہ اپنے ساتھیوں کو سپرد تقدیر کر کے صحرائے فرح کے راستے واپس چلا گیا۔ ملک غیاث الدّین نے شاکان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور اس مجمع بے سردار کو آن کی آن میں توڑ پھوڑ کر منتشر کر دیا اور دو ہزار قیدی بنا لئے۔ نتیجہ کے طور پر ملک قطب الدّین اور اس کا بیٹا ملک خسرو اپنے آپ کو

والیٔ ہرات کی تحویل میں دینے پر مجبور ہو گئے۔ اُنہیں قیدی بنا کر شہر کے چہار سُو میں لے گئے تاکہ برسرِ عام سزا دی جا سکے۔ ابوسعید سلطان کے دربار میں خبر پہنچی تو وہ خوش ہوا کہ ملک نے خراسان میں اتنے اعداء کے باوجود اپنے حاکمِ اعلیٰ کے مفادات کا تحفظ کیا تھا۔ ملک قطب الدّین اسفراری، ملک فرح اور اُن تمام کی جاگیرات بحق سرکار ضبط کر لی گئیں جنہوں نے شہزادہ یاسر کا ساتھ دیا تھا اور اُنہیں بکودریوں سمیت حکم دیا گیا کہ وہ ملک غیاث الدّین کو اپنا حاکمِ بالا تسلیم کریں۔ ملک غیاث الدّین نے اپنے ہمنام پیشرو سلطان غور کی تعمیر کردہ جامع مسجد ہرات کو بحال کر دیا۔ اس کا بیشتر احاطہ مرمّت طلب ہو چکا تھا اور اس کے مشرقی اور جنوبی حجرے خستہ و شکستہ ہو چکے تھے۔ ملک نے ان سب کو از سرِ نو تعمیر کیا اور معتبرین شہر کے ساتھ بنفسِ نفیس ۵۰ دن تک وہیں خیمہ زن رہا تاکہ مرمت و تعمیر پوری ہو سکے۔ اُس نے اور بھی عمارات ہرات اور دُور افتادہ شہروں میں تعمیر کروائیں جو اُس کی حدودِ مملکت میں تھے۔

۱۳۲۰ء:-

۷۲۰ھ میں اُس نے ضلع بخارز پر قبضہ کر لیا اور اسی سال اس کا جانی اور طاقتور دشمن، شہزادہ یاسر، ملک کی فوجوں سے لڑتا ہُوا مارا گیا جب شہزادہ کبک نے بھی جیحوں پار سے ملک کی مدد کی۔ اسی سال ملک غیاث الدّین اپنے بیٹے ملک شمس الدّین محمدؒ کو قائم مقام بنا کر ایک بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے مکّہ معظّمہ گیا۔

۲۲-۱۳۲۱ء:-

۷۲۱ھ میں خراسان کے سالار، امیر حسین نے ابوسعید سُلطان کی طرف سے ملک نیالتگین فرحی کو حکم بھیجا کہ وہ پانچ ہزار خروار اناج اپنے حاکمِ بالا کو ہرات بھیج دے۔ نیالتگین اس درخواست کو خاطر میں نہ لایا اور اعلان کیا کہ ہرات سے تمام تعلّقات کا فیصلہ حسبِ معمول تلوار کرے گی۔ چنانچہ ملک شمس الدّین محمدؒ کرت نے فرح کے ضلعوں کو پچھاڑا اور لتاڑا اور بہت سا مالِ غنیمت لیکر ہرات واپس آیا۔

۲۹-۱۳۲۸ء:-

ملک غیاث الدین کُرت ۷۲۹ھ میں فوت ہوا۔ اُس نے چار بیٹے چھوڑے۔ ملک شمس الدین محمدؔ، ملک حافظ، ملک معزّ الدین اور ملک بکر۔ اُن کے والد کے تحت آلِ کُرت اپنے عرُوج کو پہنچ گئے تھے۔ سارا خراسان اُس کا ماتحت تھا اور سیستان بھی آئینی طور پر اُس کے زیرنگیں تھا۔ گو کیانی ملوک اور ان کے حاکمِ بالا سے تعلقات کا کوئی واضح خاکہ نہیں ملتا، تاہم اِس میں شک وشبہ نہیں کہ اوّل الذکر ملک نیالتگین فرحی کے ساتھ گٹھ جوڑ کئے ہُوئے تھے اور ملوک ہرات کی مخالفت میں اُس کا ساتھ دیتے تھے۔ روضۃ الجنّت کے مصنّف نے ایک طنزیہ شعر نقل کیا ہے۔ جب ملک قطب الدین ہراتیوں کے محاصرے میں تھا اور قلعہ اسفزار کو بچانے کی ایک ناکام کوشش کی گئی تھی۔ یہ بھی صاف طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ملک قطب الدین کو تنبیہہ کر دی گئی تھی کہ وہ فرح اور سیستان کی فوجوں سے کسی مدد کی توقع نہ کرے۔ شہزادہ یاسر کے حملوں اور اُن سے پہلے بھی ملوک سیستان یقیناً آزاد اور خودمختار حکمرانوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب سے ملک علی ابن مسعودؔ نے اپنی جان سے ہاتھ دھوئے آلِ کُرت کے ملوک کبھی سیستان میں داخل نہ ہُوتے۔ ملک شمس الدین محمدؔ اپنے والد کے بعد ملک ہرات بنا اور ایک دانشمند اور انصاف پسند حکمران ثابت ہُوا لیکن اُس کی زندگی محض یک روزہ مسّرت و انبساط تھی کیونکہ وہ تخت نشینی کے صرف دو ماہ بعد ہی ملکِ عدم کو روانہ ہو گیا۔

ملک حافظ اپنے بھائی کا جانشین بنا لیکن وہ ایک کمزور حکمران تھا اور غوری اپنی من مانیاں کرتے رہے کیونکہ وہ اُنہیں لگام نہ دے سکتا تھا۔

۳۶-۱۳۳۵ء:-

۷۳۶ھ میں ابوسعید سُلطان بھی ملک الموت کا شکار ہو گیا۔ وہ چنگیز خان کی نسل کا آخری اور عظیم ترین حکمران تھا اور اُس کے بعد فاتح اعظم کے موروثی تخت و تاج کا کوئی اہل نہ رہا۔ ہر طرف فتنہ و فساد نے سر اٹھایا اور ہر کوئی اپنی اپنی بادشاہی کا خواب دیکھنے لگا۔ ان ہنگاموں کی وجہ سے ایران خلفشار کی نذر ہو کر ویران ہو گیا۔

تاریکی کے اس دَور میں ملک معزالدّین حسین ہراتی کا انصاف روشنی کا واحد نشان تھا۔ وہ ظلم و تشدّد کے خلاف سدِّ سکندری بنا ہُوا تھا، عدل اور جُود و سخا کا پیکر تھا اور مظلوموں کی پناہ بنا ہُوا تھا۔

فارس میں آلِ مظفر برسرِ اقتدار آ گئے اور سبزوار (نیشاپور) میں سربداری بیہق کے ایک عظیم انسان امیر عبدالرحمٰن کے تحت خود مختار ہو گئے تھے۔ اُس کے بھائی وجیہہ الدّین نے اُسے ماہ رجب ۷۳۸ھ (۶ جنوری ۱۳۳۸ء) کی بارہویں تاریخ کو قتل کر دیا اور خود تخت و تاج کا مالک بن بیٹھا۔

۴۳-۱۳۴۲ء:-

امیر وجیہہ الدّین نے بالآخر ہرات سے لڑائی چھیڑ ہی لی، اور ملک معزالدّین حسین غوریوں، سجزیوں، بلوچوں اور نکودریوں کا ایک ٹڈی دل لیکر اس کے خلاف بڑھا۔ دونوں فوجوں کا ٹکراؤ تیرھویں ماہ صفر ۷۴۳ھ کو ضلع زاوہ میں ہوا اور گھمسان کے رن کے بعد میدان ملک ہرات کے ہاتھ میں رہا۔ یہ فتح اس کی ذاتی شجاعت اور حاضر دماغی کا ثمرہ تھی۔

اس فیصلہ کُن فتح کے بعد ملک معزالدّین حسین نے کوہستان کے کئی حصّوں کو مطیع کیا اور اپنی آزاد حکومت شروع کی۔ اُس نے بادغیس پر توجّہ دی اور بلخ، شبرغان اور اندخُود پر فوج کشی کی۔ ان علاقوں کو تہ و بالا کیا اور ارلات اور ابیورد کے قبائل کو بہت کشت و خون کے بعد شکست دی بلکہ مقتولین کے سروں کے دو مینار کھڑے کر دیئے۔

اُن دنوں میں جیحوں پار کے علاقے لاقانونیت کی زد میں تھے۔ لہٰذا کسی کو خراسان میں دخل اندازی کی فرصت نہ تھی اور ملک معزالدّین کو اپنی آزادانہ حکومت کا خوب موقعہ ملا۔ ہر روز پنج وقتہ نوبت بجنے لگی اور ایک آزاد حکمران کے تمام قرائن و علائم تیار کئے گئے۔ اُس نے ہرات کے موجُود مورچوں کو مضبُوط کیا اور انتہائی مستحکم اور جسیم قلعہ بندیوں کا ایک بیرونی حلقہ تعمیر کروایا جو بہت بڑے علاقے پہ محیط تھا۔ روضۃ الجنّت کا مصنّف اُن کے کھنڈرات کو یُوں بیان کرتا ہے:

"یہ حصّے انجل کے پُل سے لیکر دربندِ شیخ خرام تک پھیلے ہوئے تھے اور ملاّ شیین کی حدُود سے خیمہ سازوں کے پُل تک موجُود تھے جو قریباً ایک فرسخ کا فاصلہ ہے"۔

اُس کے توسیعی عزائم کی وجہ سے اس کی ملوک سیستان سے ٹکر ہوگئی جو کچھ عرصہ سے آزاد چلے آرہے تھے جس کی تصدیق اُن کے سکوں سے ہوسکتی ہے۔

"ملک قطب الدین شاہ رُکن اپنے چچا شاہ نصرت کے بعد ۷۳۱ھ (۳۱-۱۳۳۰ء) میں تخت سیستان پر بیٹھا۔ اُسے افراد شاہی اور امرائے سلطنت نے چُنا تھا۔ نیمروز کی سندِ حکمرانی کی تقریب بروز پیر ربیع الثانی (۳۱ جنوری ۱۳۳۱ء) کو ہوئی اور بہت سے انعامات و اکرامات تقسیم کئے گئے۔ قطب الدین ایک بہترین حکمران تھا۔ مضبوط، مدبّر، انصاف پسند، فیّاض، بہادر، مخلص، علم و فضل اور جوہر قابل اور زہد و اتقا کا مربّی اور بدی اور آوارگی کا دشمن۔ وہ کار دانوں کو وظائف دے کر ان کا حوصلہ بڑھاتا تھا اور ہر روز اُس کے مطبخ سے تیس خروار روٹیاں اور دس خروار گوشت بمعہ دیگر لوازمات مسافروں اور غریبوں میں تقسیم کئے جاتے تھے۔ سیستان اس کے سامنے دست بستہ تھا۔ جب اُس کا نظم و نسق مکمل ہوگیا تو کچھ نمک حراموں نے ملک حسین غوری والیٔ ہرات کو سیستان پر حملے کے لئے اکسایا۔ چنانچہ وہ ۷۳۴ھ (۳۴-۱۳۳۳ء) میں ایک ٹڈی دل کے ساتھ حملہ آور ہُوا۔ جب ملک قطب الدین کو علم ہوا تو وہ بھی اَسّی ہزار پیادہ، رسالہ اور ہاتھی لیکر خراسانی فوج کے مقابلے کے لئے نکلا۔ جب وہ خراسانی فوج کے پڑاؤ یعنی پنج دہ کی ندی کے پاس چار جہوک (؟) کے مقام پر پہنچا تو شیخ علاؤ الدین سیستانی کا ایک ارادت مند، امیر اقبال سابق[1] اس کے پاس آیا اور فوج کو روکنے کی التجا کی، تاکہ وہ شاہِ ہرات کو بلاجواز مسلمانوں کے قتل سے روک سکے۔ ملک نے کہا "جاؤ اور اُسے بتادو کہ مجھے اس کا خوف نہیں لیکن مسلمانوں کا خون بہانے سے ضرور متنفر ہوں۔ اگر وہ باز نہ آئے تو فیصلہ میدان جنگ میں ہوگا۔" میر اقبال نے یہ پیغام ملک حسین کو دیا اور سیستانی

---

[1] ممکن ہے سابق اس کے والد کا نام ہو جیسا کہ سیستان میں آج کل بھی مسلّم ریت ہے۔ میر اقبال کا مقبرہ بیشاوران کے کھنڈرات کے قریب ہے اور غالباً شیخ کی اقامت گاہ کے احاطہ میں ہے جبکہ شیخ کا مقبرہ اس عمارت کے اندر ہے جہاں لوگ اُس کی مرت کے بعد اس کے کشف و کرامات کی بدولت استمداد چاہتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں۔

فوج کی کثرت و مہارت کا ذکر کیا۔ ملک حسین نے مشورہ قبول کر لیا اور دو گنی منزلیں طے کرتا ہُوا واپس ہرات چلا گیا۔ یُوں دونو بادشاہ بلا جنگ وجدل واپس ہوئے"۔

سیستان کے جغرافیائی محل وقوع نے کیانی ملوک کو آزادی کا موقعہ دیا۔ چونکہ شمالی علاقوں میں مختلف افراد و احزاب اقتدار کی رسّہ کشی میں مصروف رہتے تھے لہٰذا کیانیوں کیلئے بغرض توسیع اُس طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی ناممکن تھا۔ لیکن جنوب کی طرف موجود بلوچستان کے علاقے کیانی توسیعِ اقتدار کی بھرپور تسکین کر سکتے تھے۔

شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ابوسعید سُلطان کی وفات کے بعد غالباً ملک قطب الدّین نے بھی ابتری سے فائدہ اُٹھا کر کرمان پر اپنا تسلّط جمایا۔ سونے کا ایک سکّہ سیستان میں زیرِ معائنہ آیا جس میں دار الضّرب کرمان کا نام دیا ہوا تھا اور لقب قطب الحق والدّنیا والدّین بھی مرقوم تھا۔ اس پہ تاریخ اجراء ×۴۲ دی گئی تھی جس کا پہلا ہندسہ پڑھا نہ جا سکا۔

ابوسعید سلطان کے انتقال کے چند سال بعد ہی آلِ مظفّر نے فارس اور کرمان پہ قبضہ جما لیا لیکن یہ ایک قلیل المیعاد خاندان تھا اور ۷۵۴ھ (۱۳۵۳ء) کے بعد ہی کہیں جا کر یعنی آخری چنگیز خانی حکمران کی وفات کے ۱۸ سال بعد کرمان پر متصرّف ہو سکا۔ لیکن ملک قطب الدّین کو (جس کی طرف احیاء الملوک کے مرقومہ بالا اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے) ملک حسین کُرت ہراتی کو پسپا کرنے کے بعد ہی ۷۳۱ھ (۱۳۳۰-۳۱ء) میں سیستان کا ملک بنا دیا گیا۔ لہٰذا ملک قطب الدّین کے لئے ابوسعید سلطان کی موت کے بعد کرمان پر قبضہ کرنا ناممکن نہ تھا۔

حالاتِ سیستان سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ملک حسین ہراتی کی پسپائی کے بعد کیانی اس وقت تک خودمختار رہے جب تک اُن کا تصادم تیمور سے نہیں ہُوا۔

یہ عظیم فاتح آخری چنگیز خانی سلطان ابوسعید کے سال وفات میں پیدا ہُوا اور اس نے ترک سیادت کی تجدید کر دی اور چنگیز خانی کارناموں کو زندہ کر دیا۔ وہ چھبیسویں ماہ شعبان ۷۳۶ھ (۲۸ فروری ۱۳۳۶ء) کو جیحوں پار علاقہ کے شہر کش میں پیدا ہُوا۔

وہ اپنی ابتدائی زندگی میں جیحوں پار کے صوبوں میں برپا آویزش میں ملوّث رہا اور اسی کے دوران اُسے سیستانی کیانیوں اور ملوک ہرات سے رابطہ کا موقعہ ملا جنہیں وہ بعد میں زیر تصرّف لایا۔ اپنی زندگی کے موڑ سے ذرا پہلے وہ جیحوں کے جنوبی علاقے میں آنے پر مجبور ہوا' اور اپنے اتحادی امیر حسین (چنگیز خان کی نسل سے) کے ہمراہ قندھار کی طرف ضلع کرمز اور ضلع باختر زمین میں جاگزیں ہوا۔ وہ قندھار پر قبضہ کر کے اسے دار الحکومت بنانے کا منتظر تھا جو اسوقت غوریوں کے زیرنگیں تھا۔ ابھی وہ موقعہ کے انتظار میں تھا کہ سیستان میں ایک انقلاب یا ہنگامہ رونما ہُوا جسمیں حاکم سیستان کو شکست ہوگئی اور وہ تیمور سے مدد مانگنے پر مجبور ہُوا۔ تیمور اُس وقت اُنتیسویں سال میں تھا اور سن ہجری ۷۶۴ (۱۳۶۲-۶۳ء) تھا۔

تیمور اور اُس کا اتحادی' امیر حسین' فوراً کیانی کی مدد کے لئے لپکے اور مؤخرالذکر موسومہ جلال الدین محمود نے اُن کا پُرتپاک استقبال کیا، اُن کی حلقہ بگوشی اختیار کی اور اُنہیں بیش بہا تحائف دیئے۔ اُس نے ایک ہزار مسلح آدمیوں کے لئے بھی مناسب انتظامات کئے جو تیمور کے جلو میں تھے۔

اُسوقت سات قلعے جلال الدّین محمود کے حزب مخالف کے قبضہ میں تھے۔ ان میں سے تین تو تیمور نے فوراً ہی سَر کرلئے۔ اس پر سیستانی اتنے ڈر گئے کہ انہوں نے فوراً ہی ملک کی اطاعت قبول کر لی' اور خدشہ ظاہر کیا کہ اگر تیمور نے باقی قلعے بھی سَر کرلئے تو سیستان اُس کے رحم و کرم پر ہوگا۔ ملک جلال الدّین محمود نے بھی خطرے کو بھانپ لیا اور اتحادیوں کو اطلاع دیئے بغیر اپنے علاقہ میں واپس آگیا جہاں لوگ اُسکے گرد جمع ہوگئے۔ اُس نے ایک مہیب لشکر تیار کیا جو پیادہ اور رسالہ پر مشتمل تھا اور تیمور اور امیر حسین کیخلاف کوچ کیا۔ تیمور نے اپنی فوج تین حصّوں میں اس طرح تقسیم کی کہ امیر حسین سیستانیوں کے دآیں پہلو کا مقابل ہوا اور تیمور کا ایک سالار اُن کے بائیں پہلو کا اور تیمور خود تیسرے حصّے اور ہراول دستے کی کمان کرنے لگا جو سیستان کے قلب لشکر کے مقابل تھا۔ ایک سخت جنگ ہُوئی اور سیستانی تیمور اور امیر حسین کے لشکر کو دبانے لگے تو تیمور اپنے ذاتی محافظ دستہ کے ساتھ میدانِ جنگ میں داخل ہُوا اور ایک شدید مقابلے کے بعد سیستانی فوج میں گھُس گیا۔ اسمیں

تیمور کو دو زخم آئے۔ ایک بازو پر اور دوسرا پاؤں کے تلوے پر اور یہ دونوں دشمن کے تیروں کی کارستانی تھی۔ پاؤں کے زخم نے دائمی اثرات چھوڑے اور وہ عمر بھر کے لئے لنگڑا ہو گیا اور اسی لئے بعد ازیں تیمور لنگ مشہور ہو گیا جسے یورپی مؤرخین بگاڑ کر "تیمر لین" کہتے ہیں۔

احیاء الملوک سے جناب اے۔ جی۔ ایلیس نے جو فہرست شہزادگان ترجمہ کی ہے اس میں اس نام کا کوئی شہزادہ ۷۶۴ھ میں حکمران نہیں ملتا۔ البتہ سلطان محمود بن شاہ علی بن ناصر الدین کیانی کا نام ضرور ہے جس نے ۷۵۱ھ تا ۷۵۳ھ حکومت کی۔ یا موخر الذکر تاریخ غلط ہے یا اسے اس کے جانشین عز الدین بن رکن الدین محمود کے حق میں محروم تخت و تاج کر دیا گیا۔ اگر تاریخ غلط ہے تو عز الدین چھوٹا دعویدار یا حریف امیدوار تھا جس کا جانشین تیمور کو جلال الدین محمود کی مدد کے لئے سیستان لایا۔ یہ فرض کرنا ناممکن ہے کہ تیمور کو جائز حکمران کا پتہ نہ تھا اور یہ قریباً بعید از قیاس ہے کہ اس نے اس کے نام میں غلطی کی، کیونکہ اس معاملہ میں تاریخ اتنی صحیح ہے کہ غلطی کا امکان نہیں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس فہرست میں ایک اور تاریخ بھی غالباً غلط ہے اور یوں تاریخ ملوک میں دی گئی تاریخ کی غلطی کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں۔

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود کیانی کی زندگی میں ہی کوئی انقلاب برپا ہوا اور اس کی موت کے بعد ملک عز الدین حکومت سیستان کا وارث بنا۔

سیستان کی صورت حال جدول سوم میں دیئے گئے شجرۂ نسب سے واشگاف ہو جاتی ہے منصب حکمرانی خاندان کی کسی ایک شاخ کے لئے مخصوص اور موروثی نہ تھا بلکہ اہل خاندان حکمران کو چنتے تھے اور "نتیجتہً" وہ اپنے ان منتخب کنندگان کے رحم و کرم پہ ہوتا تھا۔ ارباب سیف الدین کی کہانیاں شجرۂ نسب سے سچی ثابت ہو جاتی ہیں۔ وہ کیانی امراء و وزراء کے لیل و نہار سے بخوبی واقف تھا اور اس کا بیان کہ تباہ شدہ محلات انہی کبارہ کی رہائش گاہیں تھیں اگر کاملاً درست نہیں تو اسقدر بعد زمانی کے باوجود صداقت سے قریب ترین ہے۔

ابوسعید سلطان کی موت کے بعد کی نصف صدی خراسان کے تاجیک حکمرانوں کے لئے

بہت خوشحالی کا دور تھا۔ آل کرت کے ملوک ہرات میں متمکن تھے اور قندھار کے گرد کے مشرقی اضلاع پر قابض تھے جو ۷۶۴ھ (۶۳-۱۳۶۲ء) میں غوریوں کے قبضہ میں تھا۔ کیا انہوں نے غالباً کرمان اور بلوچستان پر بھی اپنا تصرف جما رکھا تھا۔

ہندوستان کے ساتھ تجارت خوب زوروں پر تھی کیونکہ اگو احیاء الملوک کے مطابق ملک قطب الدین کے پاس واقعی ہاتھی تھے تو وہ انہیں قندھار کے ذریعے ہندوستان سے ہی حاصل کر سکتا تھا۔ اس جگہ سے سیستان تک دو راستے تھے۔ ایک نخلستانِ خاش میں خشت کا راستہ اور دوسرا زیریں وادیٔ ہلمند کا راستہ۔ لیکن یہ راستے ہمیشہ کھلے اور محفوظ نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ نکودری تومان ہلمند کے بالائی حصوں میں خیمہ زن رہتے تھے۔ یہ قریباً تمام کے تمام غیر مسلم قبائل تھے جو وسط ایشیائی سٹیپ کے میدانوں سے لاتے ہوئے کفر و شرک کو ہی مانتے تھے۔ یہ لٹیرے قبائل لوگوں کے لئے دردِ سر بلکہ غول بیابانی بنے ہوئے تھے اور ان کے اسی رویہ نے امیر تیمور اعظم کا غیظ و غضب ان پر انڈھیل دیا۔

ان میں سے کچھ قبائل سیستان کے ماتحت تھے یا کم از کم ملوک سیستان کے صیغۂ ملازمت میں تھے۔ سیستانی فوج میں شامل انہی میں سے کسی قبائلی تمندار نے تیمور پر وہ تیر چلائے جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے اور جن سے مؤخر الذکر بری طرح زخمی ہوا، لیکن وہ نکودری پڑاؤ میں ہی بغرض علاج ٹھہرا بھی حتیٰ کہ اس کے زخم ٹھیک ہو گئے۔

تیمور کے ساتھ پہلی یا بعد کی لڑائی میں ہاتھیوں کا کوئی ذکر نہیں۔ یا تو تجارتی رستوں کے روز افزوں عدم تحفظ کی وجہ سے سیستان کو ہاتھیوں کی فراہمی بند ہو گئی تھی یا پھر احیاء الملوک کا مصنف اپنے مربی شاہ ایران کے سامنے اپنے آباؤ اجداد کی عظمت ماضیہ اور وسائل وافرہ کی مبالغہ آمیز تصویریں پیش کرنے کا شائق تھا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ملک معز الدین حسین کرت نے بادغیس کے ترک قبائل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ انہوں نے یرت چنگیز خان کے ایک سردار امیر عزیز سے شکایت

کی جس نے کچھ عرصے کیلئے جیحوں پار علاقہ پر اپنا عَلَم لہرادیا تھا۔ اس سردار نے ہرات کے تاجیک حکمران کو سرنگوں کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ اُس نے مشرق میں کاشغر اور مغرب میں اُنڈمی کھُڈ کے درمیانی علاقے سے ایک لشکر اکٹھا کیا اور بلخ کو اس کا مستقر بنایا۔ ملک معزّالدین کرُت کی سرحدی چوکیوں نے اس لشکر کی ہرات کیطرف پیش قدمی کی اطلاع دی اور ملک نے فصیل کے اندر اپنے آپ کو قلعہ بند کرنے کے انتظامات کر لیئے اور اسی مقصد کے تحت اُس نے خندقیں اور مورچے کھدوا دیئے جو ہرات کے شمال مشرق میں کوہ دستان کی چراگاہ سے لیکر بُومُرغ (؟) گاؤں تک محیط تھے۔ ان میں چار ہزار سوار اور دس تا بارہ ہزار پیادہ فوج متعیّن کر دی گئی۔ پھر بھی ملک کیلئے حالات نامساعد تھے اور ایسے ہرات کے مذہبی پیشواؤں کے توسّط سے مشروط صلح کرنے ہی بنی۔ ملک معزّالدین نے شاہ ماورالنّہر کو اپنا حاکم بالا تسلیم کر لیا۔

یہ واقعات ۷۵۲ھ (۱۳۵۲ء) میں ظہور پذیر ہُوئے۔ ہرات میں غوریوں کی ایک سازش نے اُسے شہر سے نکل کر قلعہ امان کوہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور اُس کا صغیر ترین بھائی، ملک باقر مسند پر بٹھا دیا گیا۔ ۷۵۳ھ میں ملک معزّالدین ماورالنّہر روانہ ہُوا۔ اُس کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا اور ہرات واپس آنے کی اجازت دیدی گئی۔ اُس نے ملک باقر کو پکڑ لیا اور اپنا اقتدار دوبارہ قائم کر لیا۔

۷۵۹ھ (۱۳۵۸ء) میں اُسے امیر سیتل مش سے نبرد آزما ہونا پڑا جو کوہستان کا مالک تھا۔ ترک سردار امیر محمّد خواجہ سے بھی لڑائی ہوئی۔ دونو کے پاس زبردست لشکر تھے لیکن دونو ترک سردار کام آئے۔ اپنے ابتدائی دَور میں تیمور کے ملک حسین سے دوستانہ تعلّقات تھے اور جب اوّل الذکر ماورالنّہر کی فتح کیلئے گیا تو اپنے اہل و عیال اور بعض نمک خوار ملک کے پاس چھوڑ گیا۔

جب ملک معزّالدین حسین کو اپنا انجام نظر آنے لگا تو اُس نے اپنے بڑے بیٹے، ملک غیاث الدّین پیر علی کو اپنا جانشین مقرر کیا اور قلعہ سرخس بمعہ نواحیات اپنے دُوسرے بیٹے، ملک محمّد الملقّب بہ امیر غور داور اپنی بیوہ از قبیلہ اُرلاط کے نام لکھا۔ ملک معزّالدین حسین کرُت

پانچویں ذیقعد ۷۷۲ھ (۲۰ مئی ۱۳۷۱ء) کو خالقِ حقیقی سے جا ملا۔

ملک غیاث الدین پیر علی مسند نشین ہوا۔ اس نے ہرات کی فصیل مضبوط کی اور قلعہ بندیوں کی ایک نئی قطار بنائی اور یوں بیرون فصیل کی بہت سی عمارات اور باغات بھی اس کے حصار میں آ گئے لیکن اس کا رویہ تیمور سے زیادہ دوستانہ نہ تھا اور وہ بہت طاقتور تھا۔ بالآخر تیمور نے اس پر چڑھائی کی اور اواخر ۷۸۲ھ (۱۳۸۲ء) میں ایک لشکر جرار کے ساتھ جیحون کے اس پار آیا۔ ملک غیاث الدین کے بھائی ملک محمد نے اطاعت اختیار کر لی۔ اسوقت ملک غیاث الدین نیشاپور میں سربداریوں کیخلاف برسرپیکار تھا اور تیمور فوراً جام اور کوہ سویہ میں داخل ہو گیا تاکہ ان علاقوں کے جنگجو ملک کا ساتھ نہ دے سکیں۔

لیکن ہرات کی طرف بڑھنے سے پہلے تیمور نے قلعہ فوشنج سر کر لیا اور پھر شہر پر چڑھ دوڑا۔ نئی قلعہ بندیوں کے دروازۂ خارجۂ باب انصاری پر اہم ترین حملہ کیا گیا لیکن دو دن بعد ایک تیموری دستہ کوشک مرغانی کے قریب والے راستے سے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس راستے سے نہر انجل مورچوں میں داخل ہوتی تھی اور اس پر کوئی محافظ متعین نہ تھا۔ ملک نے اس نہر کے پل پر مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن بیرونی مورچے ٹوٹنے کے بعد اسے اندرون فصیل آنا پڑا۔ تیمور نے لڑائی سے اجتناب کرنے والوں کیلئے جاں بخشی کا اعلان کر دیا جس پر مزید مزاحمت ناممکن ہو گئی اور ملک کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اگلے دن وہ قلعہ اختیار الدین سے نکلا اور باغ زاغاں میں جا کر سر تسلیم خم کر دیا جو تیمور نے اپنا صدر مقام بنایا تھا۔

ہرات کی بیرونی دیواریں گرا دی گئیں شہر پر فدیہ عاید کر دیا گیا جو چار دن میں ادا کر دیا گیا۔ آل کرت کے جدی پشتی گوداموں اور خزانے پر قبضہ کر لیا گیا اور تیمور اسے اٹھا لے گیا۔ اس کے علاوہ مولانا نظام الدین کو حکم دیا گیا کہ وہ دو سو خاندانوں اور ان کے زیر کفالت افراد کے ساتھ شہر سبز میں منتقل ہو جائیں۔

قلعہ امان کوہ بھی تیمور کے حوالے کر دیا گیا جو ملک غیاث الدین کے چھوٹے بیٹے، امیر غوری

کے ماتحت تھا۔

۷۸۴ھ (۸۳ - ۱۳۸۲ء) میں قلعہ ترشیز اور مشہور قلعہ فلّات پر قبضہ کرنے کے بعد تیمور، ملک غیاث الدّین کرت اور دیگر معزز قیدیوں کو سمرقند[1] لے گیا۔ ملک فخر الدّین محمدؐ اور اُس کے بھائی

---

[1] سمرقند ترک اُردو کے قائد کار و آئی دار الحکومت تھا جسے ایرانی افراسیاب پکارتے ہیں۔ پرنسپل ای ڈینی سن راس نے اپنی کتاب "قلب ایشیا" کے حصّہ اوّل کے صفحہ ۱۱۵ کے ایک فٹ نوٹ میں لکھا ہے "روایات بتاتی ہیں کہ افراسیاب ۵۸۰ قم میں گذرا ہے" لیکن اس نے اس تاریخ کی کوئی سند پیش نہیں کی۔ اس روایت کے مطابق وہ میڈیائی بادشاہ، کے اخشریز کا ہم عصر تھا جو بعض کے مطابق ۵۸۴ھ میں فوت ہوا۔

ماوراء النّہر میں ایک شاہی خاندان موسومہ بہ افراسیابی ملوک برسر اقتدار رہا۔ ان کا صدر مقام سمرقند تھا۔ جسے منگول یلغار سے کچھ عرصہ پہلے خوارزم شاہ نے فتح کرلیا لیکن قراخطائی اور دیگر قبائل نے (جو چنگیز خان کی آمد آمد کا پیش خیمہ تھے) ان کے اختیار و اقتدار کو محدود کر دیا۔

افراسیابی ملوک ترک تھے جو مدّتوں سے مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے اور ان کے اسما و القاب عربی ہیں۔ بخارا فتح کرنے کے بعد چنگیز خان سمرقند کی طرف بڑھا اور آخر ذوالحجہ ۶۱۶ھ (آخر فروری ۱۲۲۰ء) میں یہاں پہنچا۔ چند دن کے محاصرے کے بعد جو بقول بعض پانچویں سے نویں تک جاری رہا۔ قاضئ شہر شیخ الاسلام اور دیگر علماء فقہاء (جو ملوک کے پرانے عمّال تھے) شہر سے باہر نکلے اور چنگیز خان کے مطیع ہوگئے۔ واپس آکر نماز گاہ یا عیدگاہ کا دروازہ کھول دیا اور منگولوں کو اندر داخل کر لیا۔

قلعہ پر حملہ کیا گیا جس میں سلطان محمد خوارزم شاہ کی فوج تعینات تھی۔ اسے سر کر لیا گیا اور فوج تہ تیغ کر دی گئی۔ یہ ۴ اپریل ۱۲۲۰ء کو ہوا۔ ایک منگول نگران سمرقند میں چھوڑ دیا گیا اور ایک مقامی مسلمان کو اُس کے تحت والئ شہر بنا دیا گیا۔ لہٰذا شہر تباہ نہ کیا گیا اور صرف قلعہ کی دیواریں وغیرہ ہی مسمار کی گئیں۔

آج تک موجودہ سمرقند کے پاس پرانا مقام افروسیاب موجود ہے۔ ۱۹۰۳ء میں مسٹر رپفے ییل پمپیلی کے تحت ایک امریکی مہم نے اس کا سرسری معائنہ کیا۔ اس کی مطبوعہ رپورٹ میں درج ہے کہ "یہ پختہ مٹی اور کھنڈرات کے ملبے کی بنی ہوئی سطح مرتفع ہے جو زیادہ تر مسلمان قبرستانوں سے بھری پڑی ہے اور اس سے کسی حد تک مسلمان پیشوں کا پتہ چلتا ہے اور کچھ ظرف پارے اور خشت پارے ملتے ہیں۔ میدان میں ایک ندی بھی بہتی ہے جس نے کئی گھاٹیاں بنا دی ہیں۔ سطح مرتفع کی پختہ مٹی اور تحت الزمینی چکنی مٹی میں تمیز صرف ظرف پاروں، ہڈیوں اور کوئلہ سے ہی ہو سکتی ہے۔ ہمیں یہ ظرف پارے سطح سے ۴۰ فٹ نیچے تک ملے اور اغلب ہے کہ ملبہ اور بھی زیادہ گہرا ہوگا۔ اس سطح پر قلعہ کی ڈھیری ہے جو مزید تیس یا چالیس گز اونچی ہے یعنی ندی سے ۱۷۰ فٹ بلند ہے ..... شہر کی سابقہ دیواریں اندرونی سطح سے بیس تیس فٹ اونچی گھاٹیوں کی صورت میں موجود ہیں۔ جہاں دیواریں آبی

کے بیٹوں نے تیمور سے بالمشافہ شکایت کی کہ ملک حسین اور اُس کے بیٹے ملک غیاث الدّین پیر علی کے ادوار میں اُنہیں وراثت سے محروم کر دیا گیا۔ اُن کا تپاک سے استقبال کیا گیا اور حکومت غور بڑے بھائی، محمدؒ کے سپرد کر دی گئی۔

۸۳-۱۳۸۲ء:-

۷۸۴ھ کے اواخر میں ہرات میں ایک انقلاب ہوا جس کی روح رواں غور کا ایک آدمی موسومہ بہ ابوسعید اسپہبد تھا۔ یہ غوری باچا، بھی مشہور تھا اور ملک غیاث الدّین نے اسے دس سال قید رکھا تھا لیکن تیمور نے ہرات پر قبضہ کے بعد اسے رہا کر دیا۔ ملک محمدؒ غور کے سرکش و خودسر باشندوں کے ساتھ غور سے آگے بڑھا جو اُس سے بھی زیادہ بیوقوف تھے۔ غوری باچا بھی اُن کے ساتھ مل گیا اور انہوں نے تیموری عمّال کو قلعہ اختیار الدّین میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا اور ان کے دستوں نے شہر میں ہر قسم کی بدعنوانیاں شروع کر دیں۔ ان غنڈوں کا ایک حصّہ قلعہ کے دروازوں پر آیا اور ان کے آگے لکڑی کے گٹھے اکٹھے کر کے اُنہیں آگ لگا دی۔ کچھ تُرک بچنے کی خاطر دیواروں سے کُود گئے لیکن ان بدمعاشوں نے اُنہیں قابو کر کے چُن چُن کر قتل کر دیا۔

شہزادہ میران شاہ ابن تیمور اُس وقت اپنے سرمائی صدر مقام پنجدہ (عرف عام میں پنڈی) میں تھا اور جب اُسے صورتِ حال کا پتہ چلا تو اُس نے امیر حاجی سیف الدّین اور امیر اک باغا کے تحت ہرات کو فوج بھیجی اور خود بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ جب یہ سالار وہاں پہنچے تو خیابان کی گلیوں میں غوری لشکر ملا۔ زور دار لڑائی ہوئی۔ غوری شکست کھا گئے اور ان میں سے کچھ شہر کے اندر

گذرگاہ نے کاٹ دی ہیں؛ وہاں دیوار کے ساتھ ساتھ برامدے ظاہر ہو گئے ہیں (ص ص ۱۱ تا ۱۲)۔ کھنڈرات کا محیط ۳ میل کے قریب ہے"۔ فتح چنگیزی کے بعد سمرقند تیمور کے ابتدائی ایام تک بلا دیوار و خندق شہر تھا۔ یہ ایک کھلا ہوا شہر یا بڑا گاؤں تھا اور اسے ان لوگوں نے بسایا تھا جنہیں چنگیز خان نے زندہ چھوڑ دیا تھا۔

تیمور نے سمرقند کو اپنا دار الحکومت بنایا، اس کی قلعہ بندی کی اور وہ عمارات تخلیق کیں جن کے آثار باقیماندہ آج بھی عجائباتِ عالم میں شمار کئے جاتے ہیں۔

بھاگ گئے۔ رات کو اُنہیں منتشر کر دیا گیا تو وہ علاقے میں اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ شہزادہ ہرات پہنچا تو بھگوڑوں کی تلاش کروائی اور اُن میں سے بہت سے مار دیئے گئے اور ان کے سروں کا مینار بطور عبرت کھڑا کیا۔

اس احمقانہ اور بے موقع شورش نے قیدی ملک اور اس کے خاندان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ کیونکہ تیمور نے خبر سنتے ہی ملک غیاث الدین پیر علی کو تہ تیغ کرنے کا حکم دیدیا جو اس وقت قلعہ سمرقند میں مقید تھا۔ اُس کا بھائی ملک محمد[۴]، امیر غوری، اور غوریانیوں کا سردار علی بیگ بھی انڈی جان میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے کیونکہ انہوں نے قلات پر حملہ کے وقت تیمور کا مقابلہ کیا تھا اور انہیں انڈی جان میں قید کر دیا گیا تھا۔ ملک کا بڑا بیٹا، پیر محمد جیل میں ہی سڑتا رہا۔ لیکن ہرات کے کُرت ملوک کا خاندان اس کے بعد ہمیشہ کیلئے اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔

اب صرف سیستان کے کیانی ملوک ہی رہ گئے تھے اور تیمور کا پنجۂ آہنی بہت جلد اُن کی طرف بڑھنے والا تھا۔ سبزوار پر سربداری حکومت کر رہے تھے اور خواجہ علی مؤید تیمور کا باجگزار تھا لیکن ملوک سیستان آزاد تھے گو کچھ عرصہ قبل وہ اسے حاکم بالا تسلیم کرتے تھے۔

۸۴ - ۱۳۸۳ء:-

۷۸۵ھ میں تیمور کی بڑی بہن قتلغ ترکان آغا فوت ہو گئی۔ بس اندوہ و غم کے علاوہ اُسے جتہ کے علاقے میں جنگ و جدل بھی کرنا پڑی لیکن اسی سال موسمِ خزاں میں اُسے مازندران پر توجہ دینے کا موقعہ ملا لیکن جب وہ مرغاب پہنچا تو معلوم ہوا کہ شیخ داؤد نے سبزوار میں بغاوت کر دی تھی، تابان بہادر قتل کر دیا گیا تھا اور شیخ نے اپنے آپ کو قلعہ بدر آباد میں بند کر لیا تھا جو ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا۔ گرم سیر کے نکودری اور اہل سیستان بھی بغاوت کیلئے پر تول رہے تھے۔ خراسان کی اس صورتِ حال کے پیش نظر تیمور نے مازندران پر حملہ کا ارادہ ترک کر دیا اور صرف ایک دستہ بھیج دیا، تاکہ امیر ولی کی نقل و حرکت پر نظر رکھے اور اپنی سرحد کی حفاظت کرے اور وہ خود اپنی فوج لیکر خراسان کو چلا۔

قلعہ بدر آباد بہت مضبوط تھا۔ یہ اسفزار (سبزوار) کی پہاڑیوں کے قدیم قلعوں میں سے ایک تھا۔ تابان بہادر کو فرمکان میں ایک تیر سے مار اگیا۔ شیخ داؤد یا بزبان روفستہ اجنٹ شیخ علی خطائی قلعہ بدر آباد کو بھاگ گیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس فعل کی ذمہ داری اس پر ڈالی جائے گی۔ پورا ضلع ایک عام بغاوت کی لپیٹ میں آ گیا کیونکہ فرمکان اسی کے اندر ایک قلعہ ہے۔ یہ بہت مستحکم تھا، اور اس کی تعمیر سلطان مسعود غزنوی سے منسوب کی گئی ہے۔

حکومت سبزوار شیخ داؤد کے سپرد کی گئی تھی اور تابان بہادر اُس کے دربار میں تیموری مفادات کا نگران تھا۔ سبزوار کی تسخیر ایک مہماتی فوج کے سپرد کر کے تیمور خود ہرات کی طرف بڑھا۔ ہرات کے معاملات کو سلجھا کر وہ سبزوار آیا۔ بدر آباد کو سر کر لیا گیا اور چھ ہزار قلعہ بند فوج نذر شمشیر کر دی گئی۔ اس کے بعد تیمور سیستان کیطرف روانہ ہو گیا۔

ملک فرح شاہ جلال الدین نے فوراً اطاعت قبول کر لی اور اسے تحائف دیئے گئے۔

"اور فرح سے میں نے سیستان کا رُخ کیا، اور اُک تیمور بہادر کو دلیر اور مخلص سپاہیوں اور سالاروں کے ساتھ بطور ہراول بھیجا اور اُسے حکم دیا کہ وہ ملک کو تہ و بالا کر دے۔ انہوں نے شہر سیستان تک کا سارا علاقہ فتح کر لیا اور وہ گندم کا بھاری ذخیرہ، بھیڑوں اور مویشیوں کے ریوڑ اور بے شمار غلام لیکر میرے ساتھ آ ملے۔ اُک میں نظم و نسق درست کر کے میں قلعہ زرہ پہنچا۔ اس کے مکینوں نے دروازے بند کر لئے اور مزاحمت کی۔ لہٰذا میں نے اپنے سالاروں کو قلعہ پر فوری حملہ کا حکم دیدیا تاکہ اس کی فوج کو آرام نہ مل سکے اور یلہ بول کر قبضہ کر لیا جائے۔ پس میری نمکخوار فوج نے ہر طرف سے ٹڈی دل کی طرح اس پر حملہ کر دیا۔ دیواروں کے پاس پہنچ کر سپاہیوں نے مورچوں میں شگاف ڈال دیئے اور اندر داخل ہو گئے اور دشمن کا قتل و غارت شروع کیا۔ لیکن قلعہ کے اندر پانچ ہزار آدمی ایسے بھی تھے جو تن بہ تقدیر ہو کر آخر دم تک لڑے، اور مارے گئے۔ فضل ایزدی سے یہ قلعہ کاروائی کے پہلے ہی دن مسخر ہو گیا۔ اس کے بعد میں اپنے توسن باد رفتار پر سوار ہوا، اور قلعہ سیستان کیطرف بڑھا، وہاں پہنچ کر اپنی فوج کو ذرا فاصلے پر

روکا، اور ایک دستہ لیکر ذاتی طور پر قلعہ کی قراولی کیلئے آگے بڑھا تاکہ رسائی کے راستے اور حملے کے امکانی مقامات دیکھ سکوں۔ میں ایک دروازے کی طرف گیا اور تھوڑا فاصلہ طے کرکے ایک تپّہ (ڈھیری) پر چڑھا جسے قُتلُق کہتے ہیں اور اس کی چوٹی پر ٹھہرا۔ میں نے حفظِ ماتقدّم کے طور پر دو ہزار کیل کانٹے سے لیس سپاہی کمینگاہ میں چھپا دیئے تھے۔ جب لوگوں نے مجھے اس ڈھیری پر دیکھا تو وہ میرے خوفناک عزائم کو بھانپ گئے اور ملک سیستان، شاہ قطب الدّین نے شاہِ شاہان اور تاج الدّین سیستانی[1] کو میرے حضور بھیجا۔ وہ دونوں اس کے معتبرین و معززین کے سردار تھے۔ جب وہ میرے حضور پیش ہوئے اور تعظیماً جھکے تو ملک قطب الدّین کا پیغام دیا کہ اگر میں امور و اہل سیستان پر نظرِ کرم کروں تو وہ مجھے میرے عمّال کے حسبِ منشا خراج ادا کرے گا اور ادائیگی میں ذرّہ بھر تاخیر نہ ہوگی۔"

سیستانی روایات کے مطابق جس شہر زاہدان پر تیمور نے قبضہ کیا اور جو اُس وقت دارالحکومت تھا اُس کے نقشہ پر ایک نظر سے ظاہر ہو جائیگا کہ زاہدان کی فصیل کے کھنڈرات کے جنوبی زاویہ کے پاس ہی وہ قدرتی ڈھیری آج بھی موجود ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس کا لفظ تپّہ، آج بھی سیستان میں مستعمل ہے اور اس کا اطلاق اسی جیسی دشت نما قدرتی ڈھیریوں پر ہوتا ہے یا تباہ شدہ عمارات کے ملبے پر! شرف الدّین علی یزدی کے بیان کے مطابق تیمور ریت کے ایک ٹیلہ پر چڑھا تھا لیکن یہ یقینی ہے کہ تیمور کے ہمراہ ملاءِ اعلیٰ کے حکّام اور ذاتی محافظ دستہ بھی تھے اور یہ ٹیلہ اتنا بڑا تھا کہ اس کی چوٹی اور پہلوؤں پر یہ سب سوار جمع ہو سکے۔ یہ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ شہر کے عین قرب و جوار میں ہی اتنے بلند ٹیلے موجود تھے جو قراولی کے لئے موزوں تھے۔ تیمور نے پورے

---

[1] مذکورہ تاج الدّین سیستانی ملوک سیستان کے خاندان میں سے نہ تھا۔ ممکن ہے وہ میران سیستان کا سربراہ ہو جن کے ورثا اب اُن دیہات کے کدخدا ہیں جن کا مرکز اسکل ہے، یہیں خاندان رہتا ہے۔ میر عباس مرحوم کا بڑا بیٹا اس حلقہ کا کدخدا ہے۔

اس کے دو چھوٹے بھائی دوسرے حلقوں کے کدخدا ہیں۔ مورثِ اعلیٰ [illegible] یدکا یہ خاندان واقعی اور عظیم قدامت کا مالک ہے!

شہر کا جائزہ لیا ہوگا اور جب وہ زاہدان کے اِرد گِرد کے باغات کی دیواروں سے آگے گذرا ہوگا تو وہ اُس قدرتی "تپہ" پر پہنچا ہوگا جہاں سے سیستانیوں کے مورچوں کا پورا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔

کھنڈرات کے مشرق میں خادنگ (ایک موجودہ گاؤں) کی سمت میں پہاڑوں سے آئی ہوئی تازہ زرین مٹی تک جہاں کہیں بھی گرمائی ہواؤں نے ریت کو اپنی جگہ سے ہلا دیا ہے تو قدیم نہروں، آبی گذرگاہوں اور احاطوں کی دیواروں سے بنے ہوئے بوسیدہ ڈھیروں (جو کسی گذرے زمانے میں باغات تھے اور اُن کے اِرد گِرد کیچڑ کی دیواریں تھیں) وغیرہ کے نشانات اُبھر آئے ہیں۔ خادنگ کی طرف یہ باغات شہر سے کم از کم نصف میل پرے تک پھیلے ہوئے تھے اور انہی کے اندر ان کے پہریداروں کے مکانات اور امیر لوگوں کے کاشانے اور طرب گاہیں بھی شامل تھے۔ سرائے سیاسنی اور مسجد کے درمیانی میدان سے شمال مغرب کی طرف سطح زمین ملبے سے ڈھکی پڑی ہے جو اصل میں کاشتکاروں کی جھگیاں یا جھونپڑیاں تھیں جو ان نہروں کے کنارے آباد تھے اور اس زمین پر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ مشرق کیطرف باغات و مکانات اس قدرتی ڈھیری یا "ٹبہ" تک آجاتے تھے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا اور مغرب کی طرف یہ ریت کے اُن ٹیلوں تک پہنچ جاتے تھے جو آج بھی زاہدان کے کھنڈرات کو نظروں سے اوجھل کر دیتے ہیں۔

باغات کی آبپاشی راجباہوں کے ذریعے کی جاتی تھی جو نہروں سے نکالے گئے تھے۔ زاہدان کے جنوب مشرق میں یہ نہریں دیواروں میں چھوڑے ہوئے شگافوں سے شہر میں داخل ہوتی تھیں جیسے نہر انجل ہرات کے نئے مورچوں میں داخل ہوتی تھی۔ اسی راستے کے کھلا رہنے کی وجہ سے شہر پر بیرونی قبضہ ہو گیا تھا جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا۔ زاہدان کی شہری دیواروں کے پرے جنوب مشرق کیطرف ایک طویل نالی کے نشانات موجود ہیں جو اُس اُرگ یا فراز کو کاٹتی ہوئی گذرتی تھی جس پر شہر ایستادہ تھا۔ اس نالی کے بیرونی سرے تک ایک نہر بھی بہتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یقیناً یہاں ایسے نالے بھی موجود تھے جو نہر کا پانی شہر میں لاتے تھے۔ زاہدان کے جنوب مشرق کیطرف زمین پر ہوا کا عمل دخل اتنا زیادہ ہے اور اس پر اتنی ریت جمی ہوئی

ہے کہ قدیم شہروں اور باغات اور انکی حفاظتی دیواروں کے نشانات تھوڑے ہی فاصلہ پر جاکر غائب ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ یقین سے کہاجاسکتا ہے کہ پرانی پون چکیاں اور عمارات کے کھنڈرات، جو برباد شدہ شہر کے مشرقی زاویہ پر واقع ہیں، زاہدان کے مضافات اور اس کے گرد کے باغات میں ہی شامل تھے۔

جب تیمور اس شام ڈھیری کی چوٹی پر چڑھا تاکہ وہ ان مورچوں کا معائنہ کرسکے تو کوئی چیز منظر میں حائل نہ تھی۔ باغات کی بہت اونچی اونچی دیواریں اناروں اور انگور کی بیلوں کو اپنے عقب میں چھپائے ہوئے تھیں جیسے کہ آج کل ہیں۔ البتہ شہتوت، سرو اور کوراگز کے بعض اشجار ایسے تھے جو ان دیواروں سے بھی بلند تھے۔

باغات کی حد بندی سے شہر کی طرف جانیوالے تنگ اور ٹیڑھے میڑھے کوچوں کے راستے غالباً بند کر دیئے گئے تھے اور ان کے شگاف کناروں اور خندقوں سے مسدود کر دیئے گئے تھے اور ان میں مسلح آدمی متعین تھے۔

ان باغات کے عقب میں زاہدان کی دیواریں اور مینار ایستادہ تھے جن پر شائقین، اور تماشائیوں کا ہجوم لگا رہتا تھا اور مزید بائیں طرف سرائے طاہری واقع تھی جس کی بیرونی قلعہ بندی بہت مضبوط اور بھاری بھرکم تھی اور اس کے مورچے اور برج بہت اونچے تھے۔ اس مجمع عمارات کے بلند ترین مینار پر (جہاں اب ملک قطب الدین کی دختر جمیل کا محلہ بتایا جاتا ہے) اس دن یقیناً کیانیوں کے امتیازی نشانات و اعلام لہرارہے ہوں گے۔

اس فیصلہ کن شام کو ایک ٹھٹھرتے ہوئے سورج کی کمزور کرنوں کی پیلی روشنی اس منظر پر پڑی ہوگی تو باغات، شہر اور محل کی دیواریں چمک اٹھی ہوں گی۔ یہ روشنی ان سپاہیوں کے آلات اور زرہ بکتروں سے ٹکرا کر واپس منعکس ہوئی ہوگی جو دیواروں کے آس پاس اکٹھے ہو کر ان سرداروں کو دیکھ رہے تھے جو باغوں سے پرے کی ڈھیری کی چوٹی اور اس کی ڈھلانوں پر بکھرا جارہے ہوئے تھے۔ فصیلوں اور شہر سے انسانی آوازوں کا ایک الجھا ہوا سا شور اٹھ رہا تھا جس میں جانوروں

کی آوازیں بھی مخلوط ہو رہی تھیں جو اُن بھگوڑوں کے تھے جو تیموری ہراول کے خوفناک حملوں سے پناہ لینے کے لئے شہر میں وارد ہوئے تھے۔

زرّہ کی قسمت کا اندازہ تو اس حملہ آور فوج کے ان سرداروں سے ہی لگایا جا سکتا ہے جو اس ڈھیری کی چوٹی پر اپنے گھوڑوں کو لگام دیئے ہوئے تھے۔

تماشائیوں کے اس مضطرب مجمع میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے تیمور کو پہلے سے دیکھ رکھا تھا اور وہ اپنے ناواقف ساتھیوں کو بھی اشارہ سے بتا سکتے تھے کہ تیمور کونسا تھا اور یہ کہ وہ سالاروں کے جمگھٹ کا مرکز تھا اور اُس جنگی گھوڑے پر سوار تھا جو تمام ممالک محروسہ کے اصطبلوں کا بہترین گھوڑا تھا۔ اصل میں امیر اعظم بحیثیت قائد اور جنگ آزما اتنی شہرت حاصل کر چکا تھا کہ وہ اپنے پیرووں کا مسجود بن گیا تھا اور مشرق قریب کی تاریخ میں تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہاد اسلامی کا پیکر مثالی قرار دے دیا گیا۔

فصیلوں کے ساتھ کھڑے ہوئے لوگوں کی نظروں سے اوجھل دو ہزار جنگ آزما سرتاپا مسلّح ہو کر ایستادہ تھے اور کسی بھی صورت حال سے نپٹنے کے لئے تیار تھے۔ ان کی خدمات کی فوراً ہی ضرورت پڑ گئی۔

مذاکرات کا آغاز ہی تھا اور تیمور ابھی ملک کے ارسال کردہ وفد کی عرضداشت سُن رہا تھا کہ سیستانی اس مختصر سی تیموری جمعیت کو دیکھ کر دیواروں کے عقب سے نکل پڑے۔ انہوں نے نہ ملک قطب الدین کے احکام کی پرواہ کی اور نہ ہی اُن سرداروں کی جو تیمور کے حضور میں پیش تھے۔ وہ حملے کے انداز میں اس ڈھیری کی طرف لپک پڑے گویا وہ تلوار کا فیصلہ چاہتے تھے۔

ملفوظات صاحبقران کے الفاظ میں "جب معاہدہ شکنی ظاہر ہو گئی تو میں نے محمد سلطان کو ایک چھوٹا سا دستہ دے کر روانہ کیا تاکہ وہ سیستانیوں کو کھلے علاقہ کی طرف کھینچ کر انہیں کسی ایسے مقام پر لے آئے جہاں وہ کمینگاہ کی فوج کی زد میں آ جائیں۔ میرے حکم کے مطابق محمد سلطان آگے بڑھا اور دشمن سے لڑنے لگا، اور لڑتے لڑتے بتدریج اس طرح پیچھے ہٹنے لگا کہ دشمن ان دو

ہزار سواروں کی زد میں آگیا۔ سیستانیوں نے سمجھا کہ محمد سلطان واقعی پسپا ہو گیا ہے تو وہ بےخوف و خطر کھلے میدان میں آگئے۔ اب دو ہزار سواروں نے گھات سے نکل کر یک لخت سیستانیوں پر حملہ کر دیا اور ان کی پسپائی کے راستے بند کر دیئے۔ سخت لڑائی ہوئی اور طرفین کے بہت سے آدمی کام آئے۔ اس بحران میں مَیں نے اپنے ذاتی دستہ کو بڑھنے کا حکم دیا اور اُس نے سیستانیوں کا صفایا کر دیا۔ اُن میں سے اکثر و بیشتر مارے گئے یا زخمی ہو گئے اور باقیماندہ بھاگ نکلے اور دروازہ بند کر کے شہر کے اندرونی مورچوں میں جا دبکے"۔

سیستانی زیادہ تر پیادے تھے اور وہ اپنے خنجروں کے ساتھ تیموری رسالہ کو اچھا خاصا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ لہٰذا تیمور اپنی فوج کے پاس واپس آیا جو رات کیلئے پڑاؤ ڈال چکی تھی اور اوقات تاریکی کے دوران سخت پہرہ مقرر کیا۔

اگلے دن تیمور نے زاہدان پر حملہ کیلئے اپنی فوج کی صف بندی کی اور اُس کے ڈویژن اپنی اپنی جگہوں پر قائم ہوتے گئے۔ اُن کی جنگی موسیقی بجتی رہی اور اُن کے نعرہ ہائے جنگ بھی بلند ہوتے رہے تاکہ قلعہ بند فوج کے حوصلے پست ہو جائیں۔ لیکن اُس دن کوئی معرکہ نہیں ہوا، اور فوجی اپنی بارکوں میں واپس آگئے جس کے اردگرد خندقیں کھود دی گئی تھیں۔

رات اندھیری تھی اور ۱۰،۰۰۰ (دس ہزار) سیستانی چپکے سے زاہدان سے نکل گئے ۔۔ تاکہ محاصرین پر شبخون مار سکیں، انہوں نے دیکھ لیا کہ امیر شمس الدین ابن امیر عباس اور رات خواجہ کے مورچے پر پہرہ سخت نہ تھا۔ چنانچہ وہ اس پر پل پڑے۔ یہ دونوں حملہ پسپا نہ کر سکے لہٰذا دشمن خندقوں کو پار کرتا ہوا خیمہ شاہی میں پہنچ گیا اور وہاں اس نے رسل و رسائل اور دیگر ضروریات کے جانوروں اونٹوں اور گھوڑوں کو زخمی کر دیا۔ یہ حملہ آور خیموں کے اندر پہنچ گئے تو تیموری فوجی بھی بیدار ہو گئے تھے اور چاروں طرف سے ان پر جھپٹ رہے تھے۔ ہر طرف سے دشمن پر تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی جو بالآخر بہت سی لاشیں چھوڑ کر پسپا ہونے لگے۔ تیموری نیزوں اور تلواروں نے خوب انتقام لیا اور ان میں سے مٹھی بھر ہی خستہ و شکستہ حالت میں واپس پہنچے۔

اگلی صبح تیمور نے اپنی فوج کو پہلے دن کی ترتیب پر ہی لاکھڑا کیا اور سارا دن دشمن کے حفاظتی مورچوں پر حملہ جاری رہا۔ اسی حرب وضرب کے دوران امیرزادہ علی ۵۰۰ سوار لیکر دشمن پر چڑھ دوڑا جو اس کے مقابل دروازے پر صف آرا تھا اور دشمن کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا، اور خود بھگوڑوں کو ساتھ لیکر اندر داخل ہوا۔ چاروں طرف سے سیستانی اس بہادر گروہ پر کود پڑے اور ایک خونریز لڑائی شروع ہوئی جس میں دشمن نے ان کی واپسی کا راستہ بھی مسدود کر دیا۔ لیکن امیرزادہ علی جان توڑ کر مقابلہ کرتا رہا اور دشمن کو بہت نقصان پہنچایا لیکن اُس کے سپاہی مارے جا چکے تھے یا زخمی ہو گئے تھے۔ دریں اثنا اک تیمور بہادر ایک ہزار سوار کے ساتھ ان کی مدد کیلئے دروازہ پار کر کے اندر آ گھسا تھا، اور امیرزادہ علی اور دیگر آدمیوں کو لیکر باہر نکل گیا۔ تیمور جو خود قلب لشکر کی کمان کر رہا تھا۔ اپنے ان افسروں کی بہادری پر بہت خوش ہوا، اور فوراً انہیں مبارکباد اور انعام واکرام دیا۔ قسمت کی نیرنگیاں دیکھ کر اور کامیابی کے امکانات کو موہوم پا کر شاہ قطب الدّین نے اپنے امرا۔ وزرا سے مشورہ کیا کہ تیمور کے حضور پیش ہو کر اپنی مملکت کو تباہی و بربادی سے بچا لینا ہی بہتر تھا۔ کچھ امرا اس سے کلی طور پر متفق تھے اور کچھ جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن شاہ قطب الدّین نے قلعہ سے باہر آ کر اپنے جھنڈے سرنگوں کر دیئے اور یوں قتل وقتال کا قصّہ کوتاہ کر دیا۔

"میرے سالاروں نے یہ صورتِ حال مجھے بتائی کہ جھنڈے سرنگوں کرنے کا مطلب یہ تھا کہ دشمن نے ہار مان لی تھی۔ میں ابھی اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ شاہ قطب الدّین کا سفیر میری دریادلی پر بھروسہ کرتے ہوئے میرے حضور پیش ہوا، تسلیمات بجا لایا، اور جنگ بندی کی درخواست کی۔ چنانچہ مَیں نے اپنی فوج کو مزید کاروائی سے روک دیا اور امیرزادہ علی کو بھیجا کہ وہ شاہ قطب الدّین کو اپنے ساتھ لائے۔ جب شاہ پہنچا تو وہ اپنے گھوڑے سے اُترا، اور دوزانو ہوا، لیکن میں نے اُسے دوبارہ سوار ہونے کے لئے کہا۔ پھر اُس نے اصل موضوع چھیڑا، اور اپنی بداعمالیوں کیلئے معافی مانگی۔ میں نے جواباً کہا کہ چونکہ وہ خود میرے سامنے پیش ہو گیا تھا جو اُس کی نیک نیّتی کا ثبوت تھا، لہذا میں نے سیستان دوبارہ اسے بخش دیا۔ اُس پر وہ از راہِ تشکر میرے حضور جھک گیا۔

اس پر میرے افسر اور سپاہی اس سے ہمکلام ہوئے اور اُسے مُبارکباد دی۔"

تیمور نے اب اپنا زرہ بکتر اُتار دیا، اور صرف اس کے نیچے پہنی ہوئی روئی کی بنڈی رہنے دی اور ایک گھوڑے پر سوار ہُوا اور صرف پندرہ محافظوں کے ساتھ وہ اپنی فوج کے بائیں ڈویژن کے معائنہ کے لئے رَوانہ ہُوا۔ لیکن اسنتے میں بیس یا تیس ہزار سیستانیوں نے اُس پر حملہ کر دیا۔ اُسے مجبُوراً قلبِ لشکر کی طرف لوٹنا پڑا، لیکن تیروں کی زد سے نکلنے سے پہلے اُس کا گھوڑا زخمی ہوگیا۔

شاہ قطب الدّین کو فوراً حراست میں لینے اور از سرِ نو جنگ شروع کرنے کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ زاہدان پر قبضہ کر لیا گیا، قلعہ بند فوج تہ تیغ کر دی گئی اور قتلِ عام بھی کیا گیا، حملہ آوروں کو بے پناہ مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔

"مَیں نے حکم دیا کہ سیستان کے قلعہ اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے اور ملوک و سلاطین ماضیہ کے خزائن و دفائن میرے حضُور پیش کئے جائیں۔"

عربی گھوڑے نسلی خچر، باختری اُونٹ اور دیگر بیش بہا مالِ غنیمت قبضے میں لے لیا گیا اور میرے ذاتی استعمال کیلئے وقف کر دیا گیا۔"

تیمور کئی دن تک سیستان میں ٹھہرا اور پھر قلعۂ بست کیلئے وادئ ہلمند کی طرف روانہ ہُوا۔ تنک اور بندِ رُستم کی تباہی کی گئی اور نتیجتہً آبادی کی بود و نبود کے سلسلہ میں بھی تبدیلی کی گئی۔

اگرچہ تباہی کے حال کے تحت شہرِ سیستان کا کوئی ذکر نہیں ملتا تاہم شجرۃ الملوک کا بیان اور زاہدان کی تباہی کی روایات غلط نہیں ہوسکتیں۔ تباہ شدہ شہر کا اندرونی حصّہ سڑتے ہوئے انسانی ڈھانچوں سے بھرا پڑا ہے جو شہر کی شمال مشرقی دیوار سے پَرے بھی ملتے ہیں اور دروازۂ بختیاری کے سامنے بھی۔[1]

---

[1] دروازۂ بختیاری زاہدان میں داخل ہونے کا بابِ عالی تھا جیسا کہ اس کے کھنڈرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے دروازوں کے کھنڈرات اتنے بھاری بھر کم نہیں ہیں۔
قلعہ کے دروازوں اور شہر کے دروازۂ بختیاری کے سوا دیگر دروازے تو محض دیواروں میں شگاف معلوم ہوتے ہیں۔

یہ اصل میں اُن لاشوں کے باقیات ہیں جو مسمار دیواروں کے نیچے بے گور وکفن ہی رہ گئی تھیں یا جلدی جلدی دفنا دی گئی تھیں اور اب ہوا کے عمل سے پیدا ہونے والے کٹاؤ سے منظر عام پر آگئی ہیں۔ زاہدان کی بلندی اور خشکی نے اُنہیں محفوظ رکھا ہے جو اپنی ہی اشتعال پسندی کی وجہ سے تیموری تلواروں کی نذر ہو گئے تھے۔

حکومت سیستان شاہی خاندان کے ہی ایک اور فرد شاہ شہاں کے سپرد کر دی گئی اور شاہ قطب الدّین معہ اہل وعیال سامرک میں جلا وطن کر دیا گیا اور علما وفقہا و قضاۃ فرج میں بھیج دیئے گئے۔ سیستان پر ماہِ شوال ۷۸۵ھ (دسمبر ۱۳۸۳) میں قبضہ کیا گیا۔

اس کے بعد یہ ایک آزاد سلطنت نہ رہا اور اگرچہ اس کے کیانی حکمران بحال کر دیئے گئے تاہم وہ صرف تیموری سلطنت کے نمائندے تھے لیکن امیر تیمور اعظم کی اس دنیائے فانی سے رحلت کے بعد سیستان کو تیموریوں کے ماتحت رکھنے کے لئے ایک اور حملہ اور قتلام بھی کرنا پڑا۔

احیاء الملوک کے مطابق شاہ قطب الدّین کو تیمور نے ٹھکانے لگا دیا۔ یہ واقعہ ایک اور پیچیدہ اور غلط روایت میں مذکور ہے جس میں تیمور اور اُس کے بیٹے شاہ رُخ کو خلط ملط کر دیا گیا ہے اور دونوں کو زاہدان کی تباہی میں شریک بتایا گیا ہے لیکن ملفوظات نہ صاحب قران یا ظفر نامہ دونوں شاہ قطب الدّین کو تختۂ دار پر لٹکائے جانے کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

ملک غیاث الدّین ہراتی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا لیکن اُس کی موت اس فتنہ و فساد کی وجہ سے ہوئی جو غوری یا چا اور ملک محمّد کرت نے برپا کیا تھا۔

زاہدان کے عبرتناک حشر کے بعد سیستان شاہ شہان کی حکومت کے تحت وفادار نہیں تو امن پسند ضرور رہا اور سیستانی فوج امیر اعظم کے جھنڈے تلے لڑتی رہی۔ زاہدان کے واقعہ کے پانچ سال بعد شاہ شہان نے سیستانی فوج کی خود قیادت کی اور تیموری فوج کے دیگر دستوں کے ساتھ سیرجان کا طویل محاصرہ کیا جہاں آل مظفر کے ابو اسحاق کے مملوک گودرز نے بہت طویل مزاحمت کی۔ لہٰذا کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ تیمور نے شاہ قطب الدین کو مار اہو اور نہ ہی اس کے سمرقند میں مرنے کا کوئی ذکر ہے۔ زاہدان پر قبضہ کے وقت وہ غالباً ابھی جوان تھا اور یہ بعید از قیاس نہیں کہ ۸۰۷ھ میں تیمور کی وفات کے بعد وہ سیستان واپس آیا ہو اور دوبارہ اپنی حکومت قائم کرلی ہو۔ احیاء الملوک کے مصنّف کا حافظہ قابلِ اعتبار تھا اور وہ ملک حسین شہید کی موت کیطرف کوئی اشارہ نہیں کرتا، وہی ملک جو روضۃ الجنت[1] کا ملک معز الدّین حسین ہے۔ اسے آج تک شہید کہا جاتا ہے لیکن احیاء الملوک کا مصنّف اس

---

[1] احیاء الملوک کی جانبداری ان حالات سے ظاہر ہو جاتی ہے جو اس میں ملک قطب الدّین اور ملک حسین ہراتی کے بیان کیے گئے ہیں جبکہ روضۃ الصّفا کے بیانات مختلف ہیں۔ احیاء الملوک کےمطابق ملک قطب الدّین بن شاہ رکن ایک طاقتور سردار تھا۔ اُس کے پاس ہاتھی بھی تھے اور ایک آزمودہ کار فوج بھی۔ روضۃ الصّفا کا بیان مندرجہ ذیل ہے "محرم ۷۴۱ھ میں مظفریوں نے کرمان پر حملہ کیا اور قبضہ کر لیا۔ ملک قطب الدّین والئ نیمروز نے ملک حسین ہراتی سے مدد مانگی تاکہ وہ کرمان پر قبضہ کر سکے۔ مؤخر الذکر نے ملک داؤد کو ایک غوری لشکر دے کر بھیجا تاکہ ملک قطب الدین کی مدد کر سکے۔ یہ لشکر دنوں کو چھپتے چھپتے اور راتوں کو سفر کرتے کرتے اپنی نقل وحرکت کو صیغۂ راز میں رکھتے ہوئے بالآخر کرمان سے چار فرسخ کے فاصلے پر پہنچ گیا اور کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ امیر مبارز کے ایک افسر نے اسے خوشناک کے گاؤں میں دیکھ لیا اور خبر دینے کیلئے کرمان کو بھاگا۔ اپنے پیروؤں سے مشورہ کرکے امیر مبارز نے کرمان خالی کر دیا اور ملک داؤد نے اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن امیر مبارز واپس آگیا اور کرمان کا محاصرہ کر لیا۔ غوریوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن بے سود۔ ملک قطب الدّین کمک لانے کے بہانے شہر سے نکل گیا اور ملک داؤد اور اس کے بیٹے کو تنگ آکر صلح کرنا پڑی۔ جمادی الآخر ۷۴۱ھ (نومبر ۱۳۴۰ء) کو اُسے خراسان جانے کی اجازت دے دی گئی۔ نیمروز کا یہ ملک قطب الدّین وہی ہے جس کو احیاء الملوک نے ۷۳۴ھ (۳۴-۱۳۳۳ء) میں

کے دورِ حکومت اور خاتمہ کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ نہ فہرست حکمرانان میں موجود ہے نہ شاہی شجرۂ نسب میں۔ مزید براں روایات اور شجرۃ الملوک سے پتہ چلتا ہے کہ ملک قطب الدّین نے قلعہ فتح بنوایا اور مؤخر الذکر کے مطابق شاہ رُخ نے اسے رہا کر دیا، اور حکومت سیستان پر بحال کر دیا لیکن اُس نے بعد میں اسی کے خلاف بغاوت کر دی۔

ملک حسین ہراتی کو جھانسہ دیتے ہوئے بتایا ہے۔ اگر ان سات سالوں میں کسی وبا نے اس کے ہاتھی اور سپاہی ختم کر دیئے ہوں تو اور بات ہے ورنہ اپنے اس پرانے حریف سے مدد لینا ناقابل یقین ہے۔
مظفریوں نے شیروانی ملوک کو نکال باہر کیا جن میں سے دو تین کرمان کے قراختائی حکمرانوں کے بعد میں ہوئے۔ بُراک حاجب نے ٦١٠ھ (١٢١٣ - ١٢١٤ء) میں اس خاندان کی بنیاد ڈالی، اور حبیب السیّر کے مطابق یہ اسی سال حکمران رہا۔ آخری شیروانی ملک قطب الدّین نیمروز تھا جس نے ٧٤١ھ میں کرمان امیر مبارز الدّین کے حوالے کر دیا۔ یہی مصنّف بتاتا ہے کہ ایک شیروانی ملک نے اپنی فوج میں بہت سے ہزارے اور افغان داخل کئے اور انہیں اپنی سرحدوں پر آباد کیا لیکن چونکہ یہ حکمران ان محافظینِ سرحد کو دبا نہ سکتے تھے لہٰذا وہ بخینت ہوکر ابرکوہ اور فارس میں تاخت و تاراج کرتے رہے۔

باب چہارم

ملک کو فتح کرنے اور ہلمند کا بند تباہ کرنے کے بعد تیمور ہلمند کے ساحل کے ساتھ قلعہ بست کی طرف چلتا رہا۔ اُس کے راستے میں آنے والی مختلف بستیوں میں سے اب کسی کی بھی نشاندہی نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ نام موجود ہیں تاہم وہ مقامات کُلّی یا جزدی طور پر نیست و نابود ہو چکے ہیں۔ ارباب سیف الدین جو سیستان کے قدیم مقامات اور ان کی روایات کے سلسلہ میں بہت دلچسپ لطیفے اور قصے سنا سکتا تھا، ۱۹۰۳ کی سردی میں وادی ہلمند میں جانیوالے مشن کے ساتھ نہ تھا۔ قلعہ کالا اور قلعہ سُرخ کے نام موجود ہیں لیکن میشن ہلمند کے کناروں کے ساتھ ساتھ کس کے کھنڈرات میں سے گذرا، اس کا کچھ فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

قلعہ کاکہ پر تیمور کو خبر ملی کہ نکودریوں نے وادی ہلمند میں اپنے سرمائی خیمے اکھاڑ لئے تھے اور وہ کیچ اور مکران کو روانہ ہو چکے تھے۔ ان بھگوڑوں کے تعاقب میں امیرزادہ میرانشاہ کے تحت ایک مضبوط فوج بھیجی گئی جس نے شبانہ روز سفر کر کے نکودریوں کو قاران[1] کی چراگاہوں میں ڈھونڈ نکالا۔ انہوں نے اپنی روایت کے مطابق صلح جوئی کی بجائے شمشیر آزمائی کا فیصلہ کیا۔ غالباً اس لئے بھی کہ سابقہ بد اعمالیوں کی یاد بہت بری طرح ان کے ضمیر پر

---

[1] قاران یا کاران ظفرنامہ اور ملفوظات صاحبقرانی دونوں میں خ سے لکھا گیا ہے۔ ہلمند کی طرف سے غالباً یہ وہ علاقہ تھا جس میں چاغی واقع ہے یا دریائے ماشخیل کا ڈیلٹا۔ خاران۔

حاوی تھی۔ بہرحال وہ لڑے، شکست کھا گئے اور ان کے سردار کا سر تعمیل حکم کے نشان کے طور پر تیمور کو بھیج دیا گیا۔ دریں اثنا تیمور ملک مائکنُو سے ملا جس نے بہت سال پہلے اُسے سیستان میں بری طرح زخمی کیا تھا۔ ملک نے اطاعت قبول کر لی تھی اور بہت سے تحائف بھی پیش کئے لیکن اس کا رنگ ڈھنگ مشکوک سمجھا گیا۔ تیمور کے اشارے پر ملک مائکنُو کو حضور سے فارغ ہوتے ہی پکڑ لیا گیا اور تیروں کی بوچھاڑ نے اُس کا قصّہ پاک کر دیا۔

تیمور کی زندگی میں سیستان میں کوئی اہم واقعہ نہیں ہوا، اور یہ والئ خراسان کے ماتحت رہا، جس کا دربار ہرات میں تھا۔

۱۸ فروری ۱۴۰۵ء۔

امیر تیمور اعظم ۸۰۷ھ میں فوت ہو گیا اور حسبِ معمول اُس کے ۳۶ جانشینوں میں اقتدار کے لئے رسّہ کشی شروع ہو گئی۔ لیکن فاتح عظیم کا واحد بیٹا، شاہرُخ میرزا بہت جلد اپنی آبائی سلطنت پر قابض و قادر ہو گیا۔ ۸۰۸ھ میں سیستان میں شاہ قطب الدّین حکمران تھا جو حاکم ہرات کا باجگزار تھا[1]

اسی سال حاکمِ سیستان (روضۃ الصّفا کے مطابق) نے اطلاع دی کہ جلال الدّین شاہ فرحی کے بیٹے علی شاہ اور غیاث الدّین شاہ خود سر اور بغاوت پسند ہو رہے تھے۔ چنانچہ شاہرُخ نے فرح کو ایک مہم بھیجی اور دونوں بھائیوں کو گرفتار کر کے سزا دی گئی۔

احیاء الملوک کے مطابق سیستان کے دو ملوک قطب الدّین نامی تھے لیکن یہ غیر اغلب نہیں ہے کہ وہ اصل میں ایک ہی ہو جسے تیمور نے پکڑا اور چھوڑ دیا یا جو فاتح کی موت کے بعد بچ نکلا۔

روضۃ الجنّت کا مصنّف ذکر کرتا ہے کہ ملک قطب الدّین محمّد نے کئی دفعہ بغاوت کی، اور شاہرُخ کے مطالبات زر و امداد کی مزاحمت کی لیکن وہ کوئی تاریخیں نہیں دیتا۔ البتہ روضۃ الصّفا

---

[1] ملک قطب الدین کیانی تیمور کے بعد رُونما ہونیوالے انتشار میں نکل بھاگا اور ہرات پہنچ کر شاہرُخ کے رحم و کرم کا طالب ہُوا۔

میں ہے کہ ۸۱۹ھ (۱۴۱۶ء) میں شاہرُخ فارس سے کرمان آیا تاکہ مقامی گڑبڑ کو ختم کر سکے لیکن وہ کرمان سے قدیم تجارتی راستے کے ساتھ ساتھ گرگ اور نصیر آباد کے صحرا سے ہوتا ہوا ہرات کی طرف چل پڑا۔ وہ سیستان سے بھی گذرا اور غالباً اسی موقعہ پر شیخ زین الملت والدین نے سفارش کر کے ملک قطب الدین کو حاکم بالا کے غیظ و غضب سے بچایا[1]۔

۲۲ - ۱۴۲۱ء:-

احیاء الملوک کے مطابق ۲۶ - ۸۲۵ھ میں شہر ریگِ رواں کی زد میں آگیا اور ملک علی نے ایک نیا شہر بسانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک علاقہ موسومہ بہ میرک پسند کیا جو میران میر عبداللہ کی ملکیت تھا۔ اُس نے اُسے خرید لیا۔ یہ جگہ زیت سے دُور اور ہلمند کے قریب تھی۔ یہ غالباً "قلعۂ فتح کے گرد وجود میں آنیوالے شہر کیطرف اشارہ ہے۔ جن کھنڈرات سے ٹائل کا ٹکڑا نکلا (جس پر ۸۳۱ھ کی تاریخ مندرج ہے) اب ریت کے نیچے دب گئے ہیں اور غالباً زاہدان کی تباہی و بربادی کے بعد عارضی دارالحکومت یہاں بنایا گیا۔ قلعہ فتح اب بھی دستبردِ ریگ سے محفوظ ہے اور اُس وقت بھی ہلمند کے قریب تھا۔

۲۸ - ۱۴۲۷ء:-

قلعۂ فتح کے آس پاس قلعۂ میر، دیہہ میرک اور میر آباد کے نام آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں۔ اس ضلع کو ہی میرک کہتے تھے کیونکہ یہ میر خاندان کے قبضہ میں تھا جس کا سردار عبداللہ تھا۔ سلطان شاہرُخ فوت ہوا۔ اُس کے سات بیٹے تھے جن میں سے چھ تو اُس کی زندگی میں ہی چل بسے تھے۔ بڑا اور واحد زندہ بیٹا ماوراء النہر کی حکومت پر خوش اور مطمئن تھا لہٰذا جنوبی علاقوں میں ان چھ مرحوم بیٹوں کی اولاد میں خوب رسّہ کشی ہوئی۔ تیمور کی فتح سے جو دھچکے لگے تھے،

---

[1] شاہرُخ نے سیستان پر حملہ کیا (مطلع السعدین) لیکن دارالحکومت قلعہ فتح ڈٹا رہا۔ شیخ الاسلام کی مداخلت پر شاہرُخ نے ہرات کا رُخ کیا اور ملک کو تاخت و تاراج کرتا اور ہلمند کے تین بندوں کو توڑتا ہوا گیا۔

سیستان آہستہ آہستہ ان کے نقصانات سے چھٹکارا حاصل کر رہا تھا اور شاہرخ کی موت کے بعد تو حاکم سیستان نے خود مختاری کا اعلان کرنے کا بھی حوصلہ کر لیا۔

۴۸-۱۴۴۷ء :-

۸۵۱ھ میں شہزادہ بابر میرزا ابن بیسنقر مرزا ابن شاہرخ ہرات کا حکمران بنا سیستان کے کیانی حاکم کی آزاد روی کو روکنے کے لئے بابر میرزا کو جلد ہی کارروائی کرنا پڑی۔ ملک معزالدّین حسین (جو مقامی روایات کا حسین شہید ہے) ایک تاریخی شخصیت ہے اور روضۃ الجنّت کے مطابق وہ سیستان میں خود مختار بن بیٹھا تھا اور اپنے نام کا خطبہ و سکّہ جاری کر دیا تھا جنمیں سے حاکم بالا کا نام حذف کر دیا گیا تھا۔ اُس نے قلعۂ فتح کو بھی بہت مستحکم کر دیا تھا۔ لیکن وہ لوگوں میں غیر مقبول ہو گیا۔ وہ ظالم تھا اور رعایا کو ظلم و جبر سے اپنا دشمن بنالیتا تھا۔ امراء وزراء کی تحقیر و تذلیل کی وجہ سے وہ بھی اس سے نالاں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی انقلاب میں شکست خوردگان کامیاب دعویدار کے ظلم و ستم کا نشانہ بن گئے تھے۔ اُس نے سکّے میں بھی تبدیلیاں کیں اور اس کا وزن ۱/۲ ۲ مثقال بڑھا دیا گیا لیکن اس کا کوئی سکہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

اُس کے خلاف بابر میرزا کی پہلی ذاتی مہم خاص کامیاب نہ رہی۔ امیر خلیل ہندوکہ اُس کا بہت بڑا حامی تھا اور وہ اُسوقت بادغیس تھا جہاں وہ اُلغ بیگ اور اس کے بیٹے عبداللطیف کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا تھا جو اُن کی سرحد پر فوج جمع کر رہے تھے۔ ملک حسین کو صلح پر آمادہ کر لیا گیا اور اُس نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ اچھے کردار کا ثبوت دے گا۔ اس نے شہزادہ کو تحائف بھی بھیجے جس نے انہیں غنیمت جانا اور وہ فوراً ہی شمال سے سر اٹھانے والے مہیب دشمنوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن ملک حسین اپنے وعدوں پر قائم نہ رہا اور حاکم بالا کے حقوق کو مسلسل نظر انداز کرتا رہا۔

جب شہزادہ بابر نے اپنے حالات کو کچھ وقت کے لئے سدھار لیا اور ۸۵۹ھ میں ہرات واپس آیا تو اُس نے امیر خلیل ہندوکہ کے تحت ایک فوج بھیجی تاکہ حاکم سیستان کو

ناک چنے چبوائے جا سکیں۔ لیکن ملک حسین نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور امیر کو کمک مانگنی پڑی۔ کمک امیران اویس ترخان، حسین، جاندار وغیرہ کے تحت بھیجی گئی اور امیر خلیل ہندوکہ نے ملک حسین کو شہر میں بند ہونے پر مجبور کر دیا اور شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی۔

سیستانی باہر نکلے اور کھلے میدان میں لڑے لیکن بہت نقصان اُٹھا کر شکست کھا گئے۔ ملک حسین زچ ہو کر اور عزّاتی ہوئی رعایا کی وجہ سے زرّہ کے جزیرہ میں پناہ گیر ہوا۔ اور جنگل میں چھپا رہا۔ یہ جگہ کوہ خواجہ تھی اور شہر اس کی ڈھلانوں پر بنا ہوا تھا گو اب وہ ایک کھنڈر بن چکا ہے۔ شہزادہ بابر نے سیستان کامیاب سالار کو بطور جاگیر دے دیا اور سیستان و زابلستان کے تمام سرداروں نے اپنے نئے آقا کو تسلیم کر لیا۔ لیکن ملک حسین کا بھی سیستان میں اثر و رسوخ تو تھا اُس نے ایک فوج اکٹھی کی اور دار الحکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ناکام ہو گیا اور اس کے پیرو تتر بتر ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد اُس کا سَر امیر خلیل ہندوکہ کے سامنے پیش کر دیا گیا اور یوں وہ اس باعزم لیکن بدنصیب شہزادے کے فکر سے آزاد ہو گیا۔

روضۃ الصفا نے ملک حسین کی موت کے تمام واقعات قلمبند کئے ہیں جو اُسوقت مشہور تھے۔ حالات سے مایوس ہو کر اور شکست کھا کر شاہ حسین اور اس کا بڑا بھائی شاہ قطب الدّین سیستان سے نکل پڑے اور صرف تین چار نمکخواروں کے ساتھ کیچ اور مکران کی طرف روانہ ہوئے۔ سفر کے دوران شاہ حسین نے ایک جذباتی اور منتقم ملازم سے گھوڑا لیکر اپنے چاہیتے ملازم کو دے دیا۔ ملازم گھوڑے سے محروم ہو کر بہت جز بز ہوا لیکن وہ اس ناانصافی پر غور کرتا ہوا قافلے کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ آدھی رات کا عالم تھا جب وہ پڑاؤ میں پہنچا اور ہر شخص تھک تھکا کر خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا، کوئی پہرہ دار نہ تھا، تاریکی بھی گھنبیر تھی۔ ملازم نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا، دونوں بھائیوں شاہ قطب الدّین اور شاہ حسین کے سَر قلم کئے اور انہیں بطور تحفہ و نذر امیر خلیل ہندوکہ کے پاس لے گیا۔

اس امیر کے پاس بہت سی جاگیرات تھیں جو ایک طرف کابل اور دوسری طرف قندھار کے ملحقہ اضلاع سے ہوتی ہوئی ہندوستان کی سرحدات تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سیستان میں اب بھی کیانی خاندان کے افراد کافی تھے اور ان کے معتقدین بھی تھے۔ لہٰذا لوگوں میں آزادی کی روح کچلنے کے لئے امیر خلیل نے اپنی خونخواری اور سفاکی کا خوب کھل کر مظاہرہ کیا۔ اُس نے سیستان میں قتلِ عام کروادیا۔ کبائر و صغائر سب تہ تیغ کر دیئے گئے حتیٰ کہ ملک ویران ہو گیا اور بدنظمی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ آبپاشی کو بھی سخت نقصان پہنچا، کیونکہ کاشتکار بھی دوسرے علاقوں کو بھاگ گئے۔

فرح اور سبزوار پر بھی یہ تباہی نازل ہوئی۔ ملوک سبزوار غالباً ختم ہو گئے تھے کیونکہ ان کا آخری ذکر صرف اسی وقت ملتا ہے جب ملک فخرالدین کرت نے ملک قطب الدین کو سبزوار سے ہٹا دیا اور اس کے بیٹے کو ہرات جیل میں ڈال دیا۔ لیکن ان کا ملک شاداب و خوشحال رہا حتیٰ کہ امیر خلیل ہندوکہ نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اُس نے بذاتِ خود یا اپنے عمّال کے ذریعے اسے نشانہ یورش بنالیا اور نو دفعہ شہر کو لوٹا۔ شہر کے اندر کا قلعہ ہمیشہ زیرِ مرمت رکھا جاتا تھا۔ بالآخر لوگوں نے اسے ایک دفعہ خالی دیکھ کر مکمل طور پر گرادیا۔ روضۃ الجنت کا مصنف (۸۹۸ھ ۹۳۰-۱۴۹۲ء میں رقمطراز) کہتا ہے کہ ماضی کے سبزوار کے بڑے بازار میں بارہ سو دکانیں تھیں جو شہر کے اندرونی حصّوں اور گرد و پیش کے اضلاع کی دکانوں کے علاوہ تھیں۔ اُس کے اپنے زمانے کی ویرانی حاکمِ وقت اور اُس کے چیلے چانٹوں کی دستبرد کا نتیجہ تھی۔

اہلِ سیستان کیطرح اہلِ فرح بھی اپنے موروثی ملک خاندان کے بہت معتقد تھے اور وہ امیر ہندوکہ اور اس کے حواریوں کے جور و ستم کو قبول نہ کرسکے۔ سیستان کی تباہی کے بعد امیر حسین جاندار والیٔ فرح بنا تو وہ سمجھ گیا کہ جب تک شاہ خاندان کا ایک فرد بھی زندہ رہے گا، لوگ اسے بدل و جان تسلیم نہیں کریں گے۔ لہٰذا اُس نے پورے خاندان کو نیست و نابود

کرنے کا سوچا۔ اِس مقصد کیلئے اُس نے دھوکے سے تمام افرادِ خاندان کو ایک اجلاس میں بُلایا اور پھر ان سب کو بہ یک اشارہ تہ تیغ کروا دیا اور یوُں مُدتوں پرانا خاندان یک بیک صفحۂ ہستی سے محو کر دیا گیا۔

"بتایا جاتا ہے کہ شاہوں کے قتلِ عام کے بعد امیر اویس ترخان نے امرائے فرح کو بلایا اور ان کے خدشات دُور کر کے ان تمام کو ترخان[1] بنانے پر رضامندی ظاہر کی لیکن مولانا محمّد شاہ فرحی نے اپنے اہلِ ملک کی طرف سے اس اعزاز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا"۔

مذکورہ تحریر کے وقت (۸۹۸ھ) مصنّف نے لکھا کہ اُسوقت اس خاندان کا ایک فرد ہنوز زندہ تھا۔ اُس کا نام شاہ سکندر تھا اور وہ انتہائی قلاّش تھا۔

اِس خاندان کا نمائندہ شاہ سکندر نیا ستگین کہلاتا تھا۔ وہ شاہ رُخ ابن تیمور کا ہمعصر تھا اور اکثر اپنے حاکمِ بالا سے اختلاف رکھتا تھا۔

مذکورہ مولانا محمّد شاہ شاید اسی خاندان کی اِس شاخ سے تعلق رکھتا تھا جس کے بانی نے بڑا ہونے کے باوجود تخت نشینی کے حق سے دستبردار ہو کر مذہبی زندگی اختیار کر لی تھی۔

امیر اویس ترخان خود بھی ویسی ہی بپتا کا شکار ہوا جیسی ملوک فرح پر پڑی تھی پچیس ماہ ربیع الثانی ۸۶۱ھ (۱۱ مارچ ۱۴۵۷ء) کو شہزادہ بابر میرزا کی وفات کے بعد اس کا گیارہ سالہ بیٹا جانشین ہوا۔ اُس کے مربّی مہیر شیخ حاجی نے ضروری سمجھا کہ ترخان امرا کا زور توڑ دیا جائے کیونکہ وہ اتنے دولتمند اور طاقتور ہو گئے تھے کہ اُن کی حمایت یا مخالفت ہراتی حکمران کی قسمت کا فیصلہ کر دیتی تھی۔ اُس نے یکم جمادی الآخر (۱۵ مئی ۱۴۵۷ء) کو تمام ترخان امرا کو ہرات کے قریب باغ زاغاں میں ضیافت پر بلایا اور جب وہ سب جمع ہو گئے تو اُن کو تہ تیغ کروا دیا۔ صرف امیر اویس ترخان کے پاس ایک خنجر تھا اور اُس نے امیر

---

[1] ترخان ماورالنہر کے قبائلی امرا کا ایک درجہ یا طبقہ تھا جس کے ساتھ کچھ مراعات وابستہ تھیں۔

شیخ حاجی کو زخمی کر دیا لیکن امیر اویس اور اُس کا بیٹا بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

ملوک فرح کا خاندان اب بھی موجود ہے۔ اقتدار سے محروم ہونے کے باوجود اہلِ خاندان زمینوں کے مالک ہیں اور یوں سیستان کے کیانی ملوک سے نسبتاً بہتر ہیں جن سے وہ عرصہ سے منسلک رہے ہیں۔

ملک بہاؤ الدین ابن ملک زینل (زین العابدین) اور اُس کا بھتیجا ۱۹۰۴-۰۵ء میں کابل سے واپس آئے اور ۱۹۰۵ میں گورنر فرح کے ساتھ سیستان بھی آئے۔ بھتیجا سیف الدین بھی ساتھ تھا۔

کہا جاتا ہے (گو اس کی صداقت میں کلام ہے) کہ فرح کی زمینیں شروع میں ملوک، ارابیب اور آغا زادگان میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ ملوک حکمران تھے لیکن دیگر دونوں طبقوں کے سردار بھی امورِ سلطنت میں اہل الرائے سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ آغا زادگان کو ان تینوں پر شرف حاصل تھا۔

آج کل ملوک افغانوں کے تحت ہیں۔ ان کی زمینیں بھی تھوڑی ہیں۔ ارباب چین اور ساخ کے دیہات اور قلعوں کے علاوہ فرح کے قریب بُستر کے بھی مالک ہیں۔

قلعہ کاہ کا ضلع ماضی میں فرح کی حدود میں تھا۔ پہاڑیوں کے دو سلسلے اسے دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ان کا رُخ شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف ہے۔ یہ مسلسل نہیں ہیں۔ جو حصّہ پہاڑیوں کے جنوب میں ہے وہ شعب کوہ کہلاتا ہے اور قلعہ کاہ کا علاقہ جوان کے شمال میں ہے 'پشت کوہ کہلاتا ہے۔

باشندے مخلوط ہیں۔ افغان غالب ہیں لیکن تاجیک، عرب، خواجہ (یا خوجہ) اور میر بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ شعب کوہ میں امام زید کا مقبرہ مقدس ہے جو ایک مسطح پہاڑی کی چوٹی پر ہے اور جس کی ڈھلانوں پر ریت کے دو تودے بھی ہیں۔ مزار کے متولّی شیخ ہیں جو ما قبل اسلام دور سے یہاں کے مقامی باشندے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کفار نے

اسلام کے ابتدائی دنوں میں امام زید کو قیدی بنا لیا تھا اور پھر چوٹی پر لاکر انہیں شہید کرنا چاہا لیکن امام موصوف نے غیبی مدد کے لئے دعا مانگی اور ریت نے انہیں چھپا لیا۔ شکار سے محروم ہو کر امام صاحب کے دشمن گھروں کو واپس چلے گئے لیکن ایک ٹولی چھوڑ گئے تاکہ مفرور کے ظہور پر توجہ رکھے۔ ان کی اولاد اب بھی پہرہ جاری رکھے ہوتے ہے۔ لیکن اب وہ اعدا کی حیثیت سے ظہور امام کے منتظر نہیں بلکہ ان کی زیارت کے متولّیوں کی حیثیت سے۔ روایات یہی ہیں۔

ریت کے تودے بعض آوازوں کے لئے مشہور ہیں جو اُن سے یا پہاڑیوں سے برآمد ہوتی ہیں اور کسی مافوق الفطرت طاقت سے منسوب کی جاتی ہیں۔ روضتہ الجنّت کے مصنّف نے لکھا کہ زائرین پہاڑی پر چڑھتے ہیں اور ریت کے تودے کی ڈھلان پہ پھسلتے ہیں اور پھسلتے ہوئے اس کی تہ تک پہنچتے ہیں اور آواز شروع سے آخر تک سُنائی دیتی رہتی ہے۔

سر فریڈرک گولڈ شمٹ کے مشن ۱۸۷۲ کے بیانات سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش ہے:
"کیپٹن لاوٹ وہ خوش قسمت انسان تھا جس نے اس آواز کو سُنا۔ اس کا تاثر ایسا تھا گویا ہوا ترنگ کا نوحہ ہو یا ایسی آواز جو متعدد تلغرافی تاروں کے ارتعاش سے پیدا ہو۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ آواز اکثر خاموش موسم میں سُنی جاتی ہے اور اُس وقت جب کوئی پہاڑی کے قریب نہ ہو اور یہ بھی عجیب و غریب بات ہے کہ تہہ پر ریت کی حد چوٹی سے گرتی ہوئی ریت سے بالکل متاثر نہیں ہوتی، گو پہاڑی اور ریت کے تودے کا رُخ بہت ڈھلوان ہے۔"

روضتہ الجنّت کے مصنّف نے بھی اس صورتحال کا ذکر کیا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ گرنے والی ریت معجزانہ طور پر واپس چوٹی پر پہنچ جاتی ہے۔[1]

---

[1] کابل کے شمال میں قریباً ۴۰ میل کے فاصلے پر ضلع پروان کی ایک ایسی ہی پہاڑی کے متعلق بھی ہوبہو یہی روایت مشہور ہے۔

ضلع شعب کوہ کی آبیاری ایک بڑی نہر کرتی ہے جو کوک شب نامی گاؤں کے عین نیچے فرح رود سے نکلتی ہے اور ایک قدرتی آبی گذرگاہ ہے۔ یہ نہر (یا پرانا دریائی پاٹ) شیخ محمودؒ کے مزار کے پاس سے گذرتی ہے۔ اس کے متعلق ایک قدیم توہم موجود ہے۔ اسے صفائی کی ضرورت نہیں ہوتی اور جب کبھی ضرورت ہو تو صرف اس کی تہہ کی زمین کو کھرچ کر پانی کے ساتھ بہہ جانے دیتے ہیں اور کبھی کھرچن کو کناروں پر نہیں رکھتے۔ پانی فراواں ہے اور ضلع کے تقریباً سارے دیہات کو سیراب کرتا ہے۔ یہ جُرگ نامی گاؤں پر ختم ہوتی ہے جو اس کے منبع سے ۵ فرسخ (قریباً ۲۰ میل) ہے۔ یہاں یہ بہت سی نالیوں میں بدل کر چراگاہ یا اُلنگ بن جاتی ہے۔

شیخ محمود کی زیارت بہت مشہور روضہ ہے اور تاجیک اس کے متولّی ہیں۔ یہاں "کوراگز" کے قریباً ۱۰۰ (ایک سو) اشجار کا جُھنڈ ہے جن کے تنے محیط میں ۱۵ فٹ بتائے جاتے ہیں اور درختوں کی اونچائی درگ کے درختانِ سرو سے بھی زیادہ ہے۔

روضۃ الجنّت کے مصنّف نے لکھا "فرح سے ایک فرسخ کے اندر بُرندک نامی ایک پہاڑی ہے جہاں ایک پایاب جگہ سے پانی قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے یہ اُن کی زیارت گاہ ہے جو اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتے ہیں۔ اس جگہ سے نیچے بیٹھ کر وہ لوگ اپنے ہاتھ پھیلا کر اپنی مرادیں مانگتے ہیں۔ اگر پانی کا ٹپکا بڑھ جائے تو وہ تکمیل خواہشات کا اطمینان لیکر واپس جاتے ہیں لیکن اگر ٹپکا نہ بڑھے تو اس کا معنی عدم تکمیل لیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کی دعاؤں کے دوران پانی اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ مسلسل بہاؤ کا سماں پیدا کر دیتا ہے۔ میں نے ایسے بہت سے لوگ دیکھے جنہوں نے یہ منظر دیکھا تھا۔ اور بعض تیرہ بخت لوگوں کی دعاؤں پر تو پانی بند بھی ہو جاتا ہے۔"

قلعہ کاہ کا قدیم مقام اب قریباً ایک ویران جگہ ہے۔ قدیم قلعے کے کھنڈرات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور اس جگہ کی سابقہ گنجائینت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے

کہ ۱۸ کاریزیں آج کل معطل ہیں اور صرف ۱۰ کاشتکاری کیلئے استعمال ہوتی ہیں۔
چنگیز خان اور تیمور کے حملوں سے جو نقصان ہوا وہ اس کی نسبت بہت کم تھا جو اُن کی
موت کے بعد اُن کے عیاش اور خود باختہ جانشینوں نے سلطنتوں کے لئے لڑ لڑ کر برپا کیا۔
تیموریوں کے سلسلہ میں یہ دور لاقانونی کچھ زیادہ ہی طویل تھا۔ شاہرخ کے پوتے پڑ پوتے
کسی نہ کسی سالار یا سردار کا آلہ کار بن جاتے تھے جو ان کو برسراقتدار لاتا تھا۔
شاہرخ میرزا کا پڑ پوتا سلطان سعید تیموری، ماوراالنہر سے بڑھ کر خراسان پر قابض ہو گیا اور
عراق اور مازندران کو بھی اپنے پنجوں میں دبوچ لیا۔
۸۶۴ھ (۱۴۶۹ء) میں سلطان سعید نے سیستان پر توجہ دی اور شاہ یحییٰ کو (جسے
روضنۃ الجنّت میں نظام الدّین یحییٰ پکارا گیا ہے) سیستان بطور جاگیر عطا کر دیا کیونکہ وہ شجاعت و
سخاوت میں اپنے ہم وطنوں اور خاندان سے افضل تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے بعض سرداروں کو حکم دیا
کہ وہ فوراً ایک زبردست لشکر لے کر سیستان جائیں اور اسے امیر خلیل ہندوکہ کے چنگل سے
چھڑائیں۔ کچھ فاصلہ طے کر کے ان سرداروں نے فیصلہ کیا کہ ان میں سے ایک امیر خلیل کے پاس
جائے اور اُسے تخویف و تحریص کے ذریعے سلطان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر آمادہ کرے۔
لیکن دریں اثنا مؤخرالذّکر کو مازندران جانا پڑا اور اُس نے سیستانی مہم کو واپس بلا لیا۔
سلطان سعید کو ہرات سے غائب دیکھ کر امیر خلیل نے پھر خود مختاری کا سوچا اور ہرات
پر بھی قابض ہونے کے خواب دیکھنے لگا۔ وہ ایک فوج لیکر بارھویں رمضان کو ہرات پہنچ گیا۔
ارد گرد کے علاقوں کے باشندے گھر بار چھوڑ چھاڑ کر شہر میں گھس گئے تھے۔ امیر خلیل کے پاس
فوج اتنی مختصر تھی کہ وہ صرف عراق، فیروز آباد اور خوش کے دروازوں کی ناکہ بندی کر سکا
لہٰذا وہ شہر پر قبضہ نہ کر سکا۔ اتنے میں خبر اڑی کہ سلطان سعید مازندران سے واپس آرہا
تھا۔ اس پر امیر خلیل کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، وہ ہرات سے سر توڑ بھاگا اور سیستان
کی حصر پر جا کر دم لیا۔

سُلطان سعید واقعی ہرات آرہا تھا اور جام پر اُسے ان واقعات اور امیر خلیل کے فرار کا معلوم ہوا۔ ہرات پہنچتے ہی اُس نے امیر خلیل ہندو کہ کے خلاف فوج بھیجی جس نے سیستان کے گرد و پیش کے علاقوں پر قبضہ جما لیا، لیکن فوج کا سالار باغی امیر کا پُرانا دوست تھا لہٰذا اُس نے امیر خلیل کو اطاعت و رزی پر آمادہ کر لیا۔ سلطان نے امیر خلیل کا پُرتپاک استقبال کیا، اُسے ارکان دولت میں شامل کر لیا لیکن اسے بلخ اور اس کے ارد گرد کے سرحدی اضلاع کا والی مقرر کر دیا۔ اور یوں سیستان اور اس کے ملحقات اس کے شکنجہ سے نکلے۔ لیکن امیر خلیل نے جو تباہی مچا دی تھی اس کا اثر یہ ہوا کہ ۸۹۸ ھ (۱۴۹۲ - ۹۳ ء) تک ملک ویران و غیر آباد رہا۔ پانی کی جس کمی کی طرف روضۃ الجنّت کے مصنّف نے اشارہ کیا ہے وہ اس لئے واقع ہوئی کہ نہروں اور بندوں کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا اور دریا اپنے پورے پانی سمیت بلا روک ٹوک ہاموں کے جنوبی سرے اور شیلا میں جذب ہوتا گیا۔

سیستان کو ملک نظام الدّین یحییٰ کی جاگیر تو بنا دیا گیا لیکن اس کا درجہ و دبدبہ اپنے آباؤ اجداد کے مقابلے پر برائے نام تھا۔

سُلطان حسین بیقرا کے عہدِ حکومت میں روضۃ الصّفا کے مُطابق امیر سُلطان ارغون حاکمِ سیستان تھا۔ اطلاع ملی کہ اس کے عزائم باغیانہ تھے لہٰذا شہزادہ ابن الحسین کو دو ہزار سوار دیکر اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔ اس پر سارا ارغون خاندان برافروختہ ہو گیا۔ ذو النّون بیگ زمیندا ور سے اور شجاع بیگ قندھار سے اپنے رشتہ دار کی حمایت کے لئے بڑھے۔ اس مجتمع ارغون طاقت کا مقابلہ شہزادے کے بس سے باہر تھا۔ اُنہوں نے اس پر حملہ کر کے اس کی فوجوں کو ہو کاٹ میں تتر بتّر کر دیا اور اُسے ملک سے نکال کر ہرات کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ وہ زخم رسیدہ اور ناکام ہو کر لوٹا۔ سیستان کے کیانی شہزادوں کا مرتبہ اس سے ظاہر ہے کہ اُن کے کوئی ایسے سکّے نہیں مل سکے جن پر اُن کے نام یا القاب ہوں۔ آشوب

زاہدان کے بعد بدنصیب ملک حسین کے سوا کسی ملک نے اپنے نام کے سکّے نہیں چلائے۔ کم از کم کوئی ایسا سکّہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ بعد میں ملک جلال الدّین نے تانبے کے سکّے ضرور چلائے لیکن وہ بہت کمیاب ہیں اور سونے اور چاندی کے تو سرے سے موجود نہیں۔

جب امیر اعظم کے جانشین روز بروز کمزور ہوتے گئے اور ان کا ستارۂ تقدیر از بک سردار شیبانی خان کے عروج سے گرہن میں آ گیا تو سیستان پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ارغونوں نے خراسان چھوڑ دیا۔ انہیں بالآخر قندھار بھی چھوڑ کر سندھ جانا پڑا، جہاں انہوں نے ایک قلیل المدّت خاندان کی بنیاد رکھی۔ شیبانی خان نے سلطان حسین بیقرا کے بیٹوں کو ۹۱۲ھ (۷-۱۵۰۶ء) میں شکست دی۔ سیستان کی دوسری طرف شاہ اسمٰعیل صفوی مغربی صوبوں میں اپنی طاقت مستحکم کرنے لگا۔ یہ دونوں اقتدار پسند سردار بہت جلد ایک دوسرے سے متصادم ہوئے اور از بک سردار کو ایک فیصلہ کن شکست ہوئی اور وہ مرو کے قریب ایک لڑائی میں ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں مارا گیا۔

شاہ اسمٰعیل کی شیبانی خان پر زبردست فتح اور شیبانی کی موت نے کچھ عرصے کے لئے خراسان کو از بک تاخت و تاراج سے محفوظ کر دیا۔ ہرات کو پھر اس صوبے کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ جس پر صفویوں نے قبضہ کیا تھا اور مشہد مقدّس وہ اہمیّت حاصل کرنے لگا جو موجودہ شیعہ مسلمان اس کا حق سمجھتے ہیں۔ صفویوں کے عزیز و اقارب کو خراسان میں جاگیریں دی گئیں جو اپنے نائبین کے ذریعے ان کا انتظام کرتے تھے۔ سیستان کو شہزادہ بدیع الزّمان میرزا کی ذاتی جاگیر قرار دیا گیا جس کا نائب استاجلو قبیلے کا ایک افشار معزّز تیمور خان تھا اور وہی حکم تا دھرتا تھا۔ اس کی سختی اور اس کے قبائلیوں کے تشدّد اور لالچ نے لوگوں کو بیزار کر دیا اور وہ اپنے سرداروں کے تحت یکبارگی اٹھے اور افشاروں کو سیستان سے نکال دیا۔ اس کے بعد مدّت تک کوئی ایرانی فوج یا عمّال یہاں نہیں آئے۔ اس کے بعد سیستانیوں نے میران سیستان کے

تحت کسی ایک قدیم شہزادے کو اپنا حاکم مقرر کرنے کا سوچا۔ کچھ بحث مباحثہ کے بعد یہ عہدہ ملک محمود کو پیش کیا گیا اور اس نے اسے قبول کر لیا۔ یہ ۹۸۶ھ (۷۹ - ۱۵۷۸ء) کا واقعہ ہے۔ لیکن ابھی وہ اپنی طاقت مضبوط بھی نہ کرنے پایا تھا کہ ایرانی حکومت کا مقرر کردہ گورنر جعفر سلطان آ پہنچا۔ اکثر سیستانیوں اور میروں نے ملک محمود کا ساتھ چھوڑ دیا اور نئے گورنر کا شایانِ شان استقبال کیا اور قلعہ فتح میں اسے مسند نشین کرا دیا۔ ملک محمود اور اس کے رفقا جزیرہ اور دیگر قلعوں میں چھپ گئے۔

جعفر سلطان ان وسائل سے محروم تھا جو قیام اقتدار کے لئے ضروری تھے اور چونکہ وہ پُر جوش استقبال کو مشکوک سمجھتا تھا لہٰذا وہ ہر ایک ملاقاتی سے بلا امتیاز ایک ہی جیسی شفقت و مروّت سے کام لیتا تھا۔ مسند نشین ہونے کے بعد اُس نے ملوک میں سے ملک غیاث الدّین محمدؒ اور میروں میں سے میر علی کو اپنے پاس رکھ لیا اور باقی سب لوگوں کو فارغ کر دیا۔ اُس نے ارابیب سے بھی دوستی کی جو شہر کے شمال کی زمینوں کے مالک تھے۔ بین النہرین اضلاع سے اُسے سامانِ رسد مہیّا ہوتا تھا۔

چھ ماہ بعد ملک غیاث الدّین فوت ہو گیا تو اُس کے رفقا و وابستگان نے رخصت چاہی تاکہ وہ اپنے خاندانوں اور قبائلیوں سے مل سکیں۔ اب ملک محمود کا گروہ بھی جرأت سے کام لینے لگا اور ایرانی گورنر کے خلاف زہر افشانی کرنے لگا حتیٰ کہ حزبِ مخالف اتنا طاقتور ہو گیا کہ کھلّم کھلّا مخالفت کا اظہار کرنے لگا۔ اور اپنی یورش و یلغار شہر تک پھیلا دی۔ دریں اثنا عباد سلطان بھی گرم سیر سے دو ہزار شاہی فوجیوں کے ساتھ جعفر سلطان سے آ ملا۔ دونو شہر سے نکلے تاکہ ان باغیوں کی گوشمالی کی جائے۔ اپنے ساتھی کی فوج کے علاوہ قریباً ایک ہزار رضا کار بھی اُس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔

ملک محمود بھی اپنے رشتہ داروں اور امرائے سیستان کی معیّت میں ایرانیوں اور ان کے حلیفوں کے خلاف روانہ ہوا، اور رہرمند پار کر کے طرفین کا مقابلہ اسی دریا کے کناروں پر

ہوا۔ جعفر سلطان کا گھوڑا زخمی ہو کر گر پڑا، اور وہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ کسی دشمن نے اس کا کام تمام کر دیا۔

ایرانی قلعہ فتح کی طرف بھاگے لیکن ملک محمود نے انتہائی فراست سے اپنے آدمیوں کو ان کے تعاقب سے روک دیا بلکہ ایرانیوں کو قلعہ فتح خالی کرنے اور اپنے سامان سمیت بلاضرر رخصت ہونے کی اجازت دیدی۔ اس کے بعد ملک محمود نے بہت شان وشوکت سے شہر پر قبضہ کیا اور مسند نشین ہوا۔ اُس کے کارنامے کی گونج خراسان کے کونے کونے میں پہنچی۔ لیکن وہ اس کامیابی پر مغرور نہیں ہوا بلکہ دربار شاہی میں سفیر بھیجا اور اپنے خلوص و وفاداری کا یقین دلایا۔

محمدؐ خان ترکمان جو بدیع الزّمان مرزا کے وقت سیستان کا نائب والی رہا تھا، اسوقت شاہی دربار میں ایک منصب جلیلہ پر فائز تھا۔ اس کے ساتھ ساز باز کی گئی اور اسی کی مساعی سے ملک محمود کے افعال کو نظر انداز کر دیا گیا اور اُسے حکومت سیستان بخش دی گئی۔

اُس کا دور حکومت ملک کے لئے مجموعی طور پر مفید اور منفعت بخش تھا لیکن رُوح العصر امن و امان کے کارناموں کے لئے سازگار نہ تھی۔ ملک کو اپنی گرفت مضبُوط رکھنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں سے بدرجۂ اتم کام لینا پڑا۔ وہ ایک سخت گیر حکمران تھا اور رہوتے ہوتے اُس کے خلاف ایک گروہ پیدا ہو گیا جو بالآخر اس کی موت کا سبب بنا۔ بدیع الزّمان مرزا کے پوت بھتیجوں نے اپنے والد سلطان حسین مرزا کی وفات کے بعد اُس کی جاگیر کے حصے بخرے کر لئے تھے۔ مرحوم سلطان کے بڑے بیٹے منظفر حسین مرزا کو قندھار ملا، رُستم مرزا کو زمینداور اور دو نوچھوٹے بیٹے جو رستم مرزا کے سگے بھائی تھے اُسی کے ساتھ رہائش پذیر رہے۔ دونو منظفر حسین مرزا اور رُستم مرزا اُن صفات سے عاری تھے جو مراتب اعلیٰ کے لئے وقت کا تقاضا تھیں۔ منظفر حسین مرزا الیس نام کا ہی حکمران تھا اور اصل اختیار اُس کے نائب حمزہ بیگ کے ہاتھ میں تھا جسے شاہِ ایران نے اِس عہدہ پر مقرر کیا تھا۔ یہ شخص اپنے مرحوم آقا سُلطان حُسین مرزا

کے بیٹوں کی سلطنت کو توسیع دینے کے لئے سیستان پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور ملک محمود کیانی کے ذرائع سے ناواقف تھا۔ وہ ایک فوج لیکر سیستان میں داخل ہوگیا۔

"جب وہ سیستان کے قدیم شہر میں پہنچا اور زرہ کے شمال میں دو فرسخ کے فاصلے پر اپنا پڑاؤ ڈال چکا تو اُسے جزائر کی طاقت اور جانبازوں کی تعداد کا اندازہ ہوا کیونکہ زرہ ملک محمود ملک زادگان اور امرائے سیستان کا گڑھ بھی تھا اور پناہ گاہ بھی!"

حمزہ بیگ نے سلامتی اسی میں سمجھی کہ اپنے آقا اور ملک محمود کی مرضی سے معاہدہ کرلیا جائے جس کے مطابق مظفر حسین مرزا کی شادی ملک محمود کی صاحبزادی سے ہونا قرار پائی اور ملک محمود کے بڑے بیٹے ملک جلال الدین کی شادی حمزہ بیگ کی بیٹی سے طے ہوئی۔ اس کے بعد مرزا واپس قندھار چلے گئے۔ جلد ہی مظفر حسین مرزا اپنی بے اہمیتی سے غیر مطمئن ہوگیا اور ایک سازش پر چشم پوشی اختیار کی جس کا مقصد حمزہ بیگ کا قتل تھا۔ مؤخر الذکر کو اس کا پتہ چل گیا اور وہ زمینداور بھاگ گیا اور رستم مرزا کو لے کر واپس آیا تاکہ اُسے مسندنشین کیا جاسکے۔ مظفر حسین ارغنداب کے کنارے پر شکست کھاکر قندھار بھاگ گیا۔ ایرانی عنصر کی مداخلت سے مظفر حسین مرزا کی اس کے نائب سے صلح کرادی گئی اور نائب نے اپنا عہدہ دوبارہ سنبھال لیا۔

تین سال بعد اس کیخلاف ایک اور سازش ہوئی تو حمزہ بیگ نے رستم مرزا کو مسندنشین کرادیا اور مظفر حسین کو قلعہ قلات میں نظر بند کر دیا اور اپنے داماد محمد بیگ (جو بیات قبیلہ کا سردار بھی تھا) کو نگراں مقرر کر دیا۔ ہزارہ جات کا مالیہ نظر بند کا گذارہ الاؤنس بنا دیا گیا۔ چھ ماہ بعد مظفر حسین نے قلات کی فوج اور داروغہ جبل کو اپنے ساتھ ملالیا اور ۳۰۰ بیات سپاہیوں کو لیکر صحرا کے راستے سیستان کو روانہ ہوا۔ ملک محمود نے مفرور کا بہت پرتپاک استقبال کیا، اُسے پوری توجہ دی اور اس کی منکوحہ بیوی بھی واپس کر دی۔ چھ ماہ تک مظفر حسین مرزا کے حاکم سیستان کے ساتھ تعلقات بہت دوستانہ رہے۔ بالآخر میران سیستان کے ایک

گروہ نے (جو ہمیشہ فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتا رہتا تھا) متلوّن مزاج مرزا کو اپنے میزبان سے بدظن کر دیا اور ایک دن شکار کا بہانہ کر کے وہ زرّہ کے شمال میں قلعہ تابزُون میں چلا گیا جو ملک کے خلاف میرانِ سیستان کا گڑھ تھا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر رام رودؔ[1] اور زرّہ کے تمام نقیب امرا اور میر اور نچلے طبقوں کے معتبرین اس کے گرد جمع ہو گئے۔ فوج سے قزلباش بھی آ گئے اور اس فوج سے اُس نے قلعہ چارُدنک (یا چارُونک) کا محاصرہ کر لیا۔ جو ملک محمُود کے چچا، ملک ناصر الدّین کی رہائش گاہ تھی۔

اس گڑبڑ کے وقت ملک محمُود دریائے ہلمند کے کنارے پر واقع رسالک[2] میں مقیم تھا اور جب مرزا اُسے چھوڑ کر گیا تھا تو اس وقت کوئی خادم بھی اُس کے پاس نہ تھا۔ بہرحال جُوں تُوں کر کے اُس نے اس تحریک کو دبانے کے لئے ایک لشکر اکٹھا کیا۔ اُس نے اپنے بیٹے جلال الدّین کو عمزاد بھائیوں، ملک محمود اور ملک شاہ حسین کے ساتھ اپنی قبائلی فوج دیکر روانہ کیا اور خود باقی لشکر کیساتھ پیچھے پیچھے چلا۔ ۶ مارچ ۱۵۸۲ء کی صبح کو قلعہ چارونک کے سامنے ایک زبردست لڑائی ہُوئی جس میں باغی ہار گئے اور میر جنگلوں اور جزیروں کو بھاگ گئے۔ ایک ہفتہ بعد ملک محمُود نے کچھ سادات کو مرزا کے پاس بھیجا اور انہوں نے دونوں میں صلح کرا دی۔

اسی وقت حمزہ بیگ نے مرزا کو قندھار آنے کی دعوت دی اور وہ ملک محمُود کے ایک عزیز کے تحت تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ اپنے دارالحکومت کو روانہ ہو گیا۔

---

[1] اس نام میں شک و شبہ کی گنجائش بہت ہی کم ہے لیکن دوسرے نام کسی حد تک مشکوک ہیں۔ تابزُون شاید تُرکون ہو۔ زرہ، گود زِرہ ہے۔

[2] اسے موضع رسالک کہتے ہیں، اس کا معنی ہے "کناروں کی زیر کاشت زمینیں"۔ اس لحاظ سے یہ اسم معرفہ نہیں۔ شجرۃ الملوک سے کوئی مدد نہیں ملتی کیونکہ نسخۂ سیستان میں ناموں کی املا نسخۂ عالم آرا سے بھی بدتر ہے جو اس حصّہ کے لئے زیرِ استعمال ہے۔

چھ ماہ بعد ملک کو اپنے داماد کے لیے تین ہزار سپاہیوں کا ایک اور دستہ اپنے عمزاد بھائی ملک عزت کے تحت روانہ کرنا پڑا۔

تھوڑا عرصہ بعد مظفر حسین مرزا ایک دفعہ پھر مفرور کی حیثیت سے سیستان آیا جسب سابق باغیوں کا آلہ کار بنا اور ملک کے خلاف ایک باغی لشکر کی قیادت کی۔ باغیوں نے پھر قلعہ جارونک پر حملہ کیا جسے ملک جلال الدین نے روکنے کی کوشش کی تو وہ دیہہ علی کے قریب شکست کھا گیا اور باغوں کی دیواروں کے پیچھے پناہ گزیں ہوا۔ لیکن اسی دن ملک محمود خود اس کی مدد کو آ پہنچا اور اگلی صبح ناصر الدین اپنے ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ جارونک سے باہر نکلا۔ باغی دو طرفہ حملہ سے شکست کھا گئے اور میر پہاڑوں اور جنگلوں کو بھاگ گئے۔ اس معرکے میں ملک کے تین سو اور دشمنوں کے ایک ہزار آدمی کھیت رہے۔ مرزا کی دوسری دفعہ ملک محمود سے صلح کرائی گئی اور وہ دو ماہ بعد قندھار چلا گیا۔ حمزہ بیگ کا قاتل اور اس کا جانشین، محمد بیگ بیات بھی اپنے آقا کی ایک سازش میں مارا گیا۔ اب مظفر حسین مرزا نے زمامِ کار خود سنبھالی اور اپنے محسن ملک محمود کیخلاف اُس کی رگِ انتقام پھڑکنے لگی لیکن خراسان میں ازبکوں کی بالادستی اور اس کے خطرات نے اسے اقدام سے باز رکھا۔

خراسان بہت سالوں سے ازبک شاہسواروں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا اور پورا صوبہ افراتفری کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ ہرات اور مشہد پر قبضہ کر لیا گیا تھا اور اہل یورش یزد تک پہنچ گئے تھے۔

اِن حالات میں فرح کے افشاروں نے رستم میرزا کو اس ضلع کی حکمرانی کی دعوت دی جو اُس نے فوراً قبول کر لی۔ اُس کا بیحد والہانہ استقبال کیا گیا۔ دو دن بعد اُس نے افشاروں کے سردار، بکان خان کو مار دیا اور اُس کی دولت اور اُس کے قبائلیوں کے مال و منال پر قبضہ کر لیا۔ بکان خان نے ہی اُسے دعوت دی تھی۔ ازبکوں کے ڈر کی وجہ سے قبائلیوں نے

اُف تک نہ کی۔ رستم مرزا اوزبکوں پر بھی بھاری ثابت ہوا، اور ایک موقعہ پر تو اُس نے اُن کے ۸۰۰ آزمودہ کار سپاہی مار ڈالے۔

رستم مرزا سیستان کو بھی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ملک محمود کو پتہ چلا تو وہ دس ہزار کا لشکر لے کر قلعہ چپ (یا چن؟)[۱] میں آکر جم گیا۔ یہاں وہ چھ ماہ تک ٹھہرا، حتیٰ کہ جمّ غفیر کی بود و باش سے وبا پھوٹ پڑی اور اس کی فوج تتّر بتّر ہوگئی۔

رستم مرزا نے اپنے پہنچنے آلہ کار ملک عبداللہ (جو فرح کے ملک خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو کیانیوں کے رشتہ دار تھے) کے ذریعے مذکورہ بالا ملک ناصر الدّین کیانی کے بیٹے، ملک ظریف کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ یہ نوجوان عقل اور اہلیّت سے بے بہرہ تھا لیکن بے حد اقتدار پسند تھا چنانچہ اُسے ایسے سبز باغ دکھلائے گئے کہ وہ اپنے رشتہ دار اور سردار ملک محمود کو مرزا کے حوالے کرنے پر راضی ہوگیا۔

ملک ظریف نے اسے تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے قلعہ جارُونک[۲] بلایا جب وبائی ایّام تھے اور ملک نے اپنے بیٹے جلال الدّین اور دیگر رشتہ داروں کے مشورے کےخلاف اس دعوت کو قبول کر لیا اور اپنے نوجوان عزیز کی خوشی کے لئے جارُونک روانہ ہوگیا۔

---

[۱] یہ نام شجرۃ الملوک سے لیا گیا ہے۔ نسخہ عالم آرا اسے صرف ایک قلعہ بتاتا ہے جس کے دائیں اور بائیں قلعہ بندی کی گئی تھی۔ میرے خیال میں یہ جُوین تھا لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

[۲] بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ فتح سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ میرے خیال میں یہ چکن سُر تھا لیکن یہ محض قیاس ہے۔ اگر یہ چکن سُر تھا تو یہاں سے زبیند اور کو سیدھا راستہ خاش سے گذرتا ہے مزید یہ اِل سوار فوج فرح سے دو دن میں چکن سُر پہنچ سکتی تھی۔ جارُونک یقیناً ایک کشادہ جگہ ہوگی جبھی تو ملک ناصر الدّین ایک ہزار آدمیوں کو ملک جلال الدّین کی مدد کے لئے اس کے اندر لے آیا۔ اگر یہ جگہ چکن سُر ہی تھی تو پھر رستم مرزا نے ہلمند نہیں بلکہ دریائے خاش عبور کیا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جارُونک وہاں ہو جہاں جُوین کے شمال میں تین چار میل کے فاصلے پر چار جوک کے کھنڈرات ہیں۔

رستم مرزا کو مطلع کیا گیا تو فوراً ایک انبار لشکر لے کر چل پڑا۔ ملک ظریف اور اس کے رفقار نے بھی احساسِ ندامت سے ۱۶ دن تک مقابلہ کیا لیکن آخر کار دشمن سے جا ملے۔ ملک محمود کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ غدّاروں کو اپنے کیفرِ کردار کی سزا ملی، کیونکہ انہیں حراست میں لے لیا گیا اور دو دن بعد ملک ناصر الدّین، اس کا بیٹا ملک ظریف اور اس کا خاندان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے لیکن ملک محمود اور اس کے ایک دو ساتھی قید میں رہے۔

ملک جلال الدّین اس سے پہلے ہی قلعہ فتح میں چلا گیا تھا جہاں ایک دستۂ فوج نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ بعد میں یہ محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

ملک شاہ حسین، اُس کے بھائی اور ملک علی نے سلاسل توڑ دیئے اور قید سے بھاگ نکلے۔ یہ سیستانیوں کے ایک گروہ سے مل گئے جو انہیں قید خانے کے آس پاس ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے بعد مہاجرین زرّہ گئے اور لوگوں کو حملہ آوروں کے خلاف اُکسایا حتیٰ کہ دس ہزار کا ایک لشکر تیار ہو گیا۔ ایک ہزار آدمی نے قلعۂ فتح کو محاصرہ سے آزاد کرایا اور یوں ملک جلال الدّین اپنے رشتہ داروں اور زرّہ کے جنگ بازوں سے آملا اور یہ سارا لاؤ لشکر رُستم مرزا کے خلاف حرکت میں آگیا۔

رُستم مرزا کو یہ پتہ چلا تو اُس نے ملک محمود کو ٹھکانے لگا دیا اور ہیرمند عبور کر کے سرایان (یا سرابان ؟) کی طرف چلا گیا تا کہ زمینداور پہنچ سکے۔ ملک جلال الدّین اور سیستانیوں نے اس کا تعاقب کیا اور پشت زادہ کے قریب رُستم مرزا کو رُکنا پڑا اور لڑنا پڑا۔ پہلے معرکے میں وہ ہار گیا لیکن اگلے دن پھر سرایان (یا سرابان) میں مقابلہ کیا اور بُری طرح ہار کر زمینداور کی طرف پسپا ہو گیا۔

شجرۃ الملوک کے مطابق ملک محمود ۹۹۵ھ (۱۵۸۷ء) میں قتل کیا گیا لیکن مذکورہ بالا بیان عالم آرائے عبّاسی سے ماخوذ ہے جس میں اس واقعہ کی کوئی تاریخ درج نہیں ہے اور مسوّدے میں بعض ناموں کی املا بھی مشکوک ہے۔

سیستان سے رستم مرزا صفوی کے اخراج کے بعد ملک جلال الدین کو متفقہ طور پر اس کے اہل خاندان اور کبائر سیستان نے ملک محمود کا جانشین منتخب کر لیا۔ اس کی حکومت کے ابتدائی سال مشکلات سے بھرپور تھے۔ اوزبک ہر جگہ زور پکڑ چکے تھے اور خراسان کو عبداللہ خان دوئم کی سلطنت میں شامل کرنے کا منصوبہ بن رہا تھا۔ عبداللہ خان موصوف محمد شیبانی خان کے والد عبدالخیر کے خاندان کا آخری سے پہلا حکمران تھا جو ماوراالنہر پر حاوی تھا۔

سیستان ان حملہ آوروں کی زد میں تھا اور بہت عرصے تک اوزبکوں اور ملک جلال الدین کی رعایا کے درمیان آویزش جاری رہی۔ ملوک قلعوں اور قصبوں پر قابض رہے۔ جہاں سے وہ اوزبکوں کا مقابلہ کرتے تھے لیکن مؤخر الذکر نے کئی علاقے حاصل کر لئے تھے اور قلعہ فتح پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ اگرچہ ملک جلال الدین اس کشمکش میں ہمیشہ ناکام نہیں ہوتا تھا تاہم حملہ آوروں کا پلڑا بھاری تھا لہٰذا اس نے اہل و عیال قلعہ فتح کے اندر اپنے خدام کے سپرد کئے اور خود براستہ کرمان دربار شاہی میں پہنچا۔ وہ ۱۰۰۵ھ (۹۷-۱۵۹۶ء) میں یہاں آیا۔ اس کا حسب مرتبہ استقبال کیا گیا، شہنشاہ نے اس پر بہت سی خصوصی عنایات کیں اور وہ کچھ عرصہ دربار میں رہا۔ بالآخر اس نے اپنے بچوں اور ملک کی جدائی سے مجبور ہو کر واپسی کی اجازت مانگی اور وہ سیستان روانہ ہوا، وہاں پہنچ کر اُسے معلوم ہوا، کہ عبداللہ خان دوئم والیٔ بخارا نے ثانی بیگ سلطان کے اخلاف کو حاکم سیستان بنایا تھا اور فتح نیمروز بھی انہی کے سپرد کی تھی اور انہوں نے ملک پر مکمل غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ ملک جلال الدین اوزبکوں کی طاقت کا مقابلہ کرنے کا اہل نہ تھا لیکن وہ ان کی اطاعت بھی قبول نہ کر سکتا تھا کیونکہ شاہ ایران نے اس کی بحالیٔ اقتدار کے لئے بنفس نفیس خراسان کی طرف کوچ کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ ان حالات میں ملک نے اپنے غلام، اہل خاندان اور ساز و سامان لیکر قندھار کا رُخ کیا جہاں وہ کچھ عرصہ رہا۔ اُس نے اپنے خاندانی دشمنوں، مظفر حسین اور اس کے بھائی رستم مرزا کے تعاقب میں ہندوستان جانے کا بھی سوچا۔ لیکن عین اُسوقت اُسے شاہ کے خراسان آنے کی خبر

ملی خراسان کو ازبکوں سے چھڑانے کے بعد ملک جلال الدّین (جو فوراً شاہ کے حضور میں پہنچ گیا تھا) کو خان کا لقب دیدیا گیا اور ۱۰۰۶ یا ۱۰۰۷ھ (۹۸-۱۵۹۷ یا ۹۹-۱۵۹۸ء) میں اسے حکومت سیستان بھی بخش دی گئی۔

ازبکوں کی مشرق کی طرف مسلسل پیش قدمی نے مظفر حسین اور رستم مرزا کو ہندوستان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُن کے پیروؤں کا خالص قزلباش یا ایرانی عنصر کئی سال کی لڑائیوں سے تعداد میں بہت گھٹ گیا تھا۔ دونو بھائیوں کو اکبر اعظم کے دربار میں معززانہ پناہ مل گئی۔ اکبر نے شاہی بیگ خان کابلی کو روانہ کیا کہ وہ مظفر حسین میرزا سے قندھار کا قبضہ لے لئے اور یوں یہ صوبہ بمعہ زمینداور اور ہزارہ جات شاہان ہند کے تصرّف میں آگیا۔

قندھار کے لئے شاہان ہند و ایران میں وقتاً فوقتاً جو کشمکش چلتی رہی اس میں سیستان اپنے محل وقوع کیوجہ سے کاروائیوں کا ایک اڈہ بنا رہا۔ اسی لئے ملک جلال الدّین کی نقل و حرکت کی باقاعدہ اطلاع شاہان ہند کو دی جاتی تھی اور اس کا نام دہلی کے شاہان تیموریہ کے روزنامچوں میں ملتا ہے۔ ملک جلال الدّین کے بعد اس کا دُوسرا بیٹا ملک حمزہ جانشین ہوا۔ وہ ایک شفیق حکمران تھا اور اس کا نام سیستانی روایات میں نہایت عزّت سے لیا جاتا ہے۔ گمبند سُرخ یا شاہی مدرسہ (جس کے کھنڈرات قلعہ فتح کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے پرے واقع ہیں) کی مرکزی عمارت کے اندر اس کا مقبرہ تھا اور وہ مدّتوں لوگوں کی زیارتگاہ بنا رہا۔ ہوتے ہوتے زائرین کے چڑھاوے اتنے زیادہ ہوگئے کہ عمارت کا اندرونی حصّہ ڈنڈوں اور گٹھوں اور انباروں سے بھر گیا جن پہ زائرین اپنے رومال یا ملبوسات دریدہ لٹکا دیتے تھے۔ عجیب وغریب شکلوں کے پتّھر، قدیم سنگتراشیوں کے نمونے اور عمارتی پتّھر کے ٹکڑے ایک ڈھیر بن گئے تھے حتیٰ کہ پچیس تیس سال پہلے ان عمارات میں دفینوں کے قصّے مشہور ہوگئے اور ایک فقیر 'سارٹر' نامی جو نسلاً شیخ تھا اور افغانوں کی عقیدت کا مرکز تھا جو وادی ہلمند میں اکثر آتے جاتے تھے، ان کے لالچ میں سرگرداں رہا۔ ملک حمزہ شیعہ تھا اور

نفیر سارٹر نے اپنے لالچ اور سنّی عقائد کی وجہ سے ملک حمزہ کے مزار پر ڈنڈوں کے گٹھوں کو آگ لگا دی اور اپنے مریدوں سے زمین کھدوائی اور دیواریں بھی نیچے گروا دیں تاکہ دو خروار سونا چاندی اسے مل سکے جو یہاں مدفون بنایا جاتا تھا۔ اُسے کچھ نہ ملا لیکن عمارات کی تباہی مکمل ہو گئی۔

ملک حمزہ خان لاولد فوت ہوا۔ وہ ۱۰۲۸ھ سے ۱۰۵۵ھ (۴۵ - ۱۶۱۹ء) تک برسر اقتدار رہا۔ اس کا بھتیجا ملک نصرت خان اس کا جانشین بنا اور ۱۰۸۵ھ (۱۶۷۴ء) تک حکومت کرتا رہا۔ اس کا جانشین اس کا چھوٹا بیٹا ملک جعفر خان ہوا جس کا دَور ۱۰۸۵ تا ۱۱۰۴ھ (۹۲ - ۱۶۷۴ء) تھا۔ اس کی والدہ شاہ کے خاندان سے تھی لہٰذا اسے بڑے بھائی ملک فتح علی خان پر فائق سمجھا گیا۔ بھائی کی وفات پر ملک فتح علی خان کو بھی حکومت کا موقع مل گیا اور وہ ۱۱۰۴ھ سے ۱۱۳۴ھ (۲۲ - ۲۱ - ۱۶۹۲ء) تک حکمران رہا۔ اس کے دَورِ حکومت میں قلعہ فتح کو مستقلاً خیرباد کہہ دیا گیا اور دارالحکومت ہلمند کے شمالی ڈیلٹا میں کُندرک کے مقام پر منتقل کر دیا گیا۔

ملک جعفر خان کا ایک بیٹا تھا اسداللہ خان جس نے تخت و تاج پر اپنا حق جتلانے کی ایک ناکام کوشش کی اور پھر دربار شاہی میں چلا گیا۔

نوٹ:

جب علی مردان خان نے ۲۲ مارچ ۱۶۳۸ء کو قندھار مغلوں کے حوالے کر دیا تو ملک حمزہ خان صوبیدار قندھار، قیچ خان سے گفت و شنید کرنے لگا کیونکہ وہ سیستان پر بھی اپنے آقا کا جھنڈا لہرانا چاہتا تھا۔ اس وقت تاریخ ہندوستان میں قوت کی تجدید شروع ہو گئی تھی اور شاہ صفی کے ظلم نے نہ صرف والیٔ قندھار کو بیزار کر دیا تھا بلکہ دیگر صوبیداروں کو بھی بدگمان کر دیا تھا۔ یوں یہ وقت مغلوں کی پیش قدمی کیلئے سازگار بھی تھا، اور کامیابی کا آئینہ دار بھی!

اس وقت صوبہ قندھار ہلمند پر واقع خواجہ علی تک محیط تھا اور خانشی (موجودہ خانشین) اس طرف کا سرحدی ضلع تھا۔ یہ ضلع عزت خان کے تحت تھا جو قلعہ بست کی زمینوں کی فوجی جاگیر کا مالک تھا۔ اسی وقت خانشی ابدال (غالباً ابدالیوں کے سردار کے معنی میں) کے تحت تھا جو صوبہ کی نصف زمینوں کا مالک تھا اور قلعہ خانسی (غالباً لنڈی محمد امین خان کا تباہ شدہ قلعہ) میں رہتا تھا۔ یہ شخص ملک حمزہ کو خانشی پر قبضہ کرنے

کے لیے اُکساتا رہا تھا اور صوبیدار کے حضورِ شاہ میں جانے کے بعد قلعہ بست کو سَر کرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ ملک حمزہ خان نے نہایت دانشمندی سے ابدالی سردار کی ان باتوں پر کان نہ دھرا۔ حتیٰ کہ ایرانی دربار میں اس کے ایک دوست نے اسے اطلاع دی کہ شاہ ایران کو اُس کے قندھار کے مغل والی سے تعلقات کا پتہ چل چکا تھا اور اس ظالم کے شاہی غیظ و غضب سے بچنے کے لیے اُسے فوراً اپنی وفاداری کا اعلان کر دینا چاہیے۔ لہٰذا ملک حمزہ نے ابدالی کی دعوت سے فائدہ اٹھایا اور خالنشی پر قبضہ جما لیا۔

اس پر انتقامی مہم روانہ کی گئی اور ڈیڑھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہندوستانی فوج نے خالنشی دوبارہ حاصل کر لیا۔ اور سیستانیوں کو ہلمند کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے بعد فاتح فوج سیستان میں داخل ہو گئی اور بہت سی بستیاں اور ہلمند کا بند تباہ کر گئی۔ بند پر ہی ملک کی خوشحالی کا انحصار تھا اور اس کے ٹوٹنے سے سارا پانی نشیبی اضلاع کو بہہ گیا اور سیستان کا بالائی حصّہ ویران و بے آب رہ گیا۔

ملک حمزہ قلعہ فتح میں بند ہو گیا جو اس کا دارالحکومت تھا اور ہندوستانی مہم اس کے نواحیات میں اپنی من مانیاں کر کے قندھار واپس چلی گئی۔ یہ مہم ۱۶۳۹ کی اواخر خزاں میں ہوئی اور کارروائیوں کی روئیداد شہنشاہ شاہجہاں کے سامنے ۲۲ دسمبر ۱۶۳۹ کو پیش کی گئی۔ ابدالی چونکہ بنائے فتنہ تھا لہٰذا اُسے سزا (سزائے موت) دی گئی۔

بادشاہ نامہ، ببلیوتھیکا انڈیکا، ص ص ۱۷۰ تا ۱۷۳۔

۱۷۱۵ء میں میرویس غلزئی نے ایرانی جوا اُتار پھینکا اور سیستان و فرح پر قابض ہو گیا۔ ۱۹-۱۷۱۸ء میں ایک ملک جعفر کیانی قندھار میں نظر بند تھا۔ تواریخ کے فرق کی وجہ سے یہ غیر اغلب ہے کہ وہی متن کا ملک جعفر ابن ملک نصرت خان تھا۔ سیستان پر افغان غلبہ کی وجہ سے ہی غالباً ملک حسین اور ملک محمود (ص ۸۰) اور اسد اللہ ابن ملک جعفر ابن نصرت خان نے سیستان کو خیرباد کہا۔ اوّل الذکر طُون چلے گئے اور آخر الذکر اصفہان کو۔ ہرات میں غلزیوں اور ابدالیوں کی دشمنی اور سیستان میں غلزیوں (جو ایرانی حکومت سے باغی تھے) کے نفوذ نے غالباً بعد میں ملک محمود کو اپنے ہمسایوں یعنی ابدالیوں سے دوستانہ تعلقات کے فیصلہ پر مجبور کیا۔

باب پنجم

تیمور کی فتح سیستان کے بعد کے طوفانی دَور میں کیانی بہت حد تک کمزور ہو گئے اور سیستان میں آباد کار قبائل کے سردار یا نمائندے بتدریج زور پکڑتے گئے اور بالآخر موروثی خاندان ملوک پر سبقت لے گئے۔

ملک فتح علیخان کے دو بیٹے زندہ رہے۔ محمد حسین خان اور محمود۔ اوّل الذکر اپنے باپ کا جانشین مقرر ہو چکا تھا اور وہ شاہی دربار گیا اور کچھ عرصہ وہیں ٹھہرا۔ شجرۃ الملوک کے مُطابق (جس سے یہ تفصیلات ماخوذ ہیں) شاہ نے اپنے وزراء کے زیر اثر سیستان بمعہ قلعہ لبست تا خشک رود اُک (یعنی موجودہ ضلع لاش اور جُوین) اور صُوبہ طون اور خی آباد اسد اللہ خان کو بخش دیئے اور دیگر قیمتی تحائف بھی اُسے دیئے اور وہ حاکم سیستان بن گیا۔ ملک فتح علیخان کے بیٹے، محمد حسین خان اور ملک محمود چند سرداروں کے ساتھ وطن کو خیرباد کہہ کر کرمان چلے گئے۔ کرمان سے طُون پہنچ گئے۔ یہاں نخے، لالوُ تے اور ہمدین قبیلوں کے سردار ان سے آملے۔ طُون اور خی آباد کے لوگوں کے رہنما بھی کیانی شہزادوں کے گرد جمع ہو گئے۔

ایرانی حکومت کو اس کا پتہ چلا تو اس پر خاموش تماشائی نہ رہ سکتی تھی۔ لہٰذا مشہد کے بیگلر بیگی، فتح علیخان افشار کو شاہ حسین صفوی نے یہ تحریک کچلنے کا حکم دیا، اور وہ (شجرۃ الملوک کے مُطابق) ۱۲ ہزار فوج لیکر تعمیلِ حکم کے لئے روانہ ہُوا۔ طُون سے دو فرسخ کے فاصلے

پر پہنچ کر جہاں شہر کے باغات تھے، اُس نے علاقے کو تباہ کرنا شروع کیا اور پھر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ملوک کے پاس ۳۰۰۰ سے زیادہ جنگ آزمانہ تھے لیکن محمود انہی کے ساتھ باہر نکلا اور ایرانی فوج پر ٹوٹ پڑا اور اس کے سالار کو مار کر اسے تتر بتر کر دیا۔

شجرۃ الملوک کے بیان کی تصدیق تاریخ جہانکشائے نادری سے بھی ہوتی ہے۔ موخر الذکر کے مطابق محمد حسین خان کا وجود اور عدم وجود برابر تھا بشاید ملک محمود کے مضبوط کردار اور اس کے شاندار کارناموں نے بڑے بھائی کو ماند کر دیا۔ تاریخ جہانکشائے نادری کے مُطابق ملک محمود اس لئے ایرانی حکومت کی سپاہ پر جارحانہ حملہ کر سکا کہ ایرانی فوج کا ایک افغان سالار، پیر محمد ملک محمود سے جا ملا تھا۔ اس فتح نے ملک محمود کو ایک آزاد حکمران کا درجہ دیدیا اور وہ طوں پر آزادانہ حکومت کرتا رہا۔

صفوی خاندان اب بسترِ مرگ پر تھا۔ محمود غلزئی افغان نے ایران پر حملہ کر دیا تھا اور وہ دار الحکومت اصفہان کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ آخری صفوی شاہ حسین صرف مردِ بزم تھا۔ وہ تعمیر عمارات و محلات، ادب اور عیش و نشاط میں اپنا وقت گذارتا تھا۔ شاہ عباس اعظم کے زمانے میں ایران کے جنگی وسائل منظم کئے گئے تھے اور یورپی ماہرین نے انہیں چار چاند لگا دیئے تھے۔ لیکن اس کے جانشینوں نے یہ سب کچھ نظر انداز کر دیا تھا کہ شاہ حسین کے وقت دار الحکومت کو محمود کے بے ضبط افغان اور بلوچ قسمت آزماؤں سے بھی نہ بچایا جا سکا۔ شجرۃ الملوک کے مطابق ملک محمود نے ایک فوج کھڑی کی اور حملہ کو روکنے کے لئے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کیں۔ وہ اس مقصد سے یزد پہنچ گیا اور بذریعہ ایلچی شاہ کو اپنی نقل و حرکت کی اطلاع بھی دی اور ساتھ ہی شاہی فوج سے لڑنے اور بیگلر بیگی کو تہ تیغ کرنے کی معافی مانگی۔ شاہ کے سالاروں نے اپنے آقا کو مشورہ دیا کہ محمود کے جرم غفیر سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں لیکن کیانیوں کی نقل و حرکت بہت سے شکوک و شبہات پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا ملک محمود کو اپنی آمد کے راستے سے ہی واپس جانے کا حکم دیدیا گیا اور خراسان کے معاملات پر کڑی نظر رکھنے کے لئے بھی کہا گیا۔

یہاں سے ملک محمود کے حالات تاریخ جہانکشائے نادری سے لئے گئے ہیں۔ سلطنت کے تمام دُور افتادہ صُوبوں میں بغاوتیں پھوٹ پڑی تھیں۔ قندھار میں غلزئی آزاد ہو گئے تھے اور ابدالی ہرات اور فرح پر قبضہ جما بیٹھے تھے۔ کرمان میں مرزا داؤد کا پوتا سیّد احمد بغاوت پر اُتر آیا تھا۔ اور بلوچستان میں نبادر (خلیج فارس کی بندرگاہیں) کی طرف سلطان محمد الملقب بہ فرسوار لُوٹ مار کر رہا تھا۔

شاہ کی حکومت نے ہرات کے ابدالیوں کو زیر کرنے کی کئی کوششیں کیں لیکن سب رائیگاں گئیں۔ دریں اثنا غلزیوں نے ابدالیوں پر حملہ کر دیا اور فرح اور قندھار کے درمیان دلآرام کے مقام پر جو معرکہ ہوا اسمیں ابدالی سردار اسداللہ مارا گیا۔ شاہ کو قزوین میں اس کی خبر دی گئی، تو اُس نے محمود کو حسین قُلی کا خطاب دیا جس نے یہ معرکہ لڑا تھا۔

اس کے بعد زمان خان نے وارث ہونے کا دعویٰ کیا اور ہرات پر قبضہ کر کے اسد خان مرحوم کے والد عبداللہ کو قید میں ڈال دیا اور جعفر خان اور دیگر قزلباش قیدیوں کو خیابان کے سرے پر واقع باغ نو برّہ میں قتل کر دیا۔ اب زمان خان نے عنانِ سلطنت سنبھالی۔ جب غلزئی اور ابدالی باہم دست و گریباں تھے اور محمود غلزئی کو نام نہاد وفاداری کے لئے انعامات سے نوازا گیا تھا، تو صوفی قُلی خان ترکمان ادغلی کو سردار ہرات مقرر کیا گیا اور اسے آزمودہ کار فوج اور جنگی سامان دے کر شہر پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ کافر قلعہ کے گرد میدانوں میں اس کی زمان خان سے مٹھ بھیڑ ہوئی اور جھڑپ میں سردار مارا گیا۔ یہیں سے افغانوں کا غلبہ شروع ہوا، کیونکہ وہ ہرات اور اس کے نواحیات پر چھا گئے۔ حتیٰ کہ نادر نے انہیں شکست دی۔

۲۰-۱۷۱۹ء:-

۱۱۳۲ھ میں دربار میں صوفی قُلی خان کی موت کی خبر پہنچی تو اسمٰعیل خان غلام کو سپہ سالار بنا دیا گیا اور ہرات واپس لینے پر مامور کیا گیا لیکن وہ ہرات جاتے ہوئے مشہد میں گھومتا

پھرتا رہا۔

ملک محمود کیخلاف مہم بھیجی گئی تھی جس میں بیگلربگی مارا گیا اور ملک کی طاقت دوبالا ہو گئی۔ بیگلربگی کی موت کے بعد سپہ سالار اور والیٔ مشہد کا عہدہ علی قلی خان شاملو کو دیا گیا جو مرد کا بیگلربگی تھا لیکن مشہد میں رہتا تھا۔ علی قلی خان اور اسمٰعیل خان کے درمیان اختلافات رُونما ہوتے اور اوّل الذکر نے کچھ بدکردار اس کے پیچھے لگا دیئے تاکہ رہائش گاہ سے گھسیٹ کر خیابان کے راستے قیدخانے میں لے آئیں۔ یہ واقعہ ۱۱ محرم ۱۱۳۵ھ (۱۲ اکتوبر ۱۷۲۲ء) کو ہوا جب افغانوں نے اصفہان پر قبضہ کیا۔[۱]

شہر کے بدکرداروں نے آہستہ آہستہ شہر مشہد پر مکمل قابو پا لیا حتیٰ کہ جمادی الاوّل (مارچ ۱۷۲۳ء) میں وہ علی قلی کی حرم سرائے میں گئے اور اسے مار دیا۔ اور اسمٰعیل خان کو قید سے نکال کر والی بنا دیا۔ اُس کا اختیار برائے نام تھا کیونکہ وہ اراذل و اسافل کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھا اور وہی دروبست کے مالک تھے۔ لہٰذا اُس نے مجبوراً ملک محمود کو خط لکھا اور مشہد آنے کی دعوت دی۔

ملک محمود تو بس ایسے موقعہ کا منتظر ہی تھا لہٰذا وہ بھاگم بھاگ شہر پہنچا اور پہنچتے ہی بغاوت پسند عناصر کو دبانے کے اقدامات کئے۔ اسمٰعیل خان کا بھی قصّہ پاک کر دیا گیا اور ملک محمود نے شہر پر کلّی قبضہ کر لیا۔

اُس کے بڑے بھائی نے محمود کے حق میں دستبرداری کا اعلان کیا اور اس کے کچھ ہی دن بعد وہ چلتا بنا۔[۲] اُس نے چار بیٹے چھوڑے۔ لطف علیخان، فتح علیخان، سلیمان اور محمد۔

---

[۱] فتح اصفہان و ایران کے بعد وہ محمود شاہ کہلانے لگا۔ ہم نے سیستان میں اُس کا ایک زرّیں سکہ دیکھا جس پر یہ عبارت درج تھی "ضرب کا نشان" سکّہ محمود شاہ عالم درسنت ۱۱۳ (۵) آخری ہندسہ بہت بجھا ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے پانچ ہو یا آٹھ۔ کیونکہ اس کا نصف زیریں پڑھا نہیں جاتا تھا۔

[۲] وہ فرج میں بیمار ہو گیا تھا۔

ملک محمود نے اپنے لئے محل بنوایا اور قدیم کیانیوں کے انداز میں ایک تاج تیار کروایا اور اس میں جواہرات لگوائے۔ پھر مشاق مؤبد تلاش کرکے اُن سے کہا کہ وہ تخت نشینی کے لئے کوئی مبارک ساعت منتخب کریں۔ مؤخرالذکر کو فریدوں اور کیخسرو کی روایات کے مطابق ایک ایوان بلند میں کرسی نشیں کیا گیا۔ یہ ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۲ء) میں ہوا۔ اور کیانی شہزادہ کو شاہ مشہد کا لقب دیا گیا۔ اُس نے اپنے سکے جاری کئے لیکن کوئی سکہ تلاش کے باوجود ہاتھ نہیں لگ سکا۔

اُس کے لشکر میں نادر قلی افشار بھی بھرتی ہو گیا جو ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کا آئندہ فاتح تھا اور جسے ملک محمود کا تختہ بھی الٹنا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ صرف ایک سال ملک کے لشکر میں رہا اور پھر اسے چھوڑ کر ابیورد چلا گیا۔ ملازمت کے دوران اسے بہت مفید تجربہ حاصل ہوا، کیونکہ ملک محمود اب ایک منظم فوج کا قائد تھا اور اس نے اپنے پیادوں کو توڑیدار بندوقوں سے مسلح کر دیا تھا اور اُس کے پاس کافی توپیں بھی تھیں۔ بعد میں انہی بندوقچیوں اور توپچیوں نے نادری رسالہ کے بہت سے حملوں کو بار بار ناکام بنا دیا۔

ملک محمود ابدالیوں سے ٹکر نہ لینا چاہتا تھا جو فرح اور سبزوار پر قبضہ کر چکے تھے۔ اُسے ان اضلاع کی بجائے خراسان کے مغربی اضلاع سے زیادہ دلچسپی تھی۔ نادر کی ابتدائی زندگی میں جب اُس نے ابیورد اور قلات کے افشاروں پر شمال کی طرف بڑے میدان کے ساتھ ساتھ اپنا ضبط قائم کرنا چاہا تو ان قبائل اور کُردوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو اسے تسلیم نہ کرتے تھے اور وہ ملک محمود سے جا ملے۔ مؤخرالذکر سے خراسان کے ایلیات قبائل نے اطاعت گزاری کا وعدہ کیا۔ ان میں قلیچ خان، پاپالو، اور امام قلی ارلو بھی شامل تھے جو افشار تھے۔ نادر مشہد میں ملک محمود سے ملا۔ اُس کے عزائم مکارانہ تھے لیکن اُس کا داؤ نہ چل سکا۔ اُس نے قلیچ خان اور امام قلی کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور جب کیانی ملک شکار پر گیا تو نادر ان دونوں سرداروں کو اپنے ساتھ ابیورد لے آیا۔

یہ ملک سے نادر کے رویّہ کا مظہر ہے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد ان دونوں کے درمیان کھلّم کھلّا مخاصمت شروع ہوگئی۔

حریفین پہلی دفعہ خبوشان (کوچان) میں آمنے سامنے ہوئے جہاں ملک اپنے پانچ یا چھ ہزار آدمی لیکر بغاوت کو فرو کرنے گیا تھا۔ نادر باغی کردوں کی مدد کے لئے آیا اور کوچان سے دو فرسخ کے فاصلے پر اُس نے ملک کا ایک دستہ کاٹ پھینکا تھا۔ اس پر محمود مشہد کو واپس ہوا، اور اپنے عقب کو اپنے بندوقچیوں اور توپچیوں سے بچاتا رہا، جن سے نادر اپنے رسالہ کو بچانا چاہتا تھا۔

اسی اثنا میں شاہ طہماسپ ابن شاہ حسین صفوی مرحوم نے خراسان جانیکا فیصلہ کر لیا تھا۔ نادر بھی کوچان سے بڑھا اور مشہد سے ایک فرسخ کے فاصلے پر خیابان عالیہ کی سمت میں ایک جگہ "بیر کاریز" پر ٹھہر گیا۔ یہاں ملک نے اس پر حملہ کیا لیکن بھاری نقصان کے ساتھ پسپا ہوا اور شہر کی دیواروں کے عقب میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ اب نادر نے قلعہ طوس موسومہ بہ حاجی تراب پر قبضہ کر لیا جو مشہد کے مغرب میں تین فرسخ دُور تھا۔ یہاں سے اُس نے ملک کے ذرائع رسل و رسائل کو مخدوش کر دیا۔

شاہ طہماسپ نے اپنے ایک امیر، رضا قلی خان کو اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے خراسان بھیجا جس نے کوچان کے کردوں کی ایک فوج کے ساتھ مشہد کی طرف کوچ کیا۔ ملک نے اُسے پچھاڑ کر طوس واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہاں وہ ناؤ نوش میں مصروف ہوگیا، اور اُس کی فوج بکھر گئی۔

اہلِ مشہد رضا قلی کے لئے اپنے شہر کے دروازے کھولنے پر تیار تھے لیکن اُس کی پسپائی سے مایوس ہوکر انہوں نے اپنے مسلح آدمی اکٹھے کئے اور ملک کے لئے دروازے بند کر دیئے۔ لیکن قلعہ پر مہدی مشہدی کا ہی قبضہ رہا جو ملک کا حامی تھا اور اُس نے ملک کو توپخانہ سمیت اندر آنے دیا۔ اُس نے بہت جلد شہر پر قابو پالیا، اور آئندہ لوگوں سے

بہت سختی سے پیش آنے لگا کیونکہ وہ ان کی بیوفائی کا قائل ہو چکا تھا۔

نادر نے سردار رضا قلی کے ساتھ اشتراک کو بے فائدہ سمجھا اور وہ ابیورد سے ہوتا ہُوا کُوچان واپس آگیا۔ اُس نے مشہد پر ایک اور حملہ کیا لیکن ملک محمود نے اسے ناکام بنادیا۔ ان واقعات کی خبریں شاہ طہماسپ کو آذربائیجان میں ملیں، جہاں اُس کا دربار لگا ہُوا تھا۔ اُس نے محمد خان ترکمان کو سردار خراسان مقرر کیا۔ لیکن اُس کے پہنچنے سے پہلے ملک محمود نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اپنے بھتیجے ملک اسحاق کو نیشاپور پر قبضہ کرنے کے لئے مامور کیا۔ نیشاپور کے بیات قبائلیوں نے نادر سے مدد مانگی اور نادر نے ابیورد، درّہ جز (موجودہ درّہ گز) اور قلّات کے افشاروں اور کُردوں سے ایک لشکر تیار کیا۔ کُوچان کے کُرد بھی اُس کے ساتھ مل گئے اور یُوں ملک اسحاق کو نیشاپور سے بُری طرح پسپا کر دیا گیا اور وہ شہر کے مضافات میں ایک باغ میں پناہ گیر ہوا۔

لیکن اُس نے ولیِ زمان، ملّا محمد رفاعی کے توسّط سے اپنی فوجوں سمیت مشہد جانے پر نادر کی رضامندی حاصل کر لی۔ کچھ وحشی اور مردود کُردوں نے اسے پسند نہ کیا اور ایک پرانی دشمنی کی وجہ سے ملک کا ساز و سامان چھیننے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے اقدام سے پہلے ملک محمود خود مشہد سے اپنے بھتیجے کی مدد کے لئے آگیا اور نیشاپور کے قریب قدم گاہ پر مورچہ بند ہُوا۔ نادر نے ملک پر حملہ کیا لیکن اسے پسپا ہونا پڑا اور اُس کا بھائی زخمی ہو گیا۔ شورش پسند کُرد نظم و ضبط اور مسلسل تگ و دَو کے عادی نہ تھے۔ انہوں نے جو ملک کا مصمّم رویّہ دیکھا تو جو کچھ ہاتھ لگا لیکر گھروں کو چل دیتے۔ ملک محمود نے نیشاپور کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ شہر نے نادر کی بیوفائی کی وجہ سے ملک محمود کی اطاعت کر لی۔ اُس نے سابق گورنر فتح علیخان بیات کو بحال کر دیا اور مشہد واپس آگیا۔ تاریخ جہانگشائے نادری کے مُطابق اس واقعہ کے بعد ہی ملک محمود کی تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی اور اُس کے نام کے سکّے جاری ہُوئے۔

مشہد اور ابیورد کے درمیان واقع، بُوزنجِرد کے لوگ بغاوت پسند ثابت ہُوئے تھے۔

لہٰذا ملک محمود نے اپنے بھتیجے کو ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ بُرکچ نے نادر سے مدد مانگی لیکن اُس کی آمد سے پہلے ہی ملک اسحاق نے انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا اور خود مشہد واپس چلا گیا۔ بُورکچ کی حمایت کے لئے نادر مشہد کو براستہ رادکان چلا اور ملک محمود اسے روکنے کے لئے کُوچان کی سمت میں روانہ ہُوا۔ مشہد کے ایک گاؤں، آشتر بی میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہُوا۔ نادر کو بہت بُری شکست ہوئی اور اس کے بے شمار آدمی مارے گئے یا زخمی ہوگئے اور باقی بھاگ گئے۔ نادر خود صرف دو ساتھیوں کے ساتھ قلات پہنچا۔ اس کے بعد ملک محمود کُوچان پر حملہ آور ہوا۔ عین اُسوقت نادر افشاروں کی ایک خوفناک بغاوت دبانے میں مصروف تھا جو انہوں نے دڑون کے ترکمانوں کی مدد سے اُس کے خلاف کی تھی۔ نادر قلات سے ابیورد گیا اور قلعہ کے عین سامنے ان باغیوں کو شکست فاش دی۔ اس خطرے سے نپٹ کر وہ کُوچان کو روانہ ہوا، لیکن اُسوقت تک ملک محمود کُردوں کو لوٹ کر ان کی مسلح جمعیت کو منتشر کر چکا تھا اور مشہد واپس جا چکا تھا۔ نادر اس صورتِ حال کے پیش نظر ابیورد واپس آگیا۔

اسوقت شاہ طہماسپ کا مقرر کردہ سردار خراسان، محمدؐ خان ترکمان صوبہ میں پہنچا۔ اور فتح علیخان بیات (جسے ملک محمود نے والیٔ نیشاپور مقرر کیا تھا) فوراً اکیانیوں کی اطاعت سے منحرف ہوکر شاہ کے نمائندے کے سامنے جُھک گیا۔ ملک نے دُوسری دفعہ داہنے راستے سے شہر کی طرف کُوچ کیا۔ باغی گورنر لڑنے کے لئے نکلا، لیکن شکست کھا گیا، پکڑا گیا اور اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ ملک محمود نے اپنے بھتیجے ملک اسحاق کو اپنا نمائندہ مقرر کیا اور خود مشہد کو واپس چلا گیا۔ نادر مشہد کی طرف بڑھ رہا تھا لہٰذا ملک محمود نے ملک اسحاق کو نیشاپور سے بُلایا اور خود ایک لشکر لے کر مشہد کے باہر ایک باغ میں خیمہ زن ہُوا۔

جب نادر رضا آباد پہنچا تو اس نے دیکھا کہ یہ جگہ اسی پیر محمدؐ کے تحت تھی جو کچھ سال پہلے طُون کے مقام پر اُس کا ساتھ چھوڑ کر ملک محمود سے جا ملا تھا۔ اُس نے نادر کا راستہ

روکنے کی کوشش کی، لیکن شکست کھا گیا اور قلعہ میں بند ہو گیا اور نادر مشہد کی طرف چلتا گیا۔ کوشک مہدی پر اُسے ملک کی نقل وحرکت کی اطلاع ملی۔ یہ جگہ مشہد سے دو فرسخ دُور تھی۔ یہاں سے نادر کوہِ سنگین پہنچا جو صرف ایک فرسخ دُور تھا۔

ملک اسحاق بھی اسی دن ترُدک پہنچا تھا جو مشہد سے دو فرسخ تھا۔ شام کے وقت ملک اسحاق بابا قدرت کی طرف سے اور ملک محمودُ باغ کی طرف سے نادر کے خلاف بڑھے۔ لڑائی ہوئی اور نادر کو فتح حاصل ہوئی اور ملک کو کافی نقصان کے ساتھ شکست ہوئی۔ ملک محمود کے ڈھول اور توپیں نادر کے ہاتھ آگئیں اور کیانی شہر کے اندر دوڑ گئے۔ فاتح نے مشہد کے قیدیوں سے مہربانی کا سلوک کیا اور انہیں رہا کر دیا لیکن ملک کے خاص حواری وحامی قلات بھیج دیئے گئے اور نادر خود بھی وہیں پہنچ گیا۔

اس شکست کے بعد نادر کے خلاف افشاروں سے رابطہ قائم کیا اور درُون اور نسا کے ترکمانوں اور کوُچان کے کرُدوں کے پاس ایلچی بھیجے تاکہ یہ سب نادر قلی کے خلاف میدان میں کوُد پڑیں۔ یہ چال کامیاب رہی لیکن نادر کو بر وقت اس کا پتہ چل گیا لہٰذا وہ برق رفتاری سے مشہد کے خلاف بڑھا جہاں اس کا مقصوُد نظر قلعہ بہار تھا۔ ملک محمود حملہ کے لئے باہر نکلا، لیکن موسم ناقابل برداشت تھا اور طوُفان برفُ وباران نے سب کاروائیاں کُند کر دیں۔ مجبوراً کیانی ملک شہر کو واپس ہوُا اور نادر ابیورد کو۔ یہاں سے اُسے مروجانا پڑا جہاں ملک محموُد کے حق میں ایک تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مؤخر الذکر نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور جوُین اور اِسفرائن کی طرف بڑھا تاکہ نادر قلی کے پہنچنے سے پہلے وہ شاہ طہماسپ کو مغلوب کر لے۔ شاہ اُس وقت شاہرود و بسطام میں تھا اور ملک کی نقل وحرکت کا سُن کر وہ جاجرُم اور اسفرائن کے راستے روانہ ہُوا تاکہ نادر سے مل سکے۔ اُس نے معیار الممالک حسین علی بیگ کو بھی ہراول کے طور پر نادر کے خیمے میں بھیج دیا۔

ملک محموُد نے اب تک جوُین پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ شاہ کے پوُرے راستے پر قابض

ہونا چاہتا تھا۔ لیکن یہ سُن کر کہ نادر مرو سے نکل کر مشہد کی طرف بڑھ رہا تھا اُس نے اپنی تازہ ترین فتوحات کو خیر باد کہا اور شہر کی حفاظت کے لئے واپس آیا۔

حسین علی بیگ نادر کے پاس پہنچا اور شاہ کی آمد کا بتایا تو اُس نے حملۂ مشہد کا ارادہ ترک کر دیا اور شاہ سے ملنے کے لئے کُوچان روانہ ہوا۔ نادر کو کُردوں کی سازشوں کا بہت خطرہ تھا۔ لیکن کوچان میں آکر پتہ چلا کہ کرد شاہ سے لڑ پڑے تھے اور شاہی فوج کے نرغہ میں تھا۔ کُردوں نے نادر سے درخواست کی کہ شاہ سے صلح کروا دے۔ چنانچہ نادر نے شرف باریابی حاصل کیا اور باغیوں کے لئے معافی کی التجا کی۔ شاہ نے محمد حسین بیگ ابن سام بیگ وکیل کو والئی کُوچان مقرر کیا اور اُسے سرداریٔ قبائل پر ترقی دے دی۔ ۲ محرم ۱۱۳۹ ھ (۲۷ اگست ۱۷۲۶ ء) کو شاہی فوجیں مشہد کا محاصرہ کرنے کے لئے کُوچان سے روانہ ہوئیں۔ ملک محمود نے اپنے کو قلعہ بند کر لیا اور شہر کے دروازے بند کرا کر محاصرہ کے لئے تیار ہو گیا۔

شاہی افواج ۲ صفر کو مشہد پہنچیں اور توپوں کی آتشباری میں قلعہ کے پاس سے گذر کر اس کی دیواروں پر چڑھیں اور خواجہ ربیع کے زاویہ پر مورچے سنبھال لئے۔ قلعہ کے بیرونجات دشمن کے قبضہ میں تھے اور ہر روز اس سے جھڑپیں ہوتی رہیں۔

اسی ماہ کی چودہ تاریخ (۲۰ ستمبر) کو استر آباد کے قاچاروں کا سردار فتح علیخان مارا گیا اور ملک محمود یہ سمجھ کر کہ یہ واقعہ قاچاروں اور شاہ کے درمیان مغائرت پیدا کر دے گا، مشہد سے باہر نکلا تاکہ شاہی پڑاو پر حملہ کرے۔ نادر قلی شاہی فوجوں کا سالار تھا اور شہر سے نصف فرسخ کے فاصلہ پر ایک زبردست جنگ ہوئی جس میں ملک محمود کو بہت بُری شکست ہوئی۔ اُس کے بہت سے سالار کھیت رہے جن میں توپخانہ کا امیر ابراہیم خان بھی تھا۔ ملک محمود شہر کے اندر چلا گیا اور پھر دیواروں سے باہر نہ نکلا۔ اس کے بعد بھی محاصرہ دو ماہ جاری رہا اور اس عرصے میں لوگ ملکیانیوں کے ستارہ کو گردش میں دیکھ کر اس کے مخالفین

سے ملتے گئے۔

ملک کا سپہ سالار پیر محمدؐ ایک دفعہ پھر پلٹا کھانے کے لئے تیار تھا۔ اُس نے نادر کے پاس ایلچی بھیجا کہ اگر اُسے جان بخشی کا یقین دلایا جائے تو وہ میر علی معاویہ کی طرف کے دروازہ میں محافظوں کو مغلوب کر کے نادری فوج کو اندر گذار لے گا بشرطیکہ یہ فوج رات کو آئے اور دروازہ کے باہر چھپی رہے اور فوری داخلہ کے لئے تیار ہو۔ ۱۶ ربیع الثانی ۱۱۳۹ھ کی رات (۳۰ نومبر ۱۷۲۶ء کی رات) کو نادر خواجہ ربیع سے ۱۲ ہزار کا لشکر لیکر چلا، پیر محمدؐ نے دَروازہ کھولا اور دشمن کو اندر داخل کر لیا۔ نادر نے فوراً مقدّس علاقہ اور چہار باغ تک شہر پر قبضہ کر لیا اور ملک کے فوجی دیواریں چھوڑ کر قلعہ کے اندر بھاگ گئے۔

اگلی صبح ملک محمود بہت بڑی جمعیّت کے ساتھ شہر کی دو اطراف سے باہر نکلا۔ ایک پر اخیابان چہار باغ اور دوسرا خیابان سفلی کی طرف بڑھا اور بہت جانفشانی سے دشمن پر حملہ کیا گیا۔ نادر نے خود اس حملے کا مقابلہ کیا اور ملک محمود کو قلعہ کے اندر جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد پُورے شہر پر شاہی فوج کا قبضہ ہو گیا اور شہزادہ خود روضہ پر آکر دُعا مانگ کر واپس ہُوا۔ اگلے دن ملک محمود نے نشان سلطنت اتار پھینکا اور اپنی، اپنے خاندان اور نمکخواروں کی جان بخشی کروا کر روضہ امام رضا کے اندر چلا گیا۔

پیر محمدؐ کو حکومت جام دی گئی۔ ملک محمود کچھ عرصہ تو روضہ کے اندر رہا لیکن وقت خطرناک تھا۔ شاہ طہماسپ نے نادر کی روز افزوں طاقت سے ڈر کر اس کے خلاف سازش کی اور ملک محمود، ملک اسحاق اور نادر کے اپنے سالاروں کو اس کے خلاف بغاوت پر اُکسایا۔ محمودؐ اور اس کے بھتیجے نے یہ سارا کچا چٹھا نادر کو سُنا دیا۔ ۲۶ رجب (۸ فروری ۱۷۲۷ء) کو تلّات اور درہ جز کے کُردوں نے مخالفانہ مظاہرہ کیا۔ مرو کے تاتاروں نے بھی بغاوت کر دی اور ملک محمودؐ کو اپنا سردار بنایا۔ نادر نے خود کُردوں کو دبایا اور اپنے بھائی کو مرو بھیجا۔ اُس نے بندِ سُلطانی توڑ دیا اور تاتاروں کو محرومِ آب کر کے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

ملک محمود نے جو خطوط تاناردں کو لکھے تھے وہ پکڑے گئے اور اس کے خطرناک اثر و رسوخ نے اس کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا۔

نادر کے حکم پر غالباً مارچ ۱۷۲۷ء میں محمد خان چولہ نے ملک محمود اور ملک اسحاق دونو کو ختم کر دیا اور یوں محمد بیگ چولہ من باشی کا بدلہ لے لیا جسے ملک کے حکم پر قتل کیا گیا تھا۔ ملک کا چھوٹا بھائی، محمد علی، براممالی خان بیات کے سپرد کر دیا گیا جس نے اُسے اپنے بھائی فتح علیخان کے بدلے ٹھکانے لگا دیا۔ "یوں ان تینوں آدمیوں کو جنمیں سے ہر ایک تاج کا اہل تھا۔ فیصلہ تقدیر کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔"

ان کی مرت کے بعد سیستان کے سابقہ حکمران، ملک اسداللہ خان کو (جو اپنے ملک سے نادری پڑاؤ میں آیا ہوا تھا) ملک محمود کے بچوں، حرم اور رشتہ داروں کے ساتھ واپس اپنی حکومت پر بھیج دیا گیا۔

جب مشہد میں یہ واقعات ہو رہے تھے تو سیستان کا ایک معزز حسین سلطان، جو ملک محمود کے حکم پر قائن گیا ہوا تھا، باغی ہو کر نادر کے خلاف پیدل چل پڑا تھا اور ایک نادری دستے کو شکست بھی دیدی تھی۔

چونکہ خاف کے افغانوں کو مطیع کرنا ضروری ہو گیا تھا لہٰذا ۱۶ ذوالحجہ ۱۱۳۹ھ (۲۶ جون ۱۷۲۷ء) کو نادر شاہ ۸ ہزار کا لشکر لیکر مشہد سے چلا۔ اس پر اہل قائن گھبرا گئے اور ملک کلب علی ابن ملک محمود اور لطف علی ابن محمد علی اور دیگر سرداران سیستان اصفہان کی طرف بھاگ گئے اور اشرف غلزئی سے جا ملے۔ حسین سلطان قلعہ بند ہو گیا اور نادر کے پہنچنے پر ہتھیار ڈال دیئے اور فاتح نے اُس پر نظر کرم رکھی۔

اس کے بعد تاریخ جہانگشائے نادری میں سیستان کا ذکر نہیں ملتا لہٰذا آئندہ واقعات کُلی طور پر شجرۃ الملوک سے ہی ماخوذ ہیں۔

تاریخ جہانگشائے نادری اور شجرۃ الملوک دونوں میں ملک محمود کی ہنگامہ خیز زندگی کا بیان

غیر اہم جزئیات کے سوا تقریباً یکساں ہے۔ شجرۃ الملوک میں ملک اسحاق کی بجائے لطف علیخان کو اپنے چچا کی فوجوں کا کماندار بتایا گیا ہے لیکن ملک محمود کے بڑے بھائی ملک حسین خان کے بیٹے کا اپنے چچا کے مختصر دور اقتدار میں کوئی اہم حصہ لینا محال تھا کیونکہ وہ عمر میں چھوٹا تھا۔

ملک محمود نے سات بیٹے چھوڑے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے عباس خان، جعفر خان، کلب علی، ملک رستم، حسین خان، محمد اور احمد تھے۔ ان کے ورثا آج بھی موجود ہیں اور ان کی اولاد ایرانی کوہستان کے طبس اور ہندوستان میں پنجاب کے ضلع کوہاٹ میں پائی جاتی ہے۔

ملک لطف علی کو شروع میں تو اشرف غلزئی نے با احترام قبول کیا لیکن بعد میں اصفہان میں قید کر دیا گیا اور نادر کے قبضہ کے بعد ہی وہ دیگر قیدیوں کے ساتھ چھوٹا۔

کہا جاتا ہے کہ نادر نے حکومت سیستان لطف علی کے حوالے کی اور ملک اسداللہ ایران چلا گیا جہاں وہ کچھ عرصہ بعد فوت ہو گیا۔ ملک لطف علی اس لشکر کے ساتھ بھی لڑا جو سیستان نے فرح کے خلاف بھیجا تھا۔ وہ نادر کے جھنڈے تلے ترکوں سے بھی لڑا جس میں نادر بغداد کے ترک پاشا، توپال عثمان کے خلاف لڑائی میں زخمی ہوا۔

نادر شاہ قندھار کے محاصرہ کے لئے جاتے ہوئے سیستان سے گذرا (اس نے اصفہان ۱۷ رجب ۱۱۴۹ھ = ۱۳ اکتوبر ۱۷۳۶ء کو چھوڑا) اس نے اپنا خاندان اپنے آدمیوں کے پاس چھوڑا، اور اس کی حفاظت کے لئے بندوقچی متعین کئے۔ اسی سال ۲ شوال (۲۴ جنوری ۱۷۳۷ء) کو وہ دلخاک اور دلآرام کے راستے گرشک کو روانہ ہوا۔

اس نے ساتھ ہی ملک لطف علی خان کو حکم دیا کہ وہ مکران جائے اور وہاں کے شورش پسند قبائل کو زیر کرے۔ سردار سرباز نے کچھ جنگجو اکٹھے کئے اور مزاحمت کی، لیکن ملک نے انہیں شکست دی اور مطیع کر لیا۔ حملہ آوروں کا پڑاؤ سردار سرباز کے پاس تھا۔ اور رندوں کے ساتھ لڑائی ختم ہو چکی تھی لیکن اتنے میں ایک مسلح دستہ پہنچا جو صلح کے باوجود لڑنے پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ سردار نے معاہدہ یکطرفہ طور پر توڑ دیا۔ ملک لطف علی

کو اس کمک کا پتہ نہ تھا۔ سردار سرباز نے یک لخت حملہ کر دیا اور ملک لطف علی کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اس کی موت کے بعد مکران کی مہم ناکام ہو گئی۔

نادر نے اس کی موت کی خبر سنکر فوراً مرحوم کے بھائی کو بلایا اور اُسے حاکم سیستان مقرر کر دیا۔ ملک فتح علیخان نادر کے ساتھ ساتھ افغانستان، تسخیر خیبر اور بعد کی ہندوستان میں فوجی کارروائیوں میں لڑتا رہا۔ وہ والئی بخارا کے بھی خلاف لڑا اور کامیاب رہا۔ اس کے بعد وہ سیستان آیا اور نظم و نسق سنبھالا۔ سیستان نے بھی نادر شاہی سلطنت کے دیگر حصوں کی طرح اس کے ظلم و جبر کا تجربہ کیا۔ محصول اتنے بڑھا دیئے گئے کہ (تاریخ جہانکشائے نادری کے الفاظ میں) عائد کردہ رقم کا عشر عشیر بھی پورا نہ ہو سکتا۔ اگر درختوں کے پتے بھی سونے کے ہو گئے ہوتے!

سیستان پر عائد کردہ مالیہ چار "الف" تھا جو مذکورہ تاریخ کے مطابق پانچ ہزار تومان کے برابر ہوتا تھا گویا سیستان کو ۲۰ ہزار تومان دینا ہوتا تھا۔ آخری دَور کے ظلم و تشدّد میں ہر الف پانچ گنا کر دیا گیا گویا حاکم سیستان سے ۱ لاکھ تومان کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔

اہل ملک نے خراج نہ دینے کا فیصلہ کیا اور اگر بہ امر مجبوری دینا ہی پڑے اتو تیغ بدست۔ لیکن نادر کی سخت گیری سے پہلے ہی ملک فتح علیخان نے شجرۃ الملوک کے مطابق نادر کو لکھا کہ سیستانی اتنا خراج دینے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ اس عاجزانہ اقدام کا کوئی اثر نہ ہوا تو ملک فتح علیخان نے ہتھیار اٹھا لیے اور نادر سے باغی ہو گیا۔ اُک اور قلعہ کاہ کے لوگ بھی اُس سے آملے اور وہ فرح کی طرف چلا جہاں کے لوگ بھی نادری استحصال سے نالاں تھے۔ اہلِ فرح نے اُس کا پُرجوش استقبال کیا اور گورنر کو پکڑ کر ملک کے حضور پیش کیا۔ لیکن بیچارے گورنر کا کیا قصور تھا۔ اُس نے تو صرف نادری حکم نافذ کیا تھا لہٰذا تھوڑے عرصہ کے بعد اُسے رہا کر دیا گیا۔

سیستان اُک، قلعہ کاہ اور فرح وغیرہ کے لوگوں کا ملجا بن گیا جو نادر شاہ کے ظلم

سے تنگ آ آ کر یہاں وارد ہونے لگے۔

نادر شاہ کو سیستان کی بغاوت کا پتہ چلا تو اُس نے فتح علیخان کے نوخیز بھائی محمدؐ کو علیحدگی میں بُلا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ محمدؐ دربار شاہ میں ملک کا نمائندہ تھا۔ بغاوت کو فرو کرنے کا کام محمدؐ رضا خان فرکلوُ افشار کے سپرد کر دیا گیا۔

ملک فتح علیخان نے ایک ایسا جرنیل چُنا جسے وہ گرم سیر کے زرخیز ضلع کو لوٹنے پر بھیجنے والا تھا۔ یہ شاہرُخ قبیلے کا سردار امیر سیف الدّین تھا۔ یہ چھاپہ کامیاب رہا۔ اور ملک بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ امیر سیف الدین نے نادری جرنیل کو شکست دے دی، جسے چھ ہزار سپاہی دیکر گرم سیر کے تحفظ کے لئے بھیجا گیا تھا۔ سیستانی بہت سا مالِ غنیمت لیکر لوٹے۔

گرم سیر کے بعد ملک فتح علی فرح کی طرف آیا تاکہ محمدؐ رضا خان افشار کی حملہ آور فوج کا مقابلہ کرے۔ سیستان کے سب کلانتر بھی ملک کے ساتھ مل گئے لیکن لڑائی کا نتیجہ سیستان کے لئے تباہ کُن ثابت ہوا، یا ملک ہی بیوقوف اور زود اعتماد نکلا۔ کہا جاتا ہے کہ زردست جنگ کے بعد ملک فتح علی اپنے سپہ سالار میر قمبرا اور سربندیوں کے کلانتر محمدؐ رضا خان کے ساتھ ایرانی جرنیل کی معیّت میں دربار نادر چلے گئے جہاں ان تینوں کو بصارت سے محروم کر دیا گیا۔ ملک کو دو دن تکلیف دینے کے بعد مار دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں ہُوا۔

اب بھی ملک محمدؐ حسین کے دو بیٹے زندہ تھے۔ ملک حسین خود ملک محمود شاہ مشہد کا بڑا بھائی تھا۔ یہ سلیمان (بڑا) اور حسین خان ثانی تھے۔ دونو کرچان میں دربار نادری میں تھے۔ ملک فتح علی کے بعد شاہ نے حسین خان ثانی کو حاکم سیستان مقرر کیا۔ لیکن راستے میں افاغنہ فرح کے ایک گروہ نے کمینگاہ سے اس پر حملہ کیا اور فرح کی لوٹ مار کے انتقام کے طور پر اُسے مار دیا۔

ملک سلیمان خان اور اس کے چچا ملک محمود کا بیٹا جعفر خان ایرانی سرزمین پر ہی تھے۔ اوّل الذکر کو شجرۃ الملوک کے مطابق والیِ کاشان بنایا گیا تھا جہاں وہ چار ماہ رہا۔ جب نادر کے بھتیجے اور اس کے قتل کے ترغیب کار عادل شاہ کو شکست ہو گئی اور نادر شاہ کے پوتے شاہرخ مرزا کو شاہ مشہد بنایا گیا تو اس نے کیانی شہزادوں کو اپنے دربار میں بلایا۔

سلیمان خان کو حاکم سیستان اور جعفر خان کو حاکم ہرات بنا دیا گیا۔ اسی کے ساتھ چھوٹا بھائی رستم خان بھی گیا جو کیانیوں کی ہندوستانی شاخ کا مورث ہے۔

جب احمد شاہ درانی نے ہرات پر قبضہ کیا تو وہ قندھار واپس جاتے ہوئے ملک محمود کے بیٹوں، عباس خان، جعفر خان اور رستم خان کو بھی ساتھ لے گیا۔

درانیوں کا ستارہ عروج پر تھا لہٰذا ملک سلیمان قندھار گیا اور دادرسی پر التجا کی کہ اس کے بھائی اس کے ساتھ ہی واپس کر دیئے جائیں۔ احمد شاہ نے جعفر خان اور رستم خان کو جانے دیا لیکن عباس خان کو اپنے دربار میں روک لیا۔

سلیمان خان کیانی ملک سیستان کو حکم ہوا کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ اپنے حاکم اعلیٰ احمد شاہ کی مہم قائن میں مدد کرے۔ ملک سال بھر کے لئے غیر حاضر رہا تو معتبرین سیستان نے گڑبڑ پھیلا دی اور خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ملک سلیمان خان واپس آیا اور اپنا تسلط جمانے کے لئے اسے کئی سال لگے۔ بغاوتوں پر بغاوتیں ہوتی رہیں اور ملک افراتفری کا شکار رہا، لیکن بالآخر اس نے قابو پا لیا۔

۱۱۷۰ھ (۵۷-۱۷۵۶ء) میں اس کی بڑی بیگم (دختر ملک محمود) سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام محمدؐ نصیر خان رکھا گیا۔ جب وہ کچھ بڑا ہوا تو احمد شاہ درانی نے اسے حق آباد اور کاخ کے وسیع و زرخیز علاقے بخش دیئے۔ ملک سلیمان خان اس جاگیر کا قبضہ لینے گیا، تو حق آباد پر ملک محمود شاہ مشہد کے ایک اور بیٹے محمدؐ حسین خان نے معتبرین کے ساتھ اس کا سواگت کیا اور یہ جاگیر بہت عرصے تک ملوک کے پاس رہی۔

اس کے بعد احمد شاہ درانی نے ملک سلیمان کو کرمان پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے لئے اُس نے خی آباد اور خُسف کے نئے قبیلے کے مسلح لوگوں کو بھرتی کیا۔ سیستانی پھر بے قابو ہو رہے تھے۔ لہٰذا کرمان سے پہلے اُس نے اُنہیں ہی منہزم کیا۔

۱۱۸۵ھ (۳-۱۷۷۲ء) میں تیمور شاہ اپنے والد احمد شاہ کے بعد افغانستان کا بادشاہ ہوا۔ اُس نے ملک نصیر خان کے تمام مقبوضات و اعزازات کی تصدیق کر دی۔ ملک سلیمان خان ۱۱۹۶ھ (۲-۱۷۸۱ء) میں چھیاسٹھ سال کی عمر میں فوت ہوا، اور بڑا بیٹا اس کا جانشین ہوا۔ موخرالذکر اور اُس کے بھائی بہرام خان نے اپنی خاندانی ریت کے مطابق اپنے والد کا خوب دھوم دھام سے سوگ منایا جو چالیس دن تک جاری رہا۔ مرحوم کی لاش تدفین کے لئے نجف اشرف بھیج دی گئی۔

تیمور شاہ نے ملک نصیر الدین خان کو اُس کے آبائی مقبوضات پر مستقل کر دیا۔ اور تحائف بھی بھیجے۔ ۱۲۰۲ھ (۸-۱۷۸۷ء) میں اُس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام شجرۃ الملوک کے مُطابق سلیمان خان (دادا کے نام پر) اور دیگر دستاویزات کے مطابق خان جہان خاں رکھا گیا۔

۱۲۰۷ھ (۳-۱۷۹۲ء) میں تیمور شاہ درانی بھی فوت ہو گیا۔ اُس کا جانشین بھی حاکمِ سیستان پر مہربان رہا۔ موخرالذکر کو چند سال پہلے کرمان کی حکومت بھی تفویض ہوئی تھی اور وہ ایک فوج لے کر کرمان گیا تھا تاکہ اپنا اقتدار قائم کرے اور اس پر مؤثر قبضہ کر سکے۔

جب ملک محمد نصیر خان ۱۲۰۸ھ (۴-۱۷۹۳ء) میں فوت ہوا تو نخ کے سرداروں اور معتبروں اور اہلِ سیستان نے ملک بہرام خان کو اُکسایا کہ وہ قابض ہو جائے۔ لیکن بہ کمال ایثار اُس نے انکار کیا اور صرف اپنے بھتیجے کا اتالیق اور سرپرست رہا۔

ملک سلیمان خان (یا خان جہان خان) ۱۲۱۷ھ (۳-۱۸۰۲ء) میں شکار کرتے ہوئے گھوڑے سے گر پڑا اور پھر فوت ہو گیا۔ گو اسے ملک سیستان اور سردار کرمان مقرر کرنے

کے فرامین شاہی موصول ہو گئے تھے اور اس کا چچا اس کا نائب مقرر کیا گیا تھا۔

بعض مسوّدات کے مطابق ملک بہرام اپنے بھتیجے کی موت کے بعد بھی شاہ مشہد ملک محمود کی بیٹی کا نائب رہا جو اپنے پوتے کی موت کے دو سال بعد تک زندہ رہی لیکن اصل اختیار و اقتدار ملک بہرام خان کے ہاتھ میں تھا اور وہی در وبست کا مالک تھا۔

ملک بہرام خان اپنی نسل کا آخری شاہزادہ تھا جس نے سیستان پر حکومت کی۔

اُس کا بڑا بیٹا، ملک محمد جلال الدین خان ۱۲۱۰ (۶-۱۷۹۵ء) میں پیدا ہوا۔ دوسرا بیٹا ملک حمزہ خان ۱۲۱۱ یا ۱۲۱۲ھ (۸-۱۷۹۶-۷ء) میں اور تیسرا بیٹا علی اکبر خان ۱۲۱۴ھ (۱۸۰۰ء) میں پیدا ہوا گو وہ بچپن میں ہی فوت ہو گیا اور اُس کا آئندہ کوئی ذکر نہیں ملتا۔

اسی ملک کے دور میں سیستان میں بلوچوں کی وسیع پیمانہ پر ہجرت ہوئی۔ شجرۃ الملوک کے مطابق حدودِ کوہ سے لیکر مینارِ علمدار تک سارا علاقہ بلوچ خیموں سے ڈھک گیا۔ بام آخری جگہ تھی جہاں مختصر المیعاد زند خاندان کو پناہ ملی جس نے نادر شاہ کے آخری نااہل اور نحیف جانشین سے اقتدار چھینا تھا۔ آخری زند حکمران، لُطف علی کے صوبہ کرمان کے بلوچ قبائل میں بہت سے پیرو تھے۔ بام[1] سے بچکر نکلتے ہوئے وہ پکڑا گیا اور مار دیا گیا جب اُس کے حریف قاچار سردار نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ جب وہ قلعہ اس کے حوالے کر دیا گیا تو اس نے اِرد گِرد کے لوگوں کو نشانۂ انتقام بنایا۔

شکست خوردہ کے ساتھی بلوچی صوبہ کرمان میں نہ ٹھہر سکتے تھے لہٰذا سیستان میں ان خانہ بدوشوں کی ہجرت کرسٹی کے یہاں سے گذرنے سے تھوڑا عرصہ قبل ہی ہوئی ہو گی۔ یہاں سیستان میں لُطف علی خان زند کے پیروؤں کو پناہ مل گئی۔ کیونکہ سیستان افغان بادشاہوں

---

[1] آغا محمد خان قاچار کو زند شہزادے کو حوالے کرنے والے بام کے معتبرین سیستان کے شاہرخی تھے۔

کی سلطنت کا حصّہ تھا اور قاچار سردار کے دائرہ اختیار سے باہر تھا جو احمد شاہ درّانی کی قوّت و شوکت سے اب بھی مرعوب تھا۔

میر محراب کا ایک بھتیجا[1] ناہروئی سردار، عالم خان بامپور کے ارد گرد بسے ہوئے بلوچوں کا سردار تھا۔ وہ بھی قریباً اسی وقت سیستان آگیا جہاں اُسے قلعۂ نو کے پاس آباد ہونے کی اجازت مل گئی۔ اسی ضلع میں اس سردار نے برج میر عالم خان کا گاؤں بسایا جو اب قلعہ کہنہ کہلاتا ہے۔

ملک جلال الدّین خان ابن ملک بہرام خان نائو نوش اور منشیات کا عادی تھا اور سخت زناکار تھا۔ لہٰذا سربندی اور شاہرُخی سرداروں نے اسے سیستان بدر کر دیا۔ اُسے ۱۸۳۵ء میں شاہ کامران سدوزئی حاکم ہرات نے بحال کر دیا لیکن وہ جلد ہی پھر اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ اُس نے بقیہ زندگی جلاوطنی میں ہوکاٹ میں گذاری اور وہیں فوت ہوا۔ آخری وقت اس کے پاس اس کا پوتا محمد عظیم خان موجود تھا جو ہنوز زندہ ہے۔ وہ ۱۲۷۱ھ یا ۱۲۷۳ھ (۵۵-۱۸۵۴ یا ۵۷-۱۸۵۶ء) میں فوت ہوا۔

اسے مستقلاً سیستان بدر کرنے کے بعد سربندی اور شاہرُخی سرداروں نے ملک حمزہ کو برائے نام اختیارات دیکر حاکم بنا لیا گیا تھا۔ ملک حمزہ بھی شہوت پرست تھا اور ان تمام برائیوں کا حامل تھا جو بڑے بھائی میں تھیں لیکن وہ اپنے آپ پر ضبط رکھتا تھا۔ اُس کے اختیارات بھی برائے نام تھے۔ وہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں فوت ہوا۔

ملک جلال الدّین نے چاکن سر کے سردار ابراہیم خان سنجرانی کے ہاں شادی کی تھی اور حمزہ خان نے سہ کوہا کے سربندی سردار کے ہاں۔ ان دونوں متخالف خاندانوں نے ان نوجوان حکمرانوں کو بھی خوب لڑایا اور اُن کے نام پر بیشمار جور و ستم کرتے رہے۔

جلال الدّین[2] ناکارہ، متلوّن مزاج اور حریص اقتدار ثابت ہونے پر جلاوطن کر دیا گیا۔

---

[1] میجر ایبٹ نے اسے ۱۸۳۸ء میں ہرات میں دیکھا اور اسے غیر معمولی طور پر وجیہہ و شکیل پایا۔

کنولی کی سیاحت سیستان (۱۸۳۹ء) تک کیانیوں کا اقتدار جاتا رہا تھا۔ اس وقت سیستان سربندی، سنجرانی، ناہروئی اور شاہرخی سرداروں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ اس سیاح کا سفرنامہ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں ۱۸۴۰ میں شائع ہوا اور اس میں کیانیوں کا کوئی ذکر نہیں اور سفرنامہ سے منسلک جو نقشۂ سیستان اس نے دیا ہے اس میں اسے مذکورہ سرداروں میں بٹا ہوا دکھایا گیا ہے۔

ایک قرن یا اس سے کچھ زیادہ یہ ملوک الطوائف ملک سے کھیلتے رہے اور چھاپوں اور دھاووں کا دور دورہ رہا۔ حتیٰ کہ ایرانیوں نے دوست محمدؐ بارکزئی کے بعد افغانستان کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا اور اپنی سرحد مشرق تک اتنی بڑھا لی جتنی ملوک صغیر کے دور میں تھی اور یوں سیستان کاملاً ایران کا حصّہ بن گیا۔

اختتام روداد سے پہلے اُن نام نہاد بلوچ قبائل کا ذکر ضروری ہے جو سیستان کی حالیہ تاریخ میں اتنے بدنام ہیں۔ ان کی نسل یا ماخذ پر بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ایک علیحدہ شذرہ کا موضوع بن چکے ہیں۔

نادر شاہ کے خلاف مہم میں ملک فتح علی کی فوجوں کا سپہ سالار میر قمبر تھا جو سربندی قبیلہ کا سردار تھا اور کلانتر محمدؐ رضا خان (جو اس بدنصیب مہم میں مذکور ہے) یقیناً میر قمبر کا دوسرا بیٹا تھا۔ یہ عموماً مسلّمہ ہے کہ یہ خاندان سیستان میں ۳۰۰ سال سے آباد ہے اور آہستہ آہستہ اس نے غلبہ حاصل کیا ہے۔ وہ بنوامیہؓ خلیفہ معاویہ کے حریف حضرت علیؓ کے جرنیل ملک الاشتر کی اولاد مشہور ہیں اور لوگ انہیں ایسا ہی مانتے ہیں۔

میر قمبر کا بڑا بیٹا گرچک غالباً سلیمان خان کیانی کے وقت کرمان میں مارا گیا۔ سربندی اور شاہرخی قبائل کو ان مصائب کا حصّہ ملا جو اس ملک کو دبانا پڑی تھیں۔

وہ شکل و شباہت اور وضع قطع میں اتنا موثر و دلفریب تھا کہ لوگ اپنا کام چھوڑ کر اسے حیرت و حسرت سے دیکھتے تھے۔ افسوس کہ اس خود باختگی نے اسے سیستان میں کہیں کا نہ چھوڑا۔

سردار کا پوتا محمدؐ رضا خان نادر شاہ کے حکم پر اندھا کر دیا گیا۔ وہ پانچ بیٹوں میں سے سب سے بڑا تھا۔ اُس نے ملک جلال الدین کی جلاوطنی میں اہم حصّہ لیا۔ وہ کافی عمر میں فوت ہُوا۔ اور سَر فریڈرک گولڈ سمٹ کے مطابق یہ واقعہ ۱۸۴۸ کا ہے۔ اسی محمد رضا خان نے سہ کوہہ کے جنوب میں وہ کنویں کھدوائے جو آج بھی اُس کے نام پر مشہور ہیں۔ اُسے ایک عقلمند اور شفیق حکمران سمجھا جاتا ہے اور اُس کی قبر لوگوں کی زیارت گاہ ہے۔ اس کے آثار کربلا بھیج دیئے گئے تھے۔

مرحوم سردار کا بڑا بیٹا لطف علی اُس کا جانشین ہوا لیکن اُس کے چچا علی خان نے سازش کی، اُسے پکڑا، اور اندھا کر دیا۔ اس کے بعد علی خان سردار بنا۔ یہ اندرونی انقلاب ایک افغانی فوج کی مدد سے برپا کیا گیا۔ جو علی خان نے سردار قندھار سے حاصل کی تھی۔

اس کے بعد علی خان اپنے غصب کردہ اقتدار کو بچانے کے لئے ایرانیوں کی طرف متوجہ ہُوا۔ وہ تہران گیا اور ایک ایرانی شہزادی سے شادی رچائی۔ کچھ عرصہ بعد وہ سیستان آیا۔ اُس نے سہ کوہہ کا شمالی مربع مینار بنوایا یا اسے وسیع کیا اور اسے بُرج فلک سر کا نام دیکر اپنی دُلہن کی رہائش گاہ بنایا۔ لیکن اُس کا زمانۂ اقتدار مختصر تھا۔ جیسے اُس نے اپنے بھتیجے کے خلاف سازش کی تھی اسیطرح وہ واپسی کے دو سال بعد خود بھی ایک سازش کا شکار بن گیا۔ سازشی اُس کی رہائش گاہ میں داخل ہوئے اور اُس کی بیوی کی موجودگی میں اُسے ختم کر دیا۔ شاہزادی واپس ایران چلی گئی۔

علی خان کے قتل کو لوگ بہت معیوب قرار دیتے ہیں کیونکہ اُن کے مطابق سیستان کی خوشحالی اسی کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ وہ یہ قتل اُس کے بھتیجے تاج محمدؐ سے منسوب کرتے ہیں جو اُس کے بعد سردار بنا اور یوں اپنے جرم سے فائدہ اُٹھا گیا۔

میر خان ابن محمدؐ رضا خان (جس کو نادر شاہ نے اندھا کروا دیا تھا) کی ایک بیٹی کی شادی ملک حمزہ خان سے ہوئی جو ملک بہرام خان کا دُوسرا بیٹا تھا۔

ناہروئی ملک بہرام خان کے زمانے میں ہی سیستان میں داخل ہوئے تھے۔ عالم خان کو جو زمینیں ملیں اُن پر اب علی آباد، قلعہ کہنہ اور قلعہ نو کے گاؤں ہیں۔ بُرج عالم یا قلعہ عالم خان قلعہ نو کی پُرانی جگہ پر واقع تھا۔ ان زمینوں کو قابلِ کاشت بنایا گیا ہے لیکن کنولی کے وقت تک یہ عمل ابھی جاری تھا کیونکہ اُس نے بُرج عالم کو ایک ہامون کے سرے پر آباد بنایا ہے۔ اُسوقت یہ اُس علاقے کا بڑا قصبہ سمجھا جاتا تھا۔

ملک عالم خان نے کئی بیٹے چھوڑے لیکن اُس کا دُوسرا بیٹا شریف خان جامع الصفات ہونے کی وجہ سے سردار خاندان بنا۔ وہ بلوچوں کے نظریۂ سرداری کے مُطابق ایک کامل سردار تھا۔ مال و متاع ہو تو وہ خوب سخی اور کشادہ دست تھا۔ وہ تلوار بازی اور نشانہ بازی میں مشہور تھا، اور گو وہ نمود و نمائش اور زبان آوری کا شائق تھا تاہم وہ بلوچوں کا سردار ہونے کی حیثیت سے سیستان میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔

امیر قائن کے بیٹے نے شریف خان کی بیٹی سے شادی کی، اور سیستان کا موجودہ نائب گورنر، میر معصوم خان اسی شادی کا ثمرہ ہے۔ شریف خان کی ایران دوستی نے سیستان پر ایرانی قبضہ ممکن بنا دیا۔ گو آخری دنوں میں وہ ایرانیوں کے خلاف ہو گیا اور گڑبڑ کروادی لیکن اس پر ایران کی گرفت اور بھی مضبوط کر دی گئی۔ یہ ۱۸۹۶ء میں ہوا۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد شریف خان فوت ہو گیا۔ اور اُس کا بڑا بیٹا اس کا جانشین ہوا۔ لیکن جائیداد کا بیشتر حصّہ اُس کے داماد حشمت الملک نے ہتھیا لیا۔

شریف خان کا جانشین سعید خان رود سیستان پر واقع گاؤں خواجہ احمد میں رہتا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں جب حشمت الملک کو طہران حساب کتاب کے لئے بُلایا گیا تو سعید خان خود دربار شاہ میں گیا۔ کہا جاتا ہے کہ چھ آبائی گاؤں اُس کو بحال کر دیئے گئے۔ لیکن وہ سیستان پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں اپریل ۱۹۰۵ء میں فوت ہو گیا۔ اُس کا بیٹا اسکا جانشین بنا ہے۔

شاہرکی یا شاہر گی مبینہ طور پر عراق سے ۹۰۰ سال پہلے سیستان میں وارد ہوئے، وہ

غالباً قدیم خارجی عنصر ہیں جو کسی وقت سیستان و کرمان میں اتنا طاقتور تھا۔

سیستان کی حالیہ تاریخ میں شاہر گی عموماً سربندیوں کے معاہد رہے ہیں تاکہ ناہرویوں اور سنجرانیوں کی بلوچ جمعیت کے مقابلے پر توازن قائم رہ سکے۔ شاہر گی ہمیشہ ہمت، زورِ بازو، اور فقدان فراست میں مشہور رہے ہیں اور تاریخ اس کی گواہ ہے۔ وہ عموماً سربندیوں کے آلۂ کار بنے رہے ہیں اور سردار کو تھوڑا بہت فائدہ ہوتا رہا ہے۔ کسی وقت وہ ہلمند کے ساتھ ساتھ کافی زمین کے مالک تھے لیکن ملکی زوال کا حصہ انہیں بھی ملا ہے۔ وہ کسی وقت لوگوں کے قائد یا کم از کم دُوسروں سے زیادہ طاقتور تھے لیکن اب وہ سربندیوں یا ناہرویوں کے مقابلے پر ثانوی حیثیت کے مالک ہیں۔ شاہر گی زمینیں حُسینکی نظام انہار کے جنوب اور رود سیستان کے شمال میں ہیں۔ ان کے سرداروں کا صدر مقام دُشتک ہے جو گرے پڑے مکانوں کا مجموعہ ہے اور دشت کے ایک ٹکڑے پر بنا ہوا ہے اسی لئے دشتک کہلاتا ہے۔ سیلاب کے دنوں میں یہ گاؤں ایک جزیرہ ہے اور جب دریا کی سطح نیچی ہو تو ایک بند علاقے سے گاؤں تک جاتا ہے۔

ان کا سردار محمد علی خان خاص اثر و رسوخ کا مالک نہیں۔ وہ سیستانی امراء کی طرح عیاشانہ زندگی گذارتا ہے۔ شاہر گی افلاس زدہ ہیں، امنگوں سے محروم ہیں اور بے دست و پا ہیں۔ نائب گورنر یا کارگزار کے دربار میں جو چھوٹی چھوٹی سازشیں ہوتی رہتی ہیں یہ لوگ انہیں کے تلنے بلنے کے اہل ہیں۔

سنجرانی اپنے نسب ناموں کی نسبت زیادہ قدیم ہیں۔ سیستان یا ضلع چاغی کے دیگر اور ہمسایہ قبائل کے مقابلہ پر یہ لوگ قوت و ذہانت میں ان کا لگا نہیں کھا سکتے۔

سربندی یا ناہروئی سرداروں کے مقابلہ پر موجودہ سردار خان جہان خان سنجرانی ایک گنوار، نیم وحشی بلوچ ہے۔ اُس کے والد سردار ابراہیم خان نے نصف صدی سے زیادہ قبیلے پر حکومت کی۔ اسی سردار نے ڈاکٹر فاربس[1] کو قتل کیا تھا۔ یہ ۱۸۴۰ یا ۱۸۴۱ء میں ہوا لیکن

---

[1] ڈاکٹر فریڈرک فاربس ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک سرجن تھا اور قندھار پر ہمارے قبضہ

وہ خود ابھی حال ہی میں ۱۸۹۲ء کے موسم خزاں میں فوت ہُوا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ خان جہان خان کے چار بیٹے تھے۔ معین، علی خان، ابراہیم خان اور جان بیگ۔ دونوں بڑے لڑکے تشدد کا شکار ہوگئے۔ معین کو اُس کے بھائی علی خان نے مار دیا، اور علی خان کو اُس کے نائب (جمالزئی قبیلہ کا ایک بلوچ) نے مار ڈالا۔ یہ نائب بہت با اثر تھا اور گو وہ علی خان اور اُس کے والد کا سالہا سال سے خدمت گذار رہا تھا تاہم نوجوان سردار اُس سے لڑ پڑا' اور اُس پر حملہ کیا جس میں وہ خود ہی شکار ہو گیا۔

سر فریڈرک گولڈسمٹ کے مُطابق علی خان ۱۸۴۰ء میں مرا۔ اُس نے نباتے کے کی قلعہ بند ڈھیری کی چوٹی پر ایک بُرج بنوایا' اور اُس وقت سے اُسے نادعلی کہنے لگے ہیں۔ اسی ڈھیری کے آس پاس علی خان قتل ہُوا یا زخمی کیا گیا۔ اس طرح ابراہیم خان (جو سنجرانیوں کی جہان آباد کی جائیداد کا مالک تھا) سردار قبیلہ بنا۔

ملک بہرام خان کی موت پر کیانیوں کی موروثی جائیداد دریائے ہلمند کی موجودہ پریوں شاخ کے مغرب کی طرف زمین کی ایک تنگ پٹی پر مشتمل تھی۔ حمزہ آباد اور شریف آباد کے درمیان ایک خطِ مستقیم اور پھر اُس کے متوازی جلال آباد سے گذرتا ہُوا ایک اور خطِ مستقیم اس قدیم خاندان کے بیشتر مقبوضات پر محیط ہو جاتا تھا۔ سر بندی بمعہ شاہرگی ایک طرف اور سنجرانی دوسری طرف اسی قطعۂ زمین کو مطمح نظر بنائے ہُوئے تھے۔ جب ملک بہرام خان کے بیٹے اور جانشین، ملک جلال الدین سے دُنیا متنفر ہو گئی اور اُس کے وجود کو عار سمجھنے لگی تو اسے ملک بدر کر دیا گیا۔ اس کے بعد موجُودہ پریوں علاقے کے چھوٹے چھوٹے دیہات

اوّل کے دوران وہ یہاں پہنچنے کے لئے سیستان سے گذرا۔ وہ اِس سے پہلے کُردستان میں سفر کر چکا تھا۔ وہ ایک جرأت مند افسر اور عمیق مشاہد تھا۔ کُردستانی سیاحت پر اُس کا مقالہ رائل جیاگرافیکل سوسائٹی کے جرنل جلد نہم میں طبع ہُوا ہے۔

پر سنجرانی سردار نے قبضہ کر لیا بلکہ وہ تو جلال آباد پر بھی منقار ہوس تیز کئے ہوئے تھا۔ لیکن جلال آباد پر سربندی سردار تاج محمدؒ بھی نظریں جمائے ہوئے تھا اور چونکہ سنجرانی اس کی نسبت زیادہ مضبوط تھے لہٰذا اُس نے ایرانیوں سے مدد مانگی۔ سر فریڈرک گولڈ سمتھ کے مُطابق یہ واقعہ ۱۸۶۶ء میں ہوا اور اُس وقت سے ایرانی سیستان پر حاوی ہوگئے۔ خان جہان خان ابن ابراہیم خان مارچ ۱۹۰۳ء میں سیستان میں واپس آیا۔ اُس کے حالات اچھے نہ تھے۔ صرف چند غلام اور خواتین اُس کے جلو میں تھیں۔ اُسے میاں کنگی میں سیادک اور کچھ اور گاؤں دیئے گئے جو ۱۹۰۴ء میں بھی اُس کی جاگیر ہیں۔ گو وہ بظاہر گنوار اور اُجڈ ہے تاہم وہ کافی زیرک ہے۔ عام اطوار ایک بلوچ خانہ بدوش کے ہیں۔

کیانی خاندان ختم نہیں ہوا جیسا کہ جدول چہارم اور جدول پنجم کے شجرات نسب سے ظاہر ہوگا۔ لیکن اس کے موجودہ نمائندے فرومایہ ہیں۔ گو ابھی تک انمیں اتنا فخر و ناز ہے کہ وہ اپنی بیٹیاں سیستانی سرداروں کو نہیں دیتے تاہم وہ اتنے غریب اور بے اثر ہیں کہ ہمسایہ علاقوں کے سردار ان کی بیٹیاں قبول نہیں کرتے لہٰذا خاندان میں اب بچیوں کی شرح اموات بڑھ گئی ہے۔ کیانی بیٹیاں عموماً سیستان، طبس یا مشہد کے خاندانوں میں بیاہی جاتی ہیں۔ لیکن طبس یا مشہد کے اخراجات سفر بھی نہیں ہیں۔

کیانیوں کی نئی پود کا سرتاج حیدر قلی ابن ملک محمدؒ عظیم خان ہے جو ہنوز افیم وغیرہ سے مبرّا ہے۔ جو نکبت و ادبار میں ان کا واحد سہارا بن گئی ہے۔

سابق گورنر حشمت الملک کو کیانیوں سے دشمنی تھی اور اُس نے ان کا قافیۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کیانیوں نے اُسے بیٹی دینے سے انکار کر دیا تھا۔

ملک گلزار خان کیانی مرحوم کو حشمت الملک نے مجبور کیا کہ وہ اپنی بیٹی کدخدا تاج محمدؒ کو دے۔ یہ آدمی کمین نسل یا طبقہ موسومہ "بہ کُل" سے متعلق تھا اور اس فعل سے بیچارے کیانی کے احساس ناموس پر ایسی چوٹ پڑی کہ وہ مرگ ناگہانی کی نذر ہوگیا۔ جہاں تک قیاس کیا

جاسکتا ہے' کیانی اب شاید ہی سیستان میں سربلند ہوسکیں۔ یہ فقدان جوہر کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی نخوت اور عظمت ماضیہ پر بے جا فخر ومباہات کی وجہ سے ہے۔ لیکن وہ کام کریں یا نہ کریں۔ کام کرسکتے ہوں یا نہ کرسکتے ہوں۔ کم از کم وہ اس بھونڈے اور خود باختہ انداز میں دست سوال تو دراز نہیں کرتے جو سیستانی معاشرہ کے اونچے طبقوں میں معیوب نہیں سمجھا جاتا!

ضمیمہ اوّل

اصلی ماخذ سے سیستان کے کیانی حکمرانوں کا شجرۂ نسب

۱۹۰۴ء

جدول ایک

سیستان کے کیانی حکمرانوں کا شجرۂ نسب
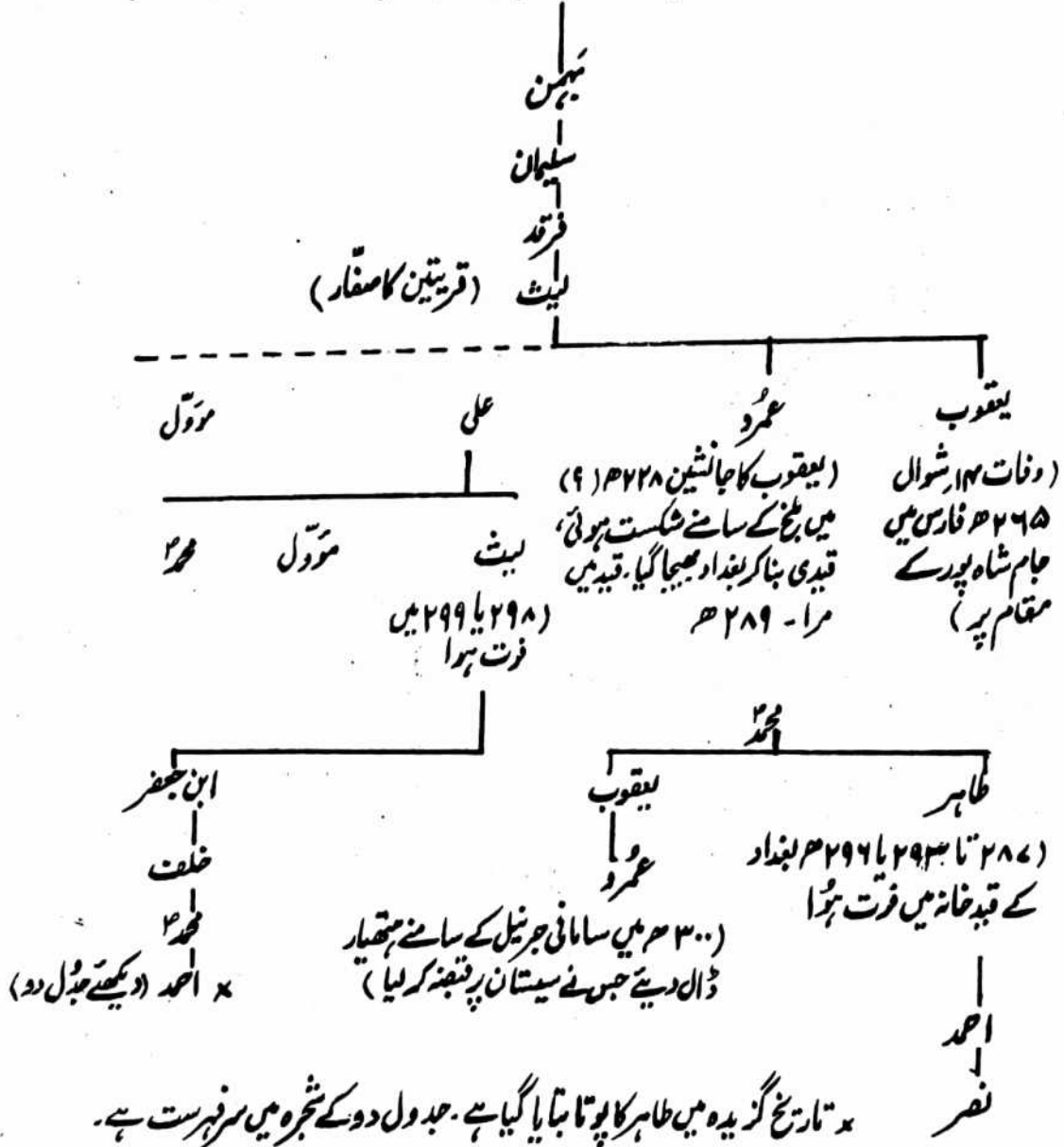
× تاریخ گزیدہ میں طاہر کا پوتا بتایا گیا ہے۔ جدول دو کے شجرہ میں سرفہرست ہے۔

(میجر راورٹی کے ترجمہ طبقات ناصری کے شذرات سے ماخوذ اور شجرات الملوک سے بھی)

جی۔ پی۔ ٹیٹ

ایم۔ آر۔ اے۔ ایس
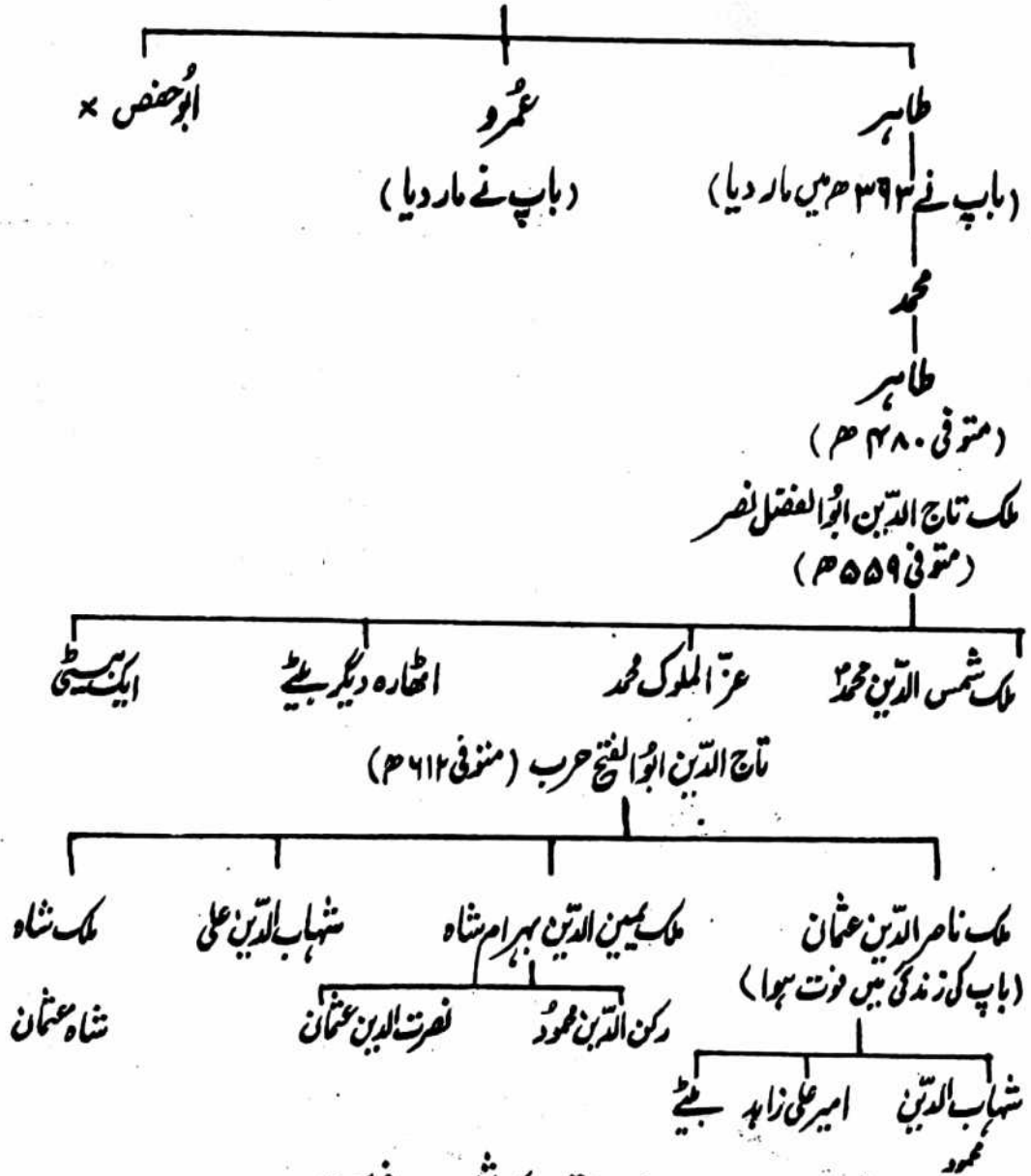
جدول دو
احمد (دیکھئے جدول ایک)
خلف (جلاوطنی میں مرا ۳۹۹ھ)
ابوحفص ×
عمرو (باپ نے مار دیا)
طاہر (باپ نے ۳۹۳ھ میں مار دیا)
محمد
طاہر (متوفی ۴۸۰ھ)
ملک تاج الدین ابو الفضل نصر (متوفی ۵۵۹ھ)
ایک بیٹی
اٹھارہ دیگر بیٹے
عز الملوک محمد
ملک شمس الدین محمد
تاج الدین ابو الفتح حرب (متوفی ۶۱۲ھ)
ملک شاہ
شاہ عثمان
شہاب الدین علی
ملک یمین الدین بہرام شاہ
نصرت الدین عثمان
رکن الدین محمود
ملک ناصر الدین عثمان (باپ کی زندگی میں فوت ہوا)
بیٹے
امیر علی زاہد
شہاب الدین محمود
× یہ جدول تین کے شجرہ میں سرفہرست ہے
جی۔پی۔ ٹیٹ
ایم۔آر۔اے۔ایس

جدول تین
مسوّدہ احیار الملوک مترجمہ جی اے ایلیس آف برٹش میوزم سے ماخوذ بہ اجازت
ابوحفص (دیکھئے جدول دو)
احمد
ناصر
بہاءالدولہ طاہر (متوفی ۴۸۱ھ)
مہربان (شہریار)
خلف
مسعود
شجاع الدین ناصر
شمس الدین علی
(۶۳۰-۵۲ھ)
مبارز الدین ابوالفتح متوفی ۶۴۱ھ
ناصر الدین محمد
(۷۲۸-۶۵۲ھ)
علاء الدین
شاہ بہرام
رکن الدین محمود
شاہ علی
شاہ نصرت
(۷۲۸-۳۱ھ)
شاہ میرانشاہ
شاہ جہانگیر
شاہ ارسلان
چار بیٹے (شاہ بہرام، شاہ ابوالفتح، شاہ ارسلان، ملک شاہ)
عز الدین
(۷۵۳-۸۴ھ)
قطب الدین محمد
(۷۳۱-۴۷ھ)
شاہزادہ محمد
(دیکھئے اگلا صفحہ)
سلطان محمود
(۷۵۱-۵۳)
قطب الدین
(۷۸۴-۸۸ھ)
تاج الدین
(۷۴۷-۵۱ھ)
شاہ شاہان تاج الدین
(۷۸۸-۸۰۵ھ)

۱ ۱۹۰۳ میں سیستان میں زاہدان میں اس کا مزار چوالیس راہیوں کے روضہ میں پایا گیا

۲ دیکھئے جدول چار بحیثیت حاکم وقت

جی ۔ پی ۔ ٹیٹ

ایم ۔ آر ۔ اے ۔ ایس

جدول چار
ملک محمودؒ، متوفی ۹۹۵ھ (دیکھئے جدول تین)
جلال الدین محمد خان (۱۰۲۸-۹۹۵ھ)
ابو الفتح
× ملک حمزہ (صرف ایک بیٹی، نرینہ اولاد ندارد)
۱۰۲۸-۵۵ھ
نصرت خان ۸۵-۱۰۵۵ھ
فتح علی خان
(۳۴-۱۱۰۴ھ)
× جعفر خان
(۱۰۸۵-۱۱۰۴)
اسد اللہ خان ۳۹-۱۱۲۴، پہلے دعویدار پھر حکمران
محمد حسین خان
شاہ محمود
کلب علی (مزید ذکر ندارد)
لطف علی (مکران مارا گیا)
فتح علی (نادر کی نذر ہوا)
سلیمان خان (۹۶-۱۱۳۰ھ) دیکھئے اگلا صفحہ
حسین خان ثانی (افغانوں نے مارا ۱۱۶۰ھ)
محمد حسین خان
ملک جعفر
عباس خان
(اولاد طبس میں رہتی ہے)
ملک رستم خان
بیٹی سُلیمان خان
محمود خان
محمد خان
سکندر خان
ملک خان
غلام حیدر خان
(اولاد ہند میں آباد۔ دیکھئے جدول پانچ)
(دیہہ خانم شاخ۔ دیکھئے جدول پانچ)

(یہ چھٹوں ۱۹۰۴ میں میاں کنگی بیں دولت آباد میں رہتے ہیں)

نوٹ :- یہ جدول شجرۃ الملوک اور سیستان میں مقیم افراد خاندان سے ملنے والی معلومات پر مبنی ہے۔

× ملک حمزہ اور جعفر خان ایرانی شہزادیوں کے بیٹے تھے لہذا سابقہ اولاد پر فوقیت رکھتے تھے —

متن دیکھئے - جی پی ٹی -

جی پی ٹیٹ
ایم - آر - اے - ایس

جدول پانچ
ہندوستانی شاخ (کوہاٹ، پنجاب)
غلام حیدر (رستم ابن شاہ محمود کی اولاد میں سے ۔ دیکھئے جدول چار)
خان بہادر ملک جان خان
شیر محمد خان
غلام حسین خان
غلام حسن خان
زکریا خان
زبردست خان
نثار خان
سکندر خان
سردار علیخان
مراد علیخان
رمضان علیخان
سکندر خان
فریدون خان
محمد یوسف خان
شبیر علیخان
عبدالصمد خان
عبداللہ خان
عبدالرحمن خان
رستم خان
عبدالعزیز
عبدالمعبود
عبدالمبین
عبدالوہاب
غلام احمد خان
عبدالغفور خان
کیانیوں کا دیہہ خانم (سیستان) گھرانا ۔ رستم ابن شاہ محمود کے ایک بیٹے کی اولاد (دیکھئے جدول چار)
ملک خان
محمد امیر خان
محمد علی خان
منصور خان
بہرام آباد گھرانا (سیستان) فتح علی خان ابن الثالث ملک حمزہ کی اولاد (دیکھئے جدول چار)

فتح علیخان

بہرام خان

اولاد

یہ معلومات خاندان کے زندہ افراد سے حاصل کی گئی ہیں۔

جی پی ٹیٹ
ایم ۔ آر ۔ اے ۔ ایس

حصّہ دوم

سیستان کے جُغرافیائی خَدوخال

باب اوّل

سیستان کے جغرافیائی خدوخال

مُلک کا طبعی حُلیہ اُس کے اندر ہونے والے تغیّرات کے لیئے واحد ماخذِ معلومات ہے۔ اِن تغیرّات نے اپنے نشان چھوڑے ہیں جن میں سے کچھ اب اِتنے مدھم ہوگئے ہیں کہ نہایت عمیق مشاہدہ ہی اُنہیں پہچان سکتا ہے۔ کیونکہ ان پہ بعد کے تغیرّات نے جو آثار منقّش کئے ہیں ان سے جغرافیائی تبدیلیوں کا سِلسلہ ٹوٹ گیا ہے اور ان سے نتائج اخذ کرنا آسان نہیں رہا۔ سِیستان کے کھنڈرات چند مُستثنیات کے سِوا ملک کی تاریخ مرتّب کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتے اور مقامی روایات اور اساطیر المتاخرین نہایت محتاط تجزیوں کے بعد ہی قابلِ قبول ہوسکتی ہیں۔

اندرُونِ ملک کے طاس

موجودہ سیستان اندرونِ ملک جھیلوں کے طاسوں کا ایک سِلسلہ ہے جو وسط ایشیائی جغرافیہ کا طُغرائے اِمتیاز رہا ہے اور جس میں سے بحیرہ کیسپئن اور بحیرہ ارال اہم ترین ہیں۔ بلوچستان اور ایران میں یہ طاس خلیج فارس کی حدّ آب کے شمالی علاقوں میں مِلتے ہیں۔ وہ ندیاں جو اِس حدّ آب کے سلسلوں کی جنوبی ڈھلانوں سے نکلتی ہیں سمندر میں گِرتی ہیں۔ لیکن جو ندیاں شمالی سِلسلوں سے برآمد ہوتی ہیں وہ ہامون یا بّری طاسوں میں گِرتی ہیں۔ بلوچستان میں ہامون لورڑا اور ہامون ماشخیل ہیں، لیکن یہ عموماً خشک ہوتی ہیں اور چکنی مٹّی کے وسیع قطعے ہیں جہاں کہیں کہیں نمک کے ذخیرے موجود ہیں۔ دریائے لورا اور دریائے ماشخیل سے آنے والا پانی اِتنا کم ہوتا ہے کہ وہ عملِ تبخیر سے اُڑ جانے والی رطوبت کی تلافی نہیں کرسکتا۔ ہامونِ سیستان میں تین دریاؤں کا پانی گِرتا ہے جن میں سے

ہر ایک وسیع علاقے کو سیراب کرتا ہے اور ان کے طاس کوہ ہندوکش کی جنوبی ڈھلانوں پر واقع ہیں جہاں آب و ہوا ساز گار ہے اور برف و باراں یہاں کے چشموں کو مملو رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان دریاؤں سے کافی ساحلی علاقہ سیراب و شاداب ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر اپنا فاضل پانی ہامون کی نذر کر دیتے ہیں۔ طغیانی کی وسعت ایک جیسی نہیں ہوتی اور سال بسال بدلتی رہتی ہے۔ ہامون کا کبھی تھوڑا حصّہ اور کبھی زیادہ حصّہ سیلاب کی زد میں آتا ہے۔ لہٰذا ہامون کے طاس کا محیط بھی اکثر معرضِ تغیّر میں رہتا ہے، سوائے اُن جگہوں کے جہاں چٹانیں حدبندی کرتی ہیں۔

چار طاس یا ہامون

مُلک میں چار طاس ہیں۔ ہامونِ پُزہ ساوری کے مشرق میں، ہامونِ ساوری شمال مغربی گوشہ طاس میں، تیسرا کوہِ خواجہ کے شمال میں اور اس کے اور ساوری کے درمیان۔ آخر میں دریائے سنگی ہے جو کوہِ خواجہ کے جنوب میں ہے۔ جب پانی اِن طاسوں میں داخل ہوتا ہے تو یہ ان کے اندر چھوٹے چھوٹے طشتری نما نشیبوں (پائینگ) میں پھیل جاتا ہے۔

ڈیلٹے

نامعلوم صدیوں سے ہلمند، فرح رود اور خاش رود اپنی گذرگاہوں میں گاد جمع کرتے رہے ہیں اور اپنے ڈیلٹے بناتے رہے ہیں۔ مغرب سے پہاڑیاں ایک چوڑا پشتہ بناتی ہیں۔ ہلمند اور دوسرے دریاؤں کے بنائے ہوئے ڈیلٹے آگے کو دھکیل دیئے گئے ہیں اور وہ چھوٹے چھوٹے ڈیلٹوں سے مل گئے ہیں جو ہر وادی کے دہانے پر موجود ہیں۔ جن سے کبھی کبھار طغیانیاں خارج ہوتی ہیں اور مغربی پہاڑیوں سے روانہ ہوکر ہامون میں جذب ہوتی ہیں۔

ہاموں کے آر پار سڑکیں

جہاں یہ مقابل ڈیلٹے ملتے ہیں وہاں ایک چوٹی یا لُرگ بن جاتی ہے۔ یہ تعداد میں تین ہیں۔ پہلی لُرگ ہلمند اور فرح رود کی قدیم گذرگاہوں کی قدیم گاد کے ذخیروں سے بنی ہے۔ سیستان سے جوین تک کی شاہراہ اسی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ دوسری لُرگ کوچۂ افضل آباد کہلاتی ہے۔ یہ مشرق میں ہلمند کی

قدیم گاد اور مغرب میں دریائے ہندان کے چھوٹے ڈیلٹے کے رابطہ سے وجود میں آئی ہے۔ مؤخر الذکر میں پانی شاذ و نادر ہی آتا ہے۔ تیسری رُگ ہلمند کی ایک نہایت ہی قدیم گذرگاہ کے ذخیرۂ گاد سے بنی ہے جو اُس چھوٹے سے ڈیلٹا کے مقابل آگئی ہے جسے مغربی پہاڑیوں میں بلوچپ اور تُرشُپ پپ کے درّوں سے برآمد ہونے والی ندّیوں نے متشکّل کیا ہے۔

یہ رُگ آہستہ آہستہ بڑھتی ہیں اور انہیں خالی آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں۔ لیکن بڑے سے بڑا سیلاب سب سے آخر میں خشکی کے اِن قطعوں پر پہنچتا ہے اور سطحِ آب کم ہوتے ہی یہ سب سے پہلے نظر آنے لگتی ہیں۔

سیستان اور برجند یا مشہد کے درمیان کی شاہراہ طاس ہامون کو کوچۂ افضل آباد کے ذریعے پار کرتی ہے اور ایران کی ٹیلیگراف لائن بھی یہیں سے گزرتی ہے۔ جب یہ رُگ ڈوب جاتی ہے تو مسافروں اور ان کے سامان کو کشتیوں کے ذریعے پار لے جاتے ہیں۔ تیسری اور جنوبی ترین رُگ ہامون سیستان اور گادِ زرہ کے درمیان ایک حدّ فاصل ہے۔ جو ہامون سیستان میں پانی کی آمد اور بلند ترین سیلاب اور تیز ترین ہوا کے موسموں میں ہی قابلِ عبور ہو سکتی ہے۔

مخالف ڈیلٹے لہردار خطوط رابطہ سے ملتے ہیں اور وہاں بھی جہاں نچلی سطحوں پر ایک ہامون اور دُوسری ہامون اور ایک چُنگ اور دُوسری چُنگ کے درمیان بغلی ملاپ کے سلسلے موجُود ہوں۔

چونکہ طغیانی میں ہلمند کے پانی کی مقدار فرح اور خاش کے پانیوں سے زیادہ ہوتی ہے اور مغرب سے آنے والی وادیوں کے پانی سے تو بہت ہی زیادہ ہوتی ہے لہٰذا اُن کے لہردار خطوطِ رابطہ اور تشکیل دادہ گذرگاہیں ہاموں کے مغربی اور شمالی ساحل سے قریب ہوتے ہیں۔

چُنگ

یہ ڈیلٹائی پنکھے طشتری نما طاس بناتے ہیں جنہیں چُنگ کہتے ہیں اور جب بہت سے چُنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں تو وہ صاف پانی کے وسیع قطعے بن جاتے ہیں جنہیں ہاموں کہتے ہیں۔ چُنگ اور ہاموں دونوں کے سروں اور کناروں پر سرکنڈوں اور گھاس کے گھنے ذخیرے پیدا

ہو جاتے ہیں کیونکہ یہاں زمین آبی پودوں کی نشو ونما کے لیے سازگار ہوتی ہے ۔

آشکن

سرکنڈے تو گڑھوں میں اُگتے ہیں لیکن ہاموں کے کنارے کے ساتھ ساتھ جو علاقے سالانہ زیرِ سیلاب آتے ہیں لیکن ہمیشہ زیرِ آب نہیں رہتے آشکن کہلاتے ہیں۔ ان کے اُوپر جنگلی کھردری گھاس کی چادر بچھی ہوئی ہے جو مویشیوں کے لئے بہترین چارہ ہے ۔

ہامونِ سیستان

ہامونِ سیستان اس عظیم طاس کا صرف وہ حصّہ ہے جو ملک کے موجودہ حدود اربعہ کے اندر واقع ہے ۔ یہ کھوکھلی زمین کے ایک بڑے قطعہ کے صرف ایک حصّہ پر حاوی ہے جس کے جنوبی سواحل لجاکوہ پہاڑیوں اور کوہ سلطان کے شمالی پشتہ کے سرے پر مشتمل ہیں ۔ اس وسیع علاقے کی مغربی حد پلنگان پہاڑیوں کے پشتہ اور بندان پہاڑیوں کی مشرقی طویل ڈھلان پر مشتمل ہے ۔

گادِ زرہ

اگر ہم ہلمند کے ڈیلٹا کو اس کے وسیع ترین معنوں میں لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِس نشیب کے بہت بڑے رقبہ پر محیط ہے ۔ گادِ زرہ کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اور یہ صرف اس عظیم نشیب کے سرے یا اس کے انتہائی مشرقی حصّہ پر واقع ایک رخنہ ہے ۔

شیلا

شیلا کی سب سے گہری گذرگاہ (جو ہلمند کا ہی ایک تسلسل ہے) پانی کو گاد تک پہنچنے کا موقع دے دیتی ہے اور یہ ایک لہردار خطِ رابطہ ہے جو ہلمند کے ڈیلٹا کے جنوبی سرے اور نشیب کے مقابل ڈھلان کے درمیان واقع ہے ۔ ہلمند کا یہ ڈیلٹا ہی اصلی سیستان ہے ۔ یہ سیلاب آوردہ مٹی اور درشت یعنی کنکروں کی سطح مرتفع پر مشتمل ہے جس میں اوّل الذکر کا دو تہائی اور موخر الذکر کا ایک تہائی شامل ہوتا ہے ۔

ہم نے دیکھ لیا کہ اِس علاقے کی جنوبی اور مغربی حدود کیا ہیں ۔ اِس کی مشرقی حدود وہ ڈھلان ہے جو غور اور زمینداور کے پہاڑی اضلاع کے پہلوؤں سے جنوب کی طرف پھیلی ہوئی ہے ۔

خاش، فرح، ہاروت اور خوسپاس رود

اِس ڈیلٹا کو خاش اور فرح رود بھی سیراب کرتے ہیں اور دوسری کم اہم ندّیاں بھی، جیسے خوسپاس رود جو فرح اور خاش کے طاسوں کے بیچ میں بہتی ہے۔ اوّل الذکر کے مغرب کی طرف کے ہاروت رود کو بھی ان وسیع سٹیپ کے میدانوں کا پانی مہیا ہوتا ہے۔ لیکن ہاروت رود ان ندّیوں سے معمور نہیں ہوتا جو اِس کے مغرب کی طرف کی پہاڑیوں سے نکلتی ہیں اور صرف کافی بارش کے سالوں میں ہی ایک دو سیلاب اس میں سے گزر کر ہامونِ سیستان کے ساوری رخنہ تک پہنچتے ہیں۔

خاش رود، پہاڑیوں میں ایک جگہ دلآرام سے نکلتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا ضلع ہے جس میں کئی دیہات ہیں۔ دلآرام اور سیستان کے درمیان اور دونو سے مساوی فاصلہ پر خاش کا چھوٹا سا زرخیز ضلع ہے۔ موخر الذکر اور سیستان کے درمیان اگرچہ دریا کے دونو کناروں پر تھوڑی سی قابلِ کاشت زمین ہے۔ لیکن خاش کے نیچے کسی اور جگہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ قابلِ کاشت زمین دشت اور ندی کی گذرگاہ کے درمیان حلقوں یا کھاڑیوں کی شکل میں ہے جس میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا مخصوص نام ہے۔

زرخیز اضلاع کا ایک سلسلہ — قلعۂ کاہ، فرح، سبزوار (قدیم اسفرار) سیستان کو ضلع ہرات کے زرخیز علاقوں سے مربوط کرتے ہیں اور اس کے مغرب کی طرف خاف کے اضلاع واقع ہیں جن سے پرے مشہد کا علاقہ ہے۔

اپنے محلِ وقوع کی بدولت سیستان ہمیشہ دائمی پانی کا مالک رہا ہے جسے آبپاشی کے مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا یہ ان علاقوں کی نسبت ہمیشہ خوشحال اور سرسبز رہا جو اسے شمال اور مشرق کے وسیع تر ممالک سے ملاتے ہیں۔ ایک بے آب وگیاہ صحرا کا قریباً ۵۰ میل چوڑا ٹکڑا ایک خطِ مستقیم میں ضلع خاش کو ہلمند پر واقع زرخیز اضلاع گرشک یا قلعۂ بست اور قندھار سے جُدا کرتا تھا۔

سیستان کے جنوبی اور جنوب مغربی حصے

جنوب اور جنوب مغرب میں صحرائی یا نیم صحرائی علاقے بام اور مکران اور سیستان کے زرخیز

اضلاع کے درمیان حائل ہیں۔ مغرب کی طرف کوہستان اور کائنات کا پہاڑی علاقہ ہے۔

سیستان کا جداگانہ محلِ وقوع

جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے سیستان ہمیشہ کافی حد تک اپنے ہمسایہ ممالک سے الگ تھلگ رہا ہے اور اِس سے اس کی تاریخ و تہذیب بھی متاثر ہوئی ہے۔ یہ صورتِ حال قدیم الایام سے موجود رہی ہے۔ مختلف اوقات میں ہلمند کی تبدیلیٔ گذرگاہ نے حالاتِ زندگی کو متاثر ضرور کیا ہے، لیکن اِس کا اثر مقامی رہا اور مُلک کی عام ہیئت جوں کی توں رہی۔

قدیم جھیل میں بتدریج خشکی

سیستان کا ایک ذہنی جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ یہاں عملِ یبوست برسرِکار رہا ہے۔ جھیل کا طاس کسی وقت بہت گہرے پانی سے مملو ہوتا تھا جبکہ ہامون کا موجودہ پانی قدیم رقبہ کے صرف ایک تہائی تک موجود ہے۔ اِسی وجہ سے یہ قصّہ مشہور ہے کہ سیستان کی قدیم جھیل کو حضرت خضرؑ کے حکم پر جِنّوں نے بھرا تھا اور چونکہ اِس کام میں صرف آدھا دِن لگتا تھا لہٰذا ملک کو نیمروز کہتے تھے۔ سیستان کے جنوب میں پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیاں اولیأ کے ناموں سے موسوم کی گئی ہیں اور اولیأ کے قصّے زمینی حرکات سے منسوب ہیں۔

رمد تھان غیبی اور کُلچہ تا زمین کی سطح میں پڑنے والی دراڑوں میں غائب ہو گئے جو اِن دیومالائی ہستیوں کے اندر آنے کے بعد بند ہو گئیں۔ پیر سلطان بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کوہ سلطان میں غائب ہو گیا۔ شیخ حسین کو بھی زمینی شگاف نے ہڑپ کر لیا اور یہ اُسی کی ہمنام چوٹی پر ہُوا۔ یہ قدیم روایات اِس لئے معنی خیز ہو جاتی ہیں کہ یہ اُن مقامات سے متعلق ہیں جو آتش فشانی سرگرمیوں کا مرکز رہے ہیں یا ایسے مراکز کے قریب واقع ہیں۔

ملک کا بیشتر حصّہ سیلاب آوردہ مٹّی سے بنے ہوئے ڈیلٹوں پر مشتمل ہے جو کسی وقت یقیناً زیرِ آب تھے۔ جھیل میں گرنے والا دریائی پانی بھی پہلے بہت زیادہ ہوتا تھا۔ جب دریائی پانی کم ہُوا تو جھیل بھی سُکڑنے لگی اور عملِ یبوست نے صدیوں میں موجودہ صورتِ حال پیدا کر دی۔

قدیم سواحل

گہری کھاڑیوں اور خلیجوں کے سرے پر کنکریلے ساحلوں کی لمبی قطاریں ملتی ہیں جو قدیم جھیل نے پتھریلی سطح مرتفع میں پیدا کر دی تھیں اور جو شاید ہلمند کے ڈیلٹا کو وقت کے ارضیاتی ادوار میں پیش کرتی ہیں۔ یہ ساحل اب ان خلیجوں پر دیکھے جا سکتے ہیں جو اب ساوری ہاموں کے سواحل میں دندانے دار دراڑیں ڈالتے ہیں۔ فرح رود کے موجودہ پشتہ پر دریائی گذرگاہ کے شمال کی طرف کنکروں کا ایک ساحل بن گیا ہے جو ہاموں کی موجودہ سطح آب سے پورا دس فٹ اونچا ہے۔

کنکروں اور سنگریزوں کے سواحل پر شمالی ڈیلٹا میں سیلاب آوردہ مٹی کی تہیں جمی ہوئی ہیں اور جہاں کہیں آبی عمل یا انسانی کوشش سے یہ تہہ ہٹ گئی ہے تو دیر سے مدفون سواحل کے حصے نظر آتے ہیں اور کنکر اور سنگریزے مٹی کی سطح سے کئی فٹ نیچے تک دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ایسا ہی ساحل قدیم شاہرستان کی ڈھیری کے پاس بھی ملا تھا۔ اسی کا ایک تسلسل اُس وقت منظر عام پر آیا جب افغانوں نے ۱۹۰۲ء میں دریا کی نادعلی اور پریون میں تقسیم کے عین اوپر کچھ کٹائی کی۔ مشن کے ساتھ منسلک ایک سرویئر خوابگاہ سے چھ سات میل دُور ایک ساحل سے ایک پتھر لایا جو ایک پاؤنڈ وزن کا تھا۔ خوابگاہ پہلے مذکور ساحل سے آٹھ میل اُوپر تھی۔ اسی لئے اس میں فرسودہ چٹانیں اور پتھر درشت اور بھاری بھر کم ہوں گے۔ آب زدہ پتھر جو سروتر کے قرب وجوار میں اتنے فراواں فراواں ملتے ہیں غالباً کسی دبے ہوئے قدیم ساحل کے ہیں جنہیں ہل تہوں سے باہر لے آتے ہیں۔ ساحلوں یا آب زدہ سنگریزوں کے کناروں کا تہہ بہ تہہ سلسلہ ثابت کرتا ہے کہ کسی قدیم زمانے میں جھیل کا پانی اُترتا رہا ہے اور ہر کنارہ اپنی جگہ اس تخفیف آب کے کسی مرحلہ کا مظہر ہے۔ آثار کے بعد چڑھاؤ بھی آتا تھا اور دریاؤں میں طغیانی آتی تھی جس کے دوران موجودہ زرخیز مٹی کی تہہ جمی ہوئی ہے۔ اس کے بعد خشکی کا دَور شروع ہوا اور اس کے عمل سے جھیل اپنی موجودہ جسامت تک پہنچی ہے۔

یہ کنارے آبی عمل سے بنے ہیں جو تیز ہواؤں کا مرہونِ منت ہے۔ جو موسم گرما میں یہاں کا

معمول ہیں ایسے کنارے اِنہی محرکات کی بناء پر اب بھی تشکیل پا رہے ہیں۔ کنکر زیادہ تر گول تودوں کے چھلکوں سے ماخوذ ہوتا ہے جو دشت کی مٹی کو ڈھکے ہوئے ہیں۔ جب پانی چکنی مٹی کو کھاجاتا ہے تو چکنی مٹی ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی گول تودے ٹوٹ جاتے ہیں اور چٹانوں پر پانی کے عمل سے نذرِ انتشار ہوجاتے ہیں۔ خوبصورت آب زدہ خزف ریزے موجوں کے غسلِ مسلسل سے اِدھر اُدھر پھیل جاتے ہیں جب یہ کھاڑیوں اور شگافوں میں داخل ہوتی ہیں۔ کنکر بھی وقت کے ساتھ ساتھ ڈھلتے رہتے ہیں اور کھاڑیوں کے دہانوں کی ڈھلانوں پر بل دار ڈھیروں کی صورت میں جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر سیلاب آوردہ مٹی ان ڈھیروں کے پیچھے جمع ہوجاتی ہے اور کنکر کسی قدرتی سطح مرتفع کا جھیل کی طرف کا چہرہ بشرہ معلوم ہوتے ہیں۔

بعد کے ادوار میں جب پانی اپنے موجودہ محدود رقبے تک آگیا تو ہوا کی تیز رفتاری نے سیلاب آوردہ مٹی کی تہہ کو اڑا دیا اور کنکروں کا کنارا اپنی جگہ عُریاں ہوگیا جو سطح زمین سے دس فٹ یا اس سے زیادہ اونچا ہوگا اور جس کے اطراف دیدہ زیب ہوں گے۔ ہلمند کے ارضیاتی ڈیلٹا کی بعض درزوں میں یہ کنکریلے کنارے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لازماً اردگرد کی راس کی ڈھلان میں ضم ہوجاتے ہیں اور بل کھاتے ہوئے دراڑوں کے دہانوں کے آس پاس پھیل جاتے ہیں۔

چٹانوں پر پانی کے نکاس کا خاص انتظام نہیں ہوتا اور لوگ کنکریلے کناروں کو مصنوعی سمجھ لیتے ہیں گویا یہ پرنالے ہوں۔ لوگ انہیں انسان ساختہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہیں رستم نے بند کا کام دینے یا آبپاشی کا مقصد حاصل کرنے کے لئے بنایا تھا۔

سیستانی چکنی مٹی کی قسمیں

سیستانی چکنی مٹی کی قسمیں قابلِ غور ہیں۔ آج کل کے سیلابی ڈیلٹا میں بھی ان کا تنوع قابلِ دید ہے۔ ریتلی زمین یا گارے کے قطعوں کے اردگرد ایسے قطعے ہیں جہاں زمین سخت اور درشت سفید چکنی مٹی ہے۔ اوّل الذکر ہمیشہ ہریاول سے ملبوس رہتی ہے جس میں مختلف قسم کے جنگلی اور پہاڑی پودے شامل ہیں۔ موخرالذکر ہمیشہ ہریاول سے عاری ہوتی ہے۔ اصل میں اس کی سطح ہموار اور

سخت ہوتی ہے۔ لہٰذا بادآوردہ بیج اِس پر ٹھہر نہیں سکتے اور روئیدگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر اِس کی سطح میں معمولی سی بھی درز ہو جو ہوا کی زد میں ہو اور جہاں ریت جمع ہو سکے تو ہریالی کا امکان ہوتا ہے۔ چکنی مٹی دو قسموں کی ہے۔ ایک قسم نرم ہے جس میں کھریا مٹی کا کافی عنصر ہے اور دوسری قسم سخت ہے۔ بالکل پتھر کی مانند۔ یہاں کے لوگ موخرالذکر کو سریا کم پکارتے ہیں۔ یہ اُفقی تہوں میں ہوتی ہے۔ ایک تہہ پیلی سُرخی مائل بھورے رنگ کی ہوتی ہے اور دوسری پیلی سبزی مائل خاکستری رنگ کی۔ یہ تہیں بعض اوقات اِتنی باریک ہوتی ہیں کہ اِنچوں میں ماپی جاسکتی ہیں۔ خاکستری کے بعد بھوری، دونوں کی مہین پرتوں کے سلسلے اور پھر کئی فٹ گہری تہیں! وہ مہیب ملبہ جس سے سیستانی طاس کی مشرقی اور شمالی سرحد بنی ہے، زیادہ تر اسی سخت کِم یا سرکا بنا ہوا ہے۔ پانی کا عمل مٹی کی اِس قسم کو مزید سخت کر دیتا ہے۔ طاس سیستان کے بہت سے حصوں میں جو ہاموں کے کناروں پر ہیں کِم کی الگ تھلگ چٹانیں ہیں جو جذبِ آب کو روکتی رہی ہیں جو رد کے نہ رُک سکا اور سیستان کا نشیب وجود میں آ ہی گیا۔

یہ الگ تھلگ چٹانیں سطح سمندر سے اتنی ہی بلند ہیں جتنا مشرقِ ملک کا سیلاب آوردہ مٹی کا ڈیلٹا۔

کوہِ خواجہ اور کوہِ چکّو کی بکھری بکھری پہاڑیاں ایک اناڑی مشاہد کو لاوا کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جو اُفقی ہیں اور کِم کی اُفقی یا قریباً اُفقی تہوں پر ایستادہ ہیں۔ کوہِ چکو میں لاوا کی تہہ کے بالکل نیچے ایک تیز سُرخ یا نارنجی تہہ ہے جو پکائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کوہِ خواجہ کے مغربی سرے پر لاوے کی تہہ کِم کی تہہ سے دب جاتی ہے۔ دشت کی چکنی مٹی پر سنگریزوں کی ایک تہہ جمی ہوئی ہوتی ہے جس میں نہایت خوبصورت خزفریزے بھی پائے جاتے ہیں اور جو نہایت آسانی سے منتشر بھی

۱۔ اِسی قسم کی لاوا پوش پہاڑیاں ہاموں کے مغرب، نیٹی کی سمت اور کوہِ بلنگان کے مغرب میں بھی موجود ہیں۔ اِن مسطح پہاڑیوں کو بلوچی لازماً سام کوہ پکارتے ہیں۔ مثلاً امیر چاہ کنزوں (کوہ سلطان) کے شمال میں سام کوہ کا معائنہ ای وَریڈن برگ اسکوائر نے ۱۸۹۹ء میں کیا۔

ہو جاتی ہے۔ یہ تہہ ملائم مٹی پر ہی ہوتی ہے۔ نزولی ترتیب کے لحاظ سے پہلے ملائم مٹی آتی ہے، پھر کم۔ اور کنوؤں میں سطح زمین کے نیچے آب آور تہہ یا تو ریتلی مٹی ہوتی ہے یا خالص ریت جو چھ سے آٹھ فٹ موٹی ہوتی ہے اور اس کی بنیاد سخت ترین اور ٹھوس ترین قسم کی سرایت ناپذیر کم پر ہوتی ہے ان یکے بعد دیگرے سخت اور نرم تہوں کی وجہ سے کنوئیں تھوڑے عرصہ بعد گر جاتے ہیں۔ اسی لئے ان میں تمرسس کی شاخیں اور بانس کی کھپچیاں بیچ بیچ میں دی جاتی ہیں۔ مختلف کثافتوں کی تہوں کا یہ سلسلہ سطوحِ مرتفع میں بھی ملتا ہے۔ ہوا نرم تر مٹی کو جھاڑ دیتی ہے اور تہہ کے گہرے اثر پذیر حصوں کو بھی جھنجھوڑتی ہے جس سے چٹانیں آب زدہ معلوم ہونے لگتی ہیں اور وقفے وقفے سے مٹی کے بڑے بڑے ڈلے اور قطعے گرنے لگتے ہیں۔ دشت کی ڈھلان کے اوپر چشموں کی قطار جو کوہ چکو کے دامن میں کھاڑی کے اوپر ہے ایک نرم تہہ کی وجہ سے وجود میں آئی ہے جو کم کی ایک سخت اور ٹھوس بالائی اور زیریں تہہ کے درمیان موجود ہے۔ اس دشت کی ڈھلان ہاموں کی طرف ہے اور تہ زمین کا پانی نفوذ پذیر تہوں کے ذریعہ سے چٹان کے اوپر ظاہر ہو جاتا ہے۔ جہاں نرم تہوں کے نیچے چٹانی کم تقاطرِ آب سے بھیگ جاتی ہے اور پانی بالآخر نیچے کے ساحل پر پہنچ جاتا ہے اور پایاب جوہڑ بن جاتے ہیں۔ سرکنڈے اور تمرسس کی جھاڑیاں مٹی کی آب خوردہ تہہ پر پلتی ہیں اور جہاں دشت میں گھاٹیاں بن گئی ہیں اُن کی گذرگاہوں میں پانی کی ایک ہلکی سی دھار بہہ نکلتی ہے جو نشیبوں میں جمع ہو جاتا ہے اور تمرسس کی جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے جھنڈوں کے درمیان نالوں کی شکل اختیار کر جاتا ہے جو آبی گذرگاہوں اور اُن کے کناروں پر اُگتے ہیں۔ یہ پانی اتنا کھاری ہوتا ہے کہ استعمال نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ جانور اسے سونگھتے بھی نہیں۔

بادِ تند و تیز کا عمل

سیستان کے بعض حصوں میں ہوا کی طاقت اپنا مظاہرہ کرتی رہتی ہے۔ کافی رقبوں پر ملائم مٹی کی بالائی تہہ پوری کی پوری اڑا دی گئی ہے اور کم کا ہموار فرش صاف نظر آنے لگا ہے۔ بعض علاقوں میں بالائی تہہ صرف جزوی طور پر ختم ہوئی ہے۔ جہاں کہیں سخت تر مادے کی تہیں یا پٹیاں

موجود تھیں وہاں ہوا کی دخل اندازی اور دست درازی کی مزاحمت ہوئی ہے اور ان طویل ڈھیریوں نے غیر مساوی کثافت کے پیوند اوڑھ لئے ہیں جو موجودہ دور میں ہوا کے رُخ پر ہیں۔ ان ڈھیریوں کے ہوا کی طرف کے سرے چٹانی اور نسبتاً مدوّر ہیں اور مخالف سرے بہت تیزی سے اونچائی اور موٹائی دونوں میں پتلے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جب اِن کی درمیانی نرم مٹی ہوا اڑا کر لے جاتی ہے تو یہ ڈھیریاں نمایاں شناختی نشانات کا کام دیتی ہیں، جیسے ریلوے انجینئر کھدائی کرتے وقت اس کی پیمائش کے لئے چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں یہ ڈھیریاں بہت زیادہ ہوں وہاں کا علاقہ ایک وسیع قبرستان معلوم ہوتا ہے جو جنّوں کی قبروں سے بھرا ہوا ہو۔ اِن میں سے بہت سی ڈھیریاں پندرہ سے لے کر چالیس فٹ تک اونچی ہیں۔ لہٰذا کٹاؤ کے عمل اور ہوا کی سرگرمی سے نرم مٹی کو ہٹانے کے لئے بھی کئی صدیاں لگی ہوں گی۔ ان شناختی نشانات کی ایک ہی سمت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گرمائی ہواؤں کا رُخ صدیوں سے تبدیل نہیں ہوا اور وہ وہی ہے جس پر موجودہ زمانے میں بھی وہ چلتی ہیں۔

سخت سفید مٹی یا کَم کے میدان

کَم کا فرش اتنا سخت ہوتا ہے کہ اس میں خیمے کی چوبی میخیں گہری نہیں ٹھونکی جاسکتیں۔ اگر یہ بہت نگر لکڑی کی نہ بنی ہوئی ہوں تو یہ ٹوٹ جاتی ہیں یا ان کے سرے بھُر جاتے ہیں۔ سخت سفید مٹی جو بلند کے موجودہ ڈیلٹا میں موجود ہے، قریباً یکساں کثافت کی ہوتی ہے۔

اِس سے جو میدان وجود پذیر ہوتا ہے وہ ایک عجیب و غریب منظر ہوتا ہے کیونکہ یہ ہریاول سے قریب قریب عاری ہوتا ہے۔ بعض متروکہ نہروں میں جو اس کی وسعتوں سے گزرتی ہیں، ریت جمع ہو گئی ہے اور اِن میں ایک خود رَو پودا تاگز (صحرائی تمرسس) یا سلسولہ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کا سامان پیدا کر لیتا ہے۔ ایسی مُستثنیات کی وجہ سے سفید مٹی کی یکسانیت مسلط رہتی ہے۔ اِس کی سفید

۱۔ ایک مچھلی کی شکل کا، جب اسے اس کی پُشت پر سے دیکھا جائے۔

سخت سطح قریباً ہموار ہے اور یہ سورج کی کرنوں کو آئینہ کی طرح منعکس کرتی ہے۔ آب و ہوا کا عمل اس میں ایک بھربھراہٹ پیدا کر دیتا ہے جیسی کہ سفید چینی مٹی کی سطح پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اصل میں ہُم کی بنیادی تہہ کی وجہ سے بلوچ کنوؤں کو اتنا کھودتے بھی ہیں اور پھر بھی یہ پانی کے لئے غیر نفوذ پذیر ہی رہتے ہیں۔ تحت الزمین پانی ان لہردار خطوط میں جمع ہو جاتا ہے جو اس کی سطح میں موجود ہیں اور جب کوئی کنواں ایسے کسی خط یا رخنہ کو چھو جائے تو وافر پانی حاصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ چاروں طرف سے نشیب کی طرف بہتا چلا جاتا ہے۔ خشک کنوؤں کا معائنہ ظاہر کرتا ہے کہ غیر نفوذ پذیر اور نفوذ پذیر تہوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اسے چھیدنے کی کوشش کریں تو تھیلے میں ٹکڑے اور ڈھیلے ہی آتے ہیں، نرم مواد نہیں۔

جھیل کے پانی کو منتشر کرنے کا طریقہ

ہاموں طاس کی گذرگاہ بھی صدیوں کے دوران بہت سے گڑھوں سے بھر گئی ہے اور غیر نفوذ پذیر ہُم کی نچلی تہہ کی وجہ سے پانی کا جذب ہونا ناممکن ہو گیا ہے۔ جھیل کے رقبہ میں پانی کی کمی قریباً قریباً عمل تبخیر کا نتیجہ ہے لہٰذا جذب آب سے نقصان برائے نام ہی ہوتا ہے۔ عمل تبخیر شدت و حدت گرما اور تیز شمال مغربی ہواؤں کی وجہ سے بہت تیزی سے جاری رہتا ہے۔ جھیل ان قدرتی کارکنوں کے لئے ایک وسیع سطح کا کام دیتی ہے اور چونکہ پانی کی اوسط گہرائی زیادہ نہیں اس لئے نمی تیزی سے زائل ہوتی ہے۔ اگر سیلاب مداوانہ کریں تو سطح آب میں کمی بہت تیز ہو اور اگست تک ٹرگ یا فواصل آب سے جھیل کو پار کیا جا سکتا ہے۔ پھر فرش میں چھوٹے چھوٹے نشیب بھی سوکھ جاتے ہیں اور یہ عمل شروع ہو جائے تو بہت تیزی سے جاری رہتا ہے اور جب پانی کی گہرائی گھٹتی جاتی ہے تو صرف زیادہ گہرے اور بڑے رقبوں کے طاسوں میں ہی کچھ پانی باقی رہ جاتا ہے۔ مچھلیاں پایاب پانی میں مر جاتی ہیں اور خشک شدہ جُھنگوں کے سروں پر ہزاروں چھوٹی مچھلیوں کے لاشے دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۹۰۲ء کی خشک ہاموں

۱۹۰۲ء میں ہلمند خشک ہو گیا۔ قریباً ۶۲ دن کے لئے اس کی گذرگاہ میں پانی بالکل نہ رہا اور

ہاموں مشمولہ بہ ساوری طاس (جو ہاموں کے طاسوں میں عمیق ترین ہے) قطعاً خشک ہو گئی - تیزی سے خشک ہونے والے طاس کو دیکھ کر اہلِ سیستان جوق در جوق مچھلیاں پکڑنے کے لئے بھاگے، جو اِس میں جمع ہو گئی تھیں اور پانی کے اڑنے کے ساتھ ساتھ ہزاروں کی تعداد میں مر رہی تھیں انہوں نے ساوری کا قدیم قصبہ بھی چھان مارا جس کی بنیادیں کئی فٹ پانی میں ہیں۔ انتہائی زنگ خوردہ سکّے اور تانبے کی مُہریں تباہ شدہ دیواروں اور گرتی ہوئی اینٹوں کے ملبے سے اُنہیں ملیں اور وہ اُنہیں فروخت کے لئے لے گئے۔ جنہوں نے اِن کھنڈرات کو دیکھا ہے وہ بتاتے ہیں کہ یہ ایک اچھا خاصا بڑا قصبہ تھا اور اِس کی بنیادوں اور دیوارسازی میں پختہ اینٹیں استعمال کی گئی تھیں۔ ہاموں کے دوسرے حصّوں میں پکی اینٹوں کے بنے ہوئے کنوؤں کے نشانات ملے ہیں۔ جہاں کہیں پانی کم ہُوا ہے اور طاس کا فرش نظر آنے لگا ہے، اینٹوں کے بھٹے بھی دریافت ہوئے ہیں جو سالانہ سیلاب کی حدود کے اندر ہیں۔ غرقابی کی وجہ سے اینٹیں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں اور صرف مٹی یا چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں موجود ہیں جنہیں پانی نے ملائم اور فرسودہ کر دیا ہے۔ بھٹوں کے صرف شیشہ نما حصّے کسی حد تک برقرار ہیں۔ یہ قدیم بھٹے افتادہ اینٹوں کے گیروئے رنگ اور شیشہ نما مٹی کے ڈھیروں کی موجودگی سے واضح طور پر پہچانے جا سکتے ہیں۔ کچھ مٹی پگھلانے والی بھٹیوں کے فضلہ سے بہت حد تک مشابہ ہے۔

سیلاب کا علاقہ

ہاموں کے مشرقی اور جنوبی ساحلوں کا علاقہ عموماً اُس وقت زیرِ سیلاب آجاتا ہے۔ جب پانی کی سطح ایک خاص بلندی تک آجاتی ہے لیکن جب پانی کی سطح اِس سے نیچے گر جائے تو یہ علاقہ خشک یا قریباً خشک ہو جاتا ہے۔ بلند ترین سیلاب اور درمیانہ یا نچلے درجہ کے سیلاب کے درمیان انتہائی حدود کا علاقہ مربع میلوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اِس رقبہ میں قدیم قلعوں، نہروں، مقبروں اور کاشانوں کے کھنڈرات افراط سے ہیں۔ گرمی اور سیلابی موسموں میں پانی کے عمل کی وجہ سے یہ بے شکل یا بدشکل ضرور ہیں اور ہَوا نے اپنے زور سے اِن کے نمایاں

زاویئے بھی نذرِ فرسودگی کر دیئے ہیں۔ تاہم اُن کی بنیاد و تعمیر کا مقصد ضرور ظاہر ہو گیا ہے۔ اینٹ پختہ ہو یا دھوپ میں سوکھی ہُوئی، ان پر نمک کی ایک موٹی تہہ جم جاتی ہے جو پورے منظر کو ایک عجیب و غریب برفانی رُوپ دے دیتی ہے۔ شور کے سفید اور چمکتے ہوئے ٹکڑوں کے سروں پر تمرسں اور سُلسولہ اُگ آتے ہیں اور اُن کے پتّوں کا کالا رنگ شور کی سفید تہہ کو اور بھی شوخ کر دیتا ہے اور وہ انسان کی ہُنرمندی اور اُس کے انہماک و مہارت کا ناقابلِ انکار ثبوت ہیں۔

سیلاب میں انسان کی کارگُذاری

یہ فرض کرنا ناممکن ہے کہ انسان نے اپنے رہائشی مکانات یا نظامِ انہار (جن کے آثار اب تک موجود ہیں) کسی ایسے محلِ وقوع میں بنائے ہوں گے جو سیلاب کی زد میں ہو۔ کھنڈرات کی موجودگی جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ثابت کرتی ہے کہ وہ مقامات جو اَب سیلاب کے نشیب و فراز کی گذرگاہ میں ہیں، کسی وقت طغیانیوں کے اثرات سے محفوظ و مبّرا تھے۔

قدیم نہریں کُھلی ہوئی کھائیاں نہ تھیں جو اَب ملبے سے ڈھک گئی ہیں۔ بلکہ کافی حجم اور جسامت کی مضبوط تعمیرات تھیں اور ان کی اپنی گذرگاہیں تھیں اور ان کے اپنے کنارے تھے جو زیرِ آب پاشی زمینوں سے اونچے تھے۔ چونکہ ہلمند، فرح اور خاش کا پانی پچھلے ایک ہزار سال میں کوئی خاص کم نہیں ہُوا اور شاید اِس سے بھی مزید ایک ہزار سال قبل میں بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہُوا۔ لہٰذا یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دریاؤں نے خود ہی اپنے دہانے بدل دیئے ہیں۔ اور ہلمند اور فرح رود کے حوالے سے اسی کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

نوٹ: طاسِ سیستان سطحِ ارضی کے بالا وقاف بیٹھنے سے وجود میں آیا ہے۔ سب سے نچلے حصّہ میں کوہِ خواجہ ایک نشانِ شناخت کے طور پر موجود ہے۔ اِس کی چوٹی طاس کے مشرق کی طرف کے دشتِ بلند کی ہم سطح ہے۔ بھٹیوں اور گرمی کے زیرِ اثر بنیادی کم میں تبدیلی وغیرہ نے نچلی تہوں کو مضبوط و محکم بنا دیا ہے۔ طاس کے اِردگرد ڈھلوان چٹانوں کے خطوط اصل میں ٹوٹ پھوٹ

کے خطوط ہیں جن پر آب و ہوا نے اپنے اثرات مرتسم کیے ہیں۔ مختلف بلندیوں کی سطوح مُرتفع پر نرم خزف ریزوں کا ایک غلاف سا چڑھا ہُوا ہے اور ان میں باہمی تمیز یکے بعد دیگرے نشیب پذیری کے عمل سے ہی ہو سکتی ہے۔ ڈھلوان چٹانوں کے ننگے چہرے خزف ریزوں کی صرف ایک تہہ کو ظاہر کرتے ہیں جو تازہ ترین دشت ساز تہہ کی چوٹی پر ہے۔ کوئی متحجر چیزیں نہیں ملیں۔ تہوں کے بعض حصّوں میں ایک کھُردرے چُونے کی گلٹیاں بھی موجود ہیں۔

جی۔ ٹیٹ

باب دوم

فرح اور خاش رود کے ڈیلٹے اور جھیل کا بیان

دریائی گذرگاہوں میں تبدیلیاں

قدیم مقامات کی شناخت اور پُرانے مصنّفین میں مذکور جگہوں کی نشان دہی سے بھی زیادہ دلچسپ اور اہم بات یہ ہے کہ سیستان میں جو تغیرات ہُوئے ہیں اُن کی کھوج لگائی جائے۔ یہ تغیرات دریاؤں کے آوردہ ہیں جو جھیل کو سیراب کرتے ہیں۔

ہلمند میں سب سے زیادہ پانی ہے اور وہ ایسے تغیرات کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہے اور چونکہ اِس کے اثرات بہت دُور رس ہیں اور بقایا آبادی کو متاثر کرتے ہیں۔ لہٰذا انہیں بعد میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

خاش رود کا ڈیلٹا

جھیل سیستان کے طاس کے انتہائی مشرقی سرے تک پہنچنے سے پہلے ہی خاش رود قریباً اپنی دریائیت کھوبیٹھتا ہے۔ جونہی یہ خاش کے نیچے دشتوں کے جنگل سے چھوٹتا ہے تو اس کی گذرگاہ ایک چوڑے خاکی میدان میں گم ہوجاتی ہے جسے اُس نے خود ہی صدیوں میں تشکیل دیا ہے۔ اس کی طغیانی اس میدان پر پھیل جاتی ہے اور اسے زرخیز بنا دیتی ہے۔ فاضل پانی ایک نشیب میں جمع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ عملِ تبخیر سیلاب کے موسم کے بعد اسے ہَوا میں تحلیل کر دیتا ہے۔ سالانہ معرضِ سیلاب میں آنے والا علاقہ آشکن کہلاتا ہے۔ پانی اڑنے کے بعد یہ ریوڑوں کی چراگاہ بن جاتا ہے۔ اس کے جنوبی سرے پر ایک طشتری نما طاس ہے۔ چُنگ دراز گو جس میں ہلمند کی کئی نہروں کا فاضل پانی جذب

ہو جاتا ہے۔ جب آبشکن خشک ہو جاتا ہے تو بھی اس چینگ میں پانی ضرور ہوتا ہے۔ زمانۂ قدیم کی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ دریائے خاکش کا پانی کاشت کاری کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے اور چونکہ اس میں پانی مستقل نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے ڈیلٹا میں کوئی خاص قابلِ ذکر پہلو نہیں۔

فرح رود کا ڈیلٹا

فرح رود کا حال مختلف ہے۔ صدیوں میں اس نے اپنا رستہ شمال کی طرف کی پہاڑیوں کے پشتہ کے چوڑے احاطہ میں سے بنایا ہے اور اس کی آخری ڈھلان سے پرے جاکر باہر نکلتا ہے جو سیستانی نشیب کے طاس کے اُوپر ہے۔ یہ سیدھی ڈھلان ملک کا ایک واضح اور نمایاں خاصہ ہے اور یہ اونچے ڈیلٹائی احاطہ کا جنوبی سرا ہے۔ اس کے جنوب میں محض جزیرے اور اونچی سطح مرتفع کے ضمنی خدوخال ہیں جو اس کے اور جھیل بدامن نچلی سطحوں کے درمیانی رشتہ کا کام کرتے ہیں یہ درمیانی راستہ زیادہ سے زیادہ قریباً ۱۶ میل لمبا ہے اور دریائے فرح اس زاویئے پر ڈیلٹا میں داخل ہوتا ہے جو زیریں دشت کے مشرقی سرے کے بالائی دشت میں ضم ہوتے ہوئے بنتا ہے۔

اس نقطہ پر فرح رود اونچے پشتہ کی گود سے نکلتا ہے اور قریباً نصف میل چوڑی گھاٹی سے باہر آجاتا ہے۔ دریائی گذرگاہ کے عین اُوپر کا مشرقی دشت نیچا ہے اور مشرقی طرف کے فراز کا ایک قدمچہ ہے جو ایک زاویہ یا کھاڑی بناتا ہے جس کی حد واضح چٹانوں کی ایک قطار ہے جو دُور سے دیکھی جاسکتی ہے۔ گھاٹی کی مغربی طرف قریباً ۲۰۰ فٹ اُونچی عمودی چٹانوں کی ایک قطار ہے جو دشت کے ایک بڑے کنکریلے تودے سے بنی ہے اور جس کے دامن میں دریا بہتا ہے۔ سطح مرتفع کے جنوب مشرقی کونے پر لاش کا قلعہ ہے اور ضلع کا انتظامی صدر مقام جوین دریا کے مشرق کی طرف نچلے دشت پر واقع ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے۔

گھاٹی کے جنوب کی طرف سیلاب آوردہ مٹی کا ایک چھوٹا سا قطعہ ہے جس کے پرے بلند زمین کا ایک ٹکڑا ہے جو کنکریلے پتھروں کی بنی ہوئی ہے۔ ابتداء میں یہ نچلے دشت کی ڈھلانوں تک پھیلی ہوئی تھی جو مغرب کی طرف واقع ہیں اور جن سے اب یہ سیلابی مٹی کی تنگ پٹی کی وجہ سے

جدا ہو گئی ہے۔ نچلی سطح مرتفع کو رتت کے ساتھ ساتھ فرح رود کی تین قدیم گذرگاہوں نے کاٹ دیا ہے۔ یہ تینوں ہامونِ پُزہ کو سیراب کرتی تھیں۔ پہلی گذرگاہ قدیم موجودہ گاؤں لاقان کے قریب ہے اور مین مشرق کی طرف مڑتی ہے اور اب یہ سیلابی مٹی کی ایک چوڑی پٹی سے پہچانی جا سکتی ہے جس میں کھنڈرات اور کئی درختانِ سرو ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قدیم گذرگاہ کسی وقت آباد تھی اور نہر سے سیراب ہوتی تھی۔ دوسری گذرگاہ قدیم مقام دارگ کے آگے سے نکلتی ہے اور اس کے نچلے سرے پر زاہک کا گاؤں ہے جہاں عارضی طور پر ساروُنی رہتے ہیں جن کے خیمے کھنڈرات کی وجہ سے چھُپے رہتے ہیں۔ یہ بھی قدیم دَور میں ایک رستا بستا گاؤں تھا۔ تیسری گذرگاہ بھی دارگ کے مشرق کی سیلابی مٹی کی پٹی سے نکلتی ہے اور نچلے دشت میں کھنڈرات کے بیچ میں سے چلتی ہے۔ یہ کھنڈرات ایک بڑے زرخیز رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں جو سالہان کے موجودہ گاؤں کے اردگرد ہے۔

یہ قدیم دریائی گذرگاہیں زرخیز مٹی کی پٹیوں سے پہچانی جاتی ہیں جو خشک ہوں یا سرسبز لیکن اپنی مٹی کے رنگ اور کنکریلی سطح مرتفع[۱] کے رنگ سے نمایاں ہو جاتی ہیں جس سے یہ گذرتی ہیں اور جو ان کے دورویہ نیچے لیکن واضح کنارے کا کام کرتی ہے۔

ان میں سے پہلی گذرگاہ سب سے بڑی ہے۔ یہ عریض تر ہے اور اس کی مٹی پر گھاس کی چادر نہیں جو اس علاقے کی دیگر مٹی پر فوراً اُگ آتی ہے۔ عُریاں مٹی ظاہر کرتی ہے کہ دریا نے یہاں زیادہ تر سخت مٹی یا کم چھوڑی ہے جس پر ہریالی کے فقدان کا ذِکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان کی انتہائی جنوبی گذرگاہ کے نیچے کنکریلی سطح مرتفع ریتلی مٹی کے نیچے دب جاتی ہے جو بعد کے ادوار میں دریائی ڈیلٹا کا اہم عنصر بن گئی ہے۔ صرف کو لمارت کے کھنڈرات کے شمال کی طرف کنکروں کا ایک

ع[۱]۔ یہ علاقے کے نیچے بیٹھنے کے عمل کی اوّلین منزل ہے جس میں دشت کی کنکریلی سطح کی ساخت پہچانی جا سکتی ہے۔ فرح رود اور اس کی قدیم گذرگاہیں (ہلمند کی طرح) ٹوٹ پھوٹ کے خطوط پر چلتے ہیں۔

چھوٹا سا قطعہ اِس نچلی سطح مرتفع کا آخری نشان بن کر دکھائی دیتا ہے۔

موجودہ زمانے میں فرح رود دشت کی طرف زیادہ بہتا ہے جو اونچی سطح مرتفع کا ضمنی خدوخال ہے اور اس سے ماورا جنوب کی طرف کو باہر نکلتا ہے۔ ندی کی گذرگاہ جنوب کے کچھ مغرب کی طرف ہے۔ اس کے موجودہ ڈیلٹا سے قریباً پانچ چھ میل اُوپر دریا کا پایاب پاٹ گہرا ہو جاتا ہے۔ اور آخری پانچ چھ میلوں میں یہ چالیس فٹ گہرا ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ ہامونِ ساوری سے زیادہ گہرا ہے جس میں اِس کا سیلابی پانی گرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فرح رود اپنے آخری چھ میل میں آب ایستادہ کا ایک ذخّار تالاب ہے جس کے کناروں پر تمرس، درختانِ بید اور درختانِ حور اُگے ہوئے ہیں صاف اور ساکن پانی ہریالی کی سجاف کے اندر دریا کی چوڑائی کے ساتھ مل کر بے کیف گرد و پیش میں بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتا ہے، وہ گرد و پیش جو سیلابی مٹی کے چٹیل اور بادرُفتہ میدانوں میں یا شور کے وسیع بدنصیب رقبوں یا سرکنڈوں کی گذرگاہوں پر مشتمل ہے۔

اپنے آخری ۷ یا ۸ میلوں میں فرح رود اپنی پرانی گذرگاہ کا چکّر کاٹتا ہے۔ یہ کیفیت اس حد تک ہے کہ اگر دونو گذرگاہوں کے سِرے لمبے ہو کر ملیں تو ملاپ سے بننے والا زاویہ، زاویہ قائمہ سے ۲۰ درجے کم ہوگا۔ آخری حصّہ کی سمت شمال مغربی ہے۔ ہلمند کے ڈیلٹا کے مقابل ساحل کے برعکس، فرح رود کا زرخیز ڈیلٹا اپنی ایک مخصوص حد کا مالک ہے جسے آج تک غالباً کوئی سیلاب پار نہ کر سکا۔ ۱۸۸۵ (سالہائے نوحؑ کا آخری) میں بھی ہاموں کا پانی اِس خطِ ساحل سے اوپر نہ بڑھا۔ اس کے پرے یعنی مشرق اور جنوب کی طرف کوئی واضح حد نہیں کہ ہم اسے ہاموں کا سرا کہہ سکیں۔ صرف شور کے کچھ قطعے یکے بعد دیگرے "نیزار" میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ مسطح قطعے قدیم تہذیب کے نشانات سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ مختلف طول و عرض کی موسم زدہ قبریں دیکھی جا سکتی ہیں جہاں دورِ قدیم میں انسانی بستیاں ہوتی تھیں۔

ہاموں کی تہہ پر انسانی کارنامے

ہاموں کے فرش پر انسانی دستکاری کے نشانات ہیں جو اب صرف اُسی وقت نمایاں

ہوتے ہیں جب پانی سرے سے غائب ہو جاتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ڈیلٹا کا پھیلاؤ جسے ہلمند نے اتنا آگے بڑھایا کہ یہ فرح رود کے ڈیلٹا کے نچلے حصہ سے آملا اور اس کے اوپر چھا گیا یوں بنا جب اوّل الذکر اپنا سارا یا بیشتر پانی ہاموں کے شمالی حصّہ میں براہِ راست گراتا تھا۔ جب یہ پانی رُکا تو ڈیلٹا فوراً ننگا ہو کر صرف ایک عام خشک قطعہ رہ گیا جس میں انسان آباد ہو سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہاں آبادی ہُوئی اور چونکہ اس کے نشانات ہمیشہ یا سالانہ زیرِ آب ہوتے ہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ ڈیلٹا میں بہت تغیرّات ہوئے ہوں گے جن کی وجہ سے ہلمند کا سیلابی پانی ہاموں پہنچتا تھا۔ ان تغیرّات نے موجودہ ہاموں کو صدیوں تک خشک زمین رہنے دیا ہوگا۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ یہ تغیّر تاریخی ادوار میں ایک سے زیادہ دفعہ ہُوا۔

فرح رود کا ڈیلٹا

ہلمند کے ڈیلٹائی تغیرّات کے مطالعہ سے پیشتر بہتر یہی ہوگا کہ ہم فرح رود اور اس کے ڈیلٹا کا بیان پورا کر لیں۔

فرح رود کے کنارے اس کے منبع کے نزدیک ایک مرئی ہونٹ معلوم ہوتے ہیں جو دریا سے ترچھے چلتے ہیں۔ یہ اِس چیز سے اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے کہ ریت کے ساکن ٹیلوں کی ایک قطار جس پر کافی ترس اُگی ہُوئی ہے کناروں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور یہ منبع سے دو میل ورے شروع ہوتی ہے۔

دائیں کنارے کے ٹیلے مقابل کناروں کے ٹیلوں سے زیادہ اونچے ہیں۔ وہ ایک نشیبی فاصلِ آب بناتے ہیں جو کئی میلوں سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ریت عام صحرائی ریت کی نسبت کھُردری اور گاڑھے رنگ کی ہے۔ لیکن اس پر ترس کی اتنی افراط ہے کہ سب کچھ اسی کے نیچے چھپا ہُوا ہے اور اس کی شاخوں اور تنوں کا ہلکا سُرخی مائل بھُورا رنگ اِس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ٹیلے کنکروں یا اینٹوں کے ملبہ کی ڈھیریاں ہیں۔ ندی کی گذرگاہ کے ہونٹ سے بہت سی فالتو پانی کی نالیاں نکلتی ہیں جو ہاموں کے طاس کی نشیبی زمین میں گم ہو جاتی ہیں۔ اِن میں سے ایک نالہ پیشہ وران کے کھنڈرات کے پاس

سے گذرتا ہے اور ہاموں کے رقبہ میں خاران کے ٹبہ (ڈھیری، ٹبہ) کے پاس ہی غائب ہو جاتا ہے۔ دوسرا نالہ کہنی سے نکلتا ہے اور ہاموں کے کھاری قطعوں اور گڑھوں میں کھو جاتا ہے جو خاران کی ڈھیری کے مغرب کی طرف ہیں۔ تیسری نالی بہت چھوٹی ہے اور ہاموں میں ہی غائب ہو جاتی ہے۔ کناروں کے اُٹھے ہوئے سرے فرح رود کے موجودہ دہانے تک برقرار رہتے ہیں اور ان پر تمرسں اور بید کے درختوں کا جنگل اُگا ہوا ہے۔ آبِ ساکن کی سطح کے اوپر بعض جگہوں پر کناروں کی اونچائی ۱۳۰ فٹ تک ہے۔

فرح رود کے دہانہ اور اس کے مشرق میں خطِ ساحلی کے درمیان سیلابی زرخیز مٹی کا ایک قطعہ ہے جو ایک اونچے کنکریلے کنارے کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ مؤخر الذکر ہامون ساوری کی سرمائی سطح آب (۱۹۰۴) سے ۱۰ فٹ تک اُونچا ہے اور ایک پشتہ کا کام کرتا ہے جس کے عقب میں زرخیز مٹی جمع ہو گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت فالتو پانی کی ایک نالی تھی جو فرح رود کے ایک گوشے سے نکل کر ہاموں کی سمت میں ساحل کا رُخ کرتی تھی۔ اب یہ نالی غائب ہو چکی ہے۔ کنارے کی چوٹی (جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا) مٹی سے قریباً ۵ فٹ بلند ہے اور اس طرح جو سطح مرتفع بنی ہے وہ بنّوں گھاس سے ڈھکی ہوئی ہے اور تمرسں کی جھاڑیاں مٹی اور خزف ریزوں کے سنگھم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ کنارہ ایک بے قاعدہ چکر کھاتا ہے اور جنوب کی طرف کم واضح ہو جاتا ہے اور بالآخر ندی کے بائیں کنارے سے نصف میل کے فاصلے پر زرخیز مٹی میں کھو جاتا ہے۔ فرح رود نے اپنا راستہ اسی میں سے تراشا ہے اور اس کی وجہ سے دریا کم از کم سردی میں دہانے کے پاس قابلِ عبور ہو جاتا ہے۔ گو اس پتن سے تھوڑا اوپر یہ اتنا گہرا ہے کہ پار نہیں کیا جا سکتا۔ دریا کے مغرب یا بائیں طرف اس کنارے کا تسلسل دریافت کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن مقابل ساحل پر یہ ڈھلوان ہو کر ہاموں کے موجودہ کنارے تک آ جاتا ہے۔ ایک دوسرے قدیم کنارے کے بھی مدّھم سے آثار ہیں۔ یا خزف ریزوں کی ایک عقبی پٹی کے، جیسی کہ ابھی ابھی بیان کی گئی ہے۔

فرح رود کے ڈیلٹا کی قدیم نہریں

فرح رود اپنی موجودہ گذرگاہ میں کئی صدیوں سے بہہ رہا ہے۔ اس کی پرانی گذرگاہیں ماقبل تاریخ دور کی ہیں۔ قدیم نہروں کے جو نشانات ہمیں ہاموں کی موجودہ ڈھیریوں میں ملتے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نہریں اسی دریا کی اسی گذرگاہ سے سیراب ہوتی تھیں۔ بعد میں نکلنے والی نہریں بھی اسی دریا سے برآمد ہوئیں جیسا کہ یہ ۱۹۰۴ میں تھا اور ان کے آثار موجود ہیں۔

آبی گذرگاہیں یقیناً تین قدیم دریائی گذرگاہوں میں چلتی تھیں اور ہاموں پُزہ کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ علاقے میں پانی تقسیم کرتی تھیں۔ اس قدیم نہری نظام اور پیشہ وران کے آباد قصبہ کے نہری نظام میں صرف یہ فرق تھا کہ پرانی نہریں بعد کی نہروں کی نسبت بالائی دریا سے نکلتی تھیں اور زیادہ محنت و احتیاط سے بنی تھیں۔ اِن کا پانی مشرق کی طرف ایک بڑے موڑ سے ہوتا ہُوا سالہان کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ زاہک اور سالہان کی زمینوں کا کچھ حصہ بلا شک و شبہ ان نہروں سے سیراب ہوتا تھا جو پُرانی گذرگاہوں میں بہتی تھیں اور تنگ وادیوں کو کاٹ کر اِن گذرگاہوں میں داخل ہوتی تھیں۔

نہروں اور ڈھیریوں کے قدیم ترین کھنڈرات اور بعد کے کھنڈرات (جو ۱۸۸۵ کے سیلاب کی سطح کے اوپر کے میدان پر کثرت سے بکھرے ہوئے ہیں) کے درمیان وقت کا بہت بڑا فاصلہ ہے۔ بعد کے دَور کی نہریں تعداد میں زیادہ تھیں اور اِن میں سے بعض تو یقیناً دائمی تھیں۔ کیونکہ دو کی گذرگاہوں میں تو زمین دوز بدررویں بنائی گئی ہیں جو پختہ اینٹوں کی ہیں اور ہنوز موجود ہیں۔ ان کی ضرورت ہی اِس لئے پڑی کہ اِن نہروں میں موجودہ دارگ اور خیرآباد کی نہروں کی نسبت پانی زیادہ تھا۔ سالہان کی زمینیں اب بھی ایک ایسی نہر سے سیراب ہوتی ہیں جو فرح رود کی ایک پُرانی گذرگاہ سے گذرتی ہے۔ نہروں کا قدیم ترین نظام اِس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اُس وقت دریا میں موجودہ زمانے کی نسبت پانی کہیں زیادہ تھا۔

ہوکات اور جُوین

ضلع کا نام ہوکات ہے جس کی صحیح وجہ تسمیہ معلوم نہیں۔ اپنے موجودہ تلفّظ میں یہ لفظ قدیم مؤرخوں اور جغرافیہ نگاروں کی تحریر و املا سے مختلف ہے۔ اُن کی کتب میں یہ اُیسے لکھا گیا ہے گویا یہ اُک بولا جاتا تھا۔ سیستان میں آج کل اسے اوک اور باشندوں کو اوکاتی بولتے ہیں۔ یہ قدیم نام سے زیادہ قریب ہے۔

جُوین کا نام بھی قدیم دستاویزات میں پایا جاتا ہے۔ لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ موجودہ جُوین پرانے شہر کی جگہ پر ہی ہے یا نہیں۔ کئی میلوں کے فاصلے سے دیکھنے پر قلعہ کے اردگرد بہت سے کھنڈرات نظر آتے ہیں جو قلعہ کے باہر قصبہ کے اِردگرد بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ کھنڈرات ایک اور قصبہ یا گاؤں چار جوک سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

جُوین کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسے علاقہ کا مرکز ہے جو جَو کی پیداوار کے لئے مشہور ہے۔ زمین اِس اناج کے لئے خاص طور پر سازگار ہے۔ جَو کی پیداوار اپنے بیج کا سَوگنا ہے جبکہ گندم کی پیداوار صرف اس کا ایک تہائی ہے۔ جَو ہوتا بھی بہت عمدہ ہے۔ ایک ہزار سال پُرانے سفرناموں میں بھی جوین کا نام استعمال ہُوا ہے۔ جوین کا قلعہ یعنی موجودہ قصبہ پُرشکوہ ہے۔ لیکن دُور سے یہ نہ دیکھا جا سکا کہ آیا یہ قابلِ مرمّت تھا یا نہیں۔

ہامونِ سیستان کا بیان قدما کے ہاں ۹۰۳ تا ۹۵۲

ہامونِ سیستان کا جو نقشہ استخری نے کھینچا اور جس کا ترجمہ ہُوا آج بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا دمِ تحریر تھا۔ اِس کا اور ابنِ رُستہ کا بیان دونوں ملک کی حقیقت پسندانہ تصویر کھینچتے ہیں اور اس میں مقامی رنگ کی چاشنی بھی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ انہوں نے اپنا بیان مصدّقہ معلومات پر استوار کیا۔

اِن تحریروں کا وقت لیث صفّاری کے خاندان کا زمانۂ عروج تھا۔ مشرقی سیاسیات میں سیستان کا طوطی بول رہا تھا۔ لہٰذا سیستان، اس کا جغرافیہ اور اس کے لوگ مرکزِ محورِ توجہ بنے ہوئے تھے۔ مصدّقہ معلومات آسانی سے دستیاب ہو سکتی تھیں کیونکہ ایک مقامی حکمران خاندان

کے عروج نے سیستان کو ایک طرف ہمسایہ ممالک سے مربوط کر دیا تھا اور دوسری طرف بغداد کے خلیفۃ المسلمین سے بھی۔

استخری سیستان کی جھیل کے متعلق لکھتا ہے کہ اس کی انتہائی لمبائی ضلع کورنگ سے براستہ کوہستان و کرمان فارس تک ۳۰ فرسخ ہے اور چوڑائی ہر جگہ سے ایک منزل کا فاصلہ ہے۔ اس کا پانی شیریں ہے اور اس میں سرکنڈے اور مچھلیاں بکثرت پیدا ہوتے ہیں اور اس کے ارد گرد گاؤں ہی گاؤں ہیں، سوائے اس طرف کے جو صحرا کے مقابل ہے۔ اس نے پہلے ذکر کیا تھا کہ ہندمند.... سیستان (اس کے مطابق سجستان) میں ختم ہو جاتا ہے کیونکہ یہ جھیل زرہ میں گر جاتا ہے اور یہ جھیل زرہ پانی کی کمی یا بیشی کے مطابق گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے۔"

اسی مصنف کے مطابق کرمان کا پل کوئی پل نہ تھا بلکہ ایک رباط تھا جسے عمرو بن لیث نے سیستان کے دارالحکومت کے چار منزل مغرب میں تعمیر کیا تھا۔ یہ چوک یقیناً اسی جگہ پر ہوگا جہاں ہر ملک سے سیستان کا پرانا راستہ شیلا کے اوپر یا اس کے پاس سے گزرتا تھا۔ اس مقام اور کرون یا کرنگ[۱] کے درمیان کا فاصلہ ۸۰ میل ہے جو جھیل کے علاقہ کے وسط سے خطِ مستقیم میں پایا جا سکتا ہے۔ سر ہنری رالنسن نے مشرقی جغرافیہ نگاروں کے مطابق ایک فرسخ کو تین میل سے کچھ زیادہ قرار دیا۔ اس کے اعداد سے صحیح ار۳ میل فی فرسخ نکلتا ہے اور اس اوسط کے مطابق جھیل کا علاقہ ۹۳ میل ہوگا، یعنی صحیح سے ۵ میل زیادہ۔ یہ قریباً صحیح اندازہ ہے کہ مصنف نے اپنا مواد بہت عرق ریزی سے جمع کیا اور اسے معتبر ذرائع تک رسائی میسر تھی۔ ہاموں کی چوڑائی میں فرق آتا ہے لیکن میلوں میں فاصلہ کچھ بھی ہو یہ ہمیشہ ایک منزل ہی بنتا ہے۔ جب پانی اس کے پورے پاٹ پر پھیلا ہوا ہو اور جب یہ بالکل خشک ہو تو اسے منزلوں میں بانٹنا اور عین بیچ میں پڑاؤ ڈالنا یکساں طور پر ناممکن ہے۔

۱۔ اس کا محلِ وقوع بعد میں بیان ہوگا۔ یہ تپہ خاران سے ۴،۳ میل شمال مغرب میں تھا۔

سیلاب یا خشک سالی کے ایّام میں جھیل کا پانی بڑھتا یا گھٹتا ہے۔ استخری کے لکھتے وقت بھی عام حالات ویسی تھے جو اب ہیں۔ ابنِ رُستہ ذکر کرتا ہے کہ بعض اوقات کُرنگ کے پرے کی منزل میں پانی عبور کرنا پڑتا تھا۔ جو اتنا گہرا اور چوڑا ہوتا تھا کہ کشتیاں استعمال کرنا پڑتی تھیں۔ ایسے مواقع پر مسافر متبادل راستہ بھی استعمال کرتے تھے۔ ہاموں کے سیلاب زدہ علاقے ہلمند کی رواں گذرگاہ اور اُس کے دہانے کی صورتِ حال پر منحصر تھے اور اُن نہروں کے فالتو پانی کے اخراج پر بھی دار و مدار رکھتے تھے جو جھیل کے طاس میں گرتی تھیں۔ جھیل میں پانی کی گہرائی دریا اور نہروں کے پانی کی آمد کی مرہونِ منت تھی۔

لہٰذا جھیل کو کشتیوں کے ذریعے عبور کرنے کا امکان تبھی پیدا ہو سکتا تھا جب جھیل کا پانی کافی گہرا ہو اور یہ تبھی ہو سکتا تھا جب ہلمند اپنا پانی براہِ راست ہاموں کے طاس کے شمالی حصّہ میں وقف کر دے۔ ابنِ رُستہ لکھتا ہے کہ جنوبی ساحل پر حسانک چار فرسخ کے فاصلہ پر تھا۔ موجودہ دَور میں ضلع کرنگ کے وسط سے ہاموں کے آرپار براہِ راست فاصلہ تقریباً ۹ میل ہے، بشرطیکہ جنوبی ساحل ۱۹۰۳ کے نشانِ آب کو سمجھا جائے۔ یہ ایک بے قاعدہ خطِ ساحل ہے اور نوح کے سال کے موقع پر جب ہلمند شدّومد سے بہتا ہے تو یہ بے قاعدہ ساحلی خط بہت جلد بدل جائے گا۔ میاں کنگی کے نشیبی حصّے چکنی مٹی کے سالانہ ڈھیروں سے بنے ہیں اور اِس سے ڈیلٹائی پنکھا ایک ہزار سال کی مدّت میں دو تین میل باہر کی طرف نکل گیا ہوگا۔ یہ بات کہ میاں کنگی کا شمالی ساحل چند صدیوں میں آگے بڑھ گیا ہے، کافی حد تک اِس حقیقت سے ہی عیاں ہو جاتا ہے کہ موجودہ ساحل کے آس پاس بہت قدیم مقامات کا کافی فقدان ہے۔ برجِ میرگُل کے موجودہ گاؤں کی کُرگ زیادہ تر سخت اور پُرانی مٹی کی بنی ہوئی ہے جو اُس کے گرد کی نرم و ملائم مٹی سے غالباً قدیم تر ہے۔ تختِ شاہ کے گرد کی ڈھیریاں وغیرہ غالباً نیزار میں جزیرے تھے، کیونکہ وہ ابھی تک سیستان میں بعض زندہ افراد کی یادداشتوں میں محفوظ ہیں۔

موجودہ ہاموں میں لوگوں کی زندگی

ماہی گیری

ہاموں میں مچھلیاں کثرت سے ہیں۔ اردگرد کے دیہات سے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ماہی گیری کے لئے جال لیئے ہوئے ہاموں کی طرف جاتے ہیں۔ وہ اپنی خوراکی ضروریات سے فاضل مچھلی آس پاس کے دیہات میں بیچ دیتے ہیں۔ یہ ماہی گیر اُن باقاعدہ صیاد لوگوں سے علیحدہ ہیں جو چٹائیوں، سرکنڈوں اور جھاڑیوں کی بنی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور جن کا اہم ذریعۂ معاش ہی ہاموں کی مچھلی اور دیگر شکار ہے

گلّہ بانی

نے زاروں (سرکنڈوں کے جھنڈ) میں جن کا ذکر اسٹخری نے کیا ہے، آج بھی مویشیوں کے ریوڑ ان کے پتوں پر پلتے ہیں۔ پانی گھٹ جاتا ہے تو سرکنڈے خشک ہو جاتے ہیں اور سردی میں ان کا رنگ زیادہ تر ہلکا زرد ہو جاتا ہے۔ جنوری کے آخر میں ان میں آگ لگا دی جاتی ہے اور فروری کے آخر تک جلے ہوئے سرکنڈے جھیل کے علاقہ سے صاف ہو جاتے ہیں۔ جنوری میں ہلمند آہستہ آہستہ چڑھتا ہے اور طاس بھرنے شروع ہوتے ہیں اور جیسے جیسے پانی ان کی جلی ہوئی جڑوں میں داخل ہوتا ہے تو نئے اور نرم پتے پھوٹنے لگتے ہیں اور اپریل کے آخر تک نئے سرکنڈے اپنے جوبن پر آجاتے ہیں۔ سرکنڈوں اور صحرائی گھاس کے بیج تیز ہوائیں اِدھر اُدھر بکھیر دیتی ہیں جو سردی میں چند روز کے لئے چلتی ہیں۔ جب ہواتوں کو جھنجھوڑتی ہے تو بیج دانوں میں سے سفید بیج نکلتے ہیں اور ہوا کے رُخ پر علاقے میں پھیل جاتے ہیں اور پھر پھوٹ پڑتے ہیں۔

صیّادوں اور مویشی پالوں کے گھر

گلّہ بانوں اور صیادوں کی گرمائی جھونپڑیاں چوبی شہتیروں پر چٹائیاں بچھا کر بنائی جاتی ہیں۔ لکڑی عموماً تمرسک کے تنے اور شاخیں ہوتے ہیں۔ سرمائی جھونپڑیاں دریائی گھاس کے گٹھوں سے بنتی ہیں اور انہی سے چھت بھی تعمیر ہوتی ہے۔

سرکنڈے اور دریائی گھاس

نے زار کے سرکنڈوں کا مذکورہ بالا کے علاوہ اور کوئی مصرف نہیں۔ وہ سرکنڈہ جس سے مشرق کے خوش نویس اپنے قلم بناتے ہیں، جس سے بانسریاں بنتی ہیں اور جسے تمباکو کی نلی کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں، جنگلی نہیں بلکہ باغات کی پیداوار ہے اور اس کی خود کاشتہ قسم ہے۔ ہر بڑے باغ میں اس کے جھرمٹ دیکھے جا سکتے ہیں۔ خود رَو سرکنڈہ کہیں بھی اُگ آتا ہے جہاں اس کی جڑوں کو معمولی سی نمی بھی مل سکے۔ دریائی گھاس البتہ اسی وقت پھلتی پھولتی ہے جب پانی خوب گہرا ہو اور اس کی فراہمی مسلسل ہو۔

صیّاد

جھیل کا علاقہ صیادوں میں منقسم کر دیا گیا ہے اور ان کا ہر گروہ اپنی حدود کے اندر رہتا ہے۔ انہی حدود میں وہ مچھلیاں اور شکار پکڑتے ہیں۔ گلّہ بان مویشیوں کو نیزاروں میں لے جانے کے عادی ہوتے ہیں اور وہ انہی جانوروں کے ساتھ جھونپڑیوں اور چھپّروں میں رہتے ہیں جو سرکنڈوں اور گھاس سے ہی بنتے ہیں۔ اُن کے اپنے مخصوص راستے ہیں۔ جب پانی اُتر جائے تو چھپّر اور باڑے سرکنڈوں کے پاس منتقل کر دیئے جاتے ہیں اور انہیں مٹی کے کناروں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اواخر دسمبر تک جب پانی کی سطح میں پہلا اُبھار متوقع ہوتا ہے مویشی وغیرہ اونچی سطح پر منتقل کر دیئے جاتے ہیں جہاں صرف بلند ترین سیلاب ہی پہنچ سکتا ہے۔ یہاں سرمائی جھونپڑیاں بنا دی جاتی ہیں۔ ہر گروہ کا اپنا اپنا باڑہ ہوتا ہے اور جھونپڑیوں کے باہر خندقیں ہوتی ہیں تاکہ پانی اندر نہ آ سکے۔ جب سرکنڈوں اور گھاس کی مزید ضرورت نہ ہو تو وہ باڑے کے اندر ہی تہہ در تہہ رکھ دیئے جاتے ہیں تاکہ اگلی سردی میں کام آ سکیں۔ گلّوں کے باڑے اور سرکنڈوں کے فالتو ڈھیر ہاموں کے طاس کا منظر مخصوص ہیں۔

ہاموں کے طاس کی پیداواری صلاحیت

پس ہاموں کا طاس ایسے گروہوں میں منقسم ہے جو اپنے معتبرین کے ماتحت زندگی گزارتے ہیں۔ معتبرین سالانہ مالیہ حکومت کو دیتے ہیں۔ ان گروہوں کی تنظیم ویسی ہی ہے جیسی زرعی آبادی

کی۔ موخرالذکر زمین سے اپنی روزی کماتا ہے ، صیاد آبی پیداوار سے اور چرواہا ان سرکنڈوں اور گھاس سے جو پانی میں اُگتے ہیں۔ لہٰذا ہاموں کا طاس جیٹیل یا بنجر علاقہ نہیں۔ اور جیسے ایک بڑے شہر کے گلی کوچوں کے نام رکھے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو آرام رہے ، اسی طرح ہاموں کے چنگ شیلا اور سرکنڈہ بیلوں کے اپنے اپنے نام ہیں جو جھیل پر اکثر آنے جانے والوں کو معلوم ہیں۔ یہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے ان ناموں کی فہرست دینے سے کوئی خاص مقصد حل نہ ہوگا۔ چنگ آرونا یا چنگِ ریگ زرونی کا بیان کرنا یا یہ بتانا کہ کونسا طاس شیلا غلام شاہ کے ذریعے پانی لیتا ہے اور کونسا شیلا میش کشتی کے ذریعے ایک بے فائدہ کام ہے اور اسے نظرانداز کر دینا ہی بہتر ہے۔

۱؎ ۔ اُونٹنی یا ناقہ کا چنگ یا طاس۔

باب سوم

نیا ہلمند اور اس کے ڈیلٹے

قدیم اور حالیہ

سیستان کی زرخیز مٹی بمنزلہ دو نوشتہ

الاستخری کا بیان کہ جھیل کے اردگرد گاؤں ہی گاؤں تھے سوائے اُس طرف کے جو صحرا کے مقابل تھی، آج بھی مُلک پر صادق آتا ہے۔ جھیل کے طاس کے مشرق اور جنوب کا علاقہ ہمیشہ آباد رہا ہے جہاں انسانی بستیوں کے یکے بعد دیگرے ادوار کے نشانات ملتے ہیں۔ سیاسی و مذہبی سیادت کے مراکز بھی اسی علاقے میں قائم رہے ہیں۔ اسی میں ان شہروں کے آثار ہیں جو مختلف اوقات میں حکومت کے صدر مقام رہے۔ ڈیلٹا کے چہرے کی موجودہ تحریر پُرانے وقتوں کی تحریر پر رقم ہُوئی ہے اور اس طرح سیستان ایک دو نوشتہ سے ملتا ہے جس کے زیادہ واضح اور تازہ حروف تو زیرِ نقد و نظر ہیں لیکن کچھ ایسے حروف بھی ظاہر ہوتے ہیں جو جزوی طور پر مٹے ہُوئے اور اکثر و بیشتر بمشکل پڑھے یا سمجھے جا سکتے ہیں اور جو اتنے پُرانے ہیں کہ تاریخ کے بھی پیشرو ہیں۔ یہ حروفِ قدیم جہاں تک پڑھے گئے ہیں، موجودہ دور کی حیاتِ انسانی کی قدامت کو ظاہر کرتے ہیں۔ نظامِ آب پاشی وہی تھا جو آج ہے۔ سوائے اِس کے کہ اگلے وقتوں میں یہ بہتر کام کرتا تھا۔ شاید اِس لئے کہ موجودہ سیستانی قوّت و ہُنر میں اب اُس معیار سے گِر گئے ہیں۔

لیکن بیشتر اِس کے کہ ہلمند اور اس کے قدیم ڈیلٹوں کی جغرافیائی خصوصیات کی گُتھیاں سُلجھائی جائیں مُلک کے موجودہ خط و خال کو بیان کر دینا ضروری ہے۔ سیستان کا جغرافیہ یہاں زندگی اور انسان

کی اوّلیں نمود سے لے کر آج تک بہت زیادہ نہیں بدلا۔ لہٰذا موجودہ حالات کا ایک عام سا جائزہ لینا مفید ہوگا۔ اور ان جغرافیائی کوائف کا بھی جو قوائے فطرت نے ناقابلِ محو انداز میں ملک کے چہرہ بشرہ پر نقش کر دیئے ہیں اور جو قدامت کے لحاظ سے انسانی تخلیق و ایجاد کے قدیم ترین نمونوں پر فوقیت رکھتے ہیں جو ڈیلٹا کے ان حصّوں میں بکثرت موجود ہیں جو انسانی زندگی اور اس کے کاروبار کا محور و منظر رہے ہیں۔

ہلمند اور نیل کا مقابلہ

ایک حالیہ کتاب کے مصنّف نے اپنی ایرانی سیاحت کا ذکر کرتے ہوئے اتفاقیہ طور پر زرخیز سیستان بمقابلہ کم زرخیز ملحقہ و متصلّہ علاقہ جات کی تشبیہہ قدیم مصر کی زرخیز ڈیلٹائی زمین بمقابلہ مشرقی و مغربی ممالک سے دی ہے۔ یہ مشابہت نیل اور ہلمند کے باب میں اور بھی نمایاں ہے۔ دونو دریا بڑے بڑے صحرائی خطّے پار کرتے ہیں اور دونو کی گذرگاہ بہت تنگ اور پُرپیچ ہے اور ناسازگار علاقوں سے گزرتی ہے۔ جو ان کے ڈیلٹوں اور منبعوں کے درمیان واقع ہیں۔ بیچ کے صحراؤں میں عملِ تبخیر کی وجہ سے دونو دریاؤں کو بہت نقصان ہوتا ہے۔ ہلمند کے معاملہ میں تو یہ نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا ہے اور ڈیلٹا کو پانی کی فراہمی بہت متاثر ہوتی ہے۔ یہاں مشابہت ختم ہو جاتی ہے۔ نیل کے معاملہ میں آب رسانی کا علاقہ زیادہ بڑا ہے اور اس علاقہ کے وسیع جنگل پوش خطّے (جو دریائے مصر کو پانی دیتے ہیں) کی ماہیّت پانی میں کمی کی بجائے اس کے یکساں بہاؤ کی ضامن ہے۔

ہلمند کو آب رسانی کا علاقہ رقبے میں مختصر اور نیل کے علاقہ سے مختلف ہے۔ ہلمند کا سرمایۂ آب معتدل خزاں اور سردی کی برفباری اور بہار کی بارشوں کا مرہونِ منّت ہے اور اگر ان میں معمولی سی کمی ہو جائے تو ڈیلٹا میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے جو عملِ تبخیر سے ہونے والے نقصان اور صحرائی علاقہ کے اوپر ملکی ضروریات کے علاوہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ہلمند گاہے گاہے بالکل جواب دے جاتا ہے اور اپنے بلند ترین سیلاب میں بھی یہ نیل کی نچلی سطحِ آب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

وادیٔ ہلمند قلعۂ بست سے

قلعۂ بست پر ارغنداب ہلمند سے ملتا ہے اور اِس سنگم سے نیچے کوئی اور معاون اس سے نہیں ملتا اور دریا باقی فاصلہ ایک جوئے واحد کی طرح طے کرتا ہے جیسا کہ الاسطخری نے قریباً ایک ہزار سال پہلے بیان کیا۔ یہ گذرگاہ ایک بڑا موڑ ہے جو ہاموں میں قلعہ بست کے عرض البلد پر ہی ختم ہوتا ہے۔ دریا زمینداور کی پہاڑیوں کے جنوب کے ڈھلوان تودوں میں سے واضح حدود کے اندر بہتا ہے۔

قلعۂ بست اور لنڈی ولی محمد کے درمیان دریا کے مشرق کی طرف علاقہ نشیبی ہے اور ریتلی پہاڑیوں سے ڈھکا ہُوا ہے۔ لیکن اِس گاؤں سے تھوڑا فاصلہ نیچے دریا ایک تنگ وادی میں داخل ہوتا ہے جو سنگلاخ چٹانوں میں بند ہے۔ یہاں سے تیس چالیس میل سیستان کے ڈیلٹا کے اُوپر تک وادیٔ ہلمند شمالی ڈھلان کے دامن میں ایک تنگ نالہ پر بنی ہوئی ہے۔ خواجہ علی کے گاؤں اور ضلع کے نیچے دشت کی ایک بہت تنگ ڈھلان اِس پرنالہ کو اِس وسیع نشیب سے جُدا کرتی ہے جس میں سیستان کی جھیل اور گادِ زرہ واقع ہیں جن کا پہلے بیان ہو چکا ہے[۱]۔

ہلمند بند رکمال خان پر

جب ہلمند چٹانوں کی گرفت سے نکلتا ہے جو اِس پرنالہ کے دو رویہ ہیں تو ایک تنصیف ظہور پذیر ہوتی ہے جو سیستان کے موجودہ ڈیلٹا کی سطح سے اونچی ہے۔ یہ تقسیم ایک ٹوٹی پھوٹی سطح مرتفع سے وجود میں آتی ہے جس کی چوٹی وادی کے جبڑوں میں ایک پانہ کی طرح پھنسی ہوئی ہے جہاں دو رویہ چٹانیں باہر کھلتی ہیں اور پھر یک لخت ختم ہو جاتی ہیں۔ اِس چوٹی کے نزدیک لیکن زرخیز مٹی کے فرش کے قریب ایک چھوٹا سا حقیر گاؤں ہے اور ایک قلعہ کے آثار بھی جو ایک

---

[۱] رودبار (ہلمند) پر دریا کا آبریز ضلع کے جنوب میں گادزرہ کے فرش سے ۳۲۰ فٹ اونچا ہے۔ نشیب سے اوپر کناروں پر اڑک کے چشمے غالباً زمین کی کسی نرم تر تہہ سے پانی رسنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

سنجرانی بلوچ، کمال خان نے بنایا تھا جس نے موجودہ سیستانی تاریخ کے کسی دورِ انتشار میں زمینوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ یہ بہت مشہور و معروف تھا اور ہے۔ کیونکہ سرحد، چالک اور مکران کے کاروانوں کا رُخ اسی مقام کی طرف ہوتا تھا جو ہلمند اور سیستان کو سفر کرتے تھے تاکہ اناج خرید سکیں اور اپنے ریوڑوں کی پیداوار کا تبادلہ ان خوش قسمت علاقوں کی گندم سے کرسکیں۔ کاروانوں کا مستقر ہونے کی وجہ سے اسے بندر کہا جانے لگا۔ یہ ملکی جغرافیہ کا ایک اہم مقام ہے۔ ہلمند کے آبریز کے جنوبی سرے کی ڈھلان اس جگہ سے تھوڑا ہی آگے ختم ہو جاتی ہے اور دریائی گذرگاہ کے اوپر ایک دو سو فٹ اُونچی چٹان میں گم ہو جاتی ہے۔

خواجہ علی کے اوپر دلشیو اور کلمان سے ہلمند کے پرنالہ کا شمالی سرا دشتِ مرگو کی جنوبی ڈھلان کی چٹانوں سے بنتا ہے۔ موخر الذکر بندر تک ایک خطِ مسلسل ہے اور اس جگہ سے تھوڑا سا مشرق میں چٹانیں شمال کی طرف گھوم جاتی ہیں اور قلعہ فتح کے قصبہ سے اُوپر ایک شوخ حاشیہ بن کر ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں سے سطح مرتفع کا سرا مشرق کی طرف واپس مڑکر سیستان کی ڈھلان سے دوبارہ مل جاتا ہے۔ مشرقی سطح مرتفع کی یہ بیرونی لڑی دشتِ میسکی کہلاتی ہے اور بندر پر وادئ ہلمند سے ۲۰۰ فٹ اونچی ہے۔

شمالی گذرگاہ خوابگاہ کو

بندر کمالخان سے ہلمند کی موجودہ گذرگاہ دفعتاً شمال[۱] کی طرف مُڑ جاتی ہے اور مغربی دشت کے مشرقی سرے سے شیر دشکر ہو کر قریباً ۳۵ میل چلتی ہے اور پھر میدانِ سیستان میں نکل آتی ہے جو اس کا موجودہ حالیہ ڈیلٹا ہے۔ ہلمند کا یہ پشتہ بھی ایک اہم مقام ہے اور اس پر ایک معمولی سا گاؤں خوابگاہ ہے جو دشت یاخا کی سطح مرتفع کے ایک ٹکڑے کے اوپر آباد ہے جو دریا سے ۴۴ فٹ اونچا اور اس کے بلند ترین سیلابوں کی زد سے باہر ہے۔ مذکورہ مقام سے دشتِ مغرب اور

عہ۱۔ ایک واضح ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے۔

جنوب مغرب کی طرف مُڑجاتا ہے۔

رودِ سینا

بندر اور خوابگاہ کے درمیان ایک تیسری گذرگاہ ہے جو ہلمند کے دورِ حیات کی قدیم ترین گذرگاہ ہے۔ اِسے سنارود یا رودِ سینا کہتے ہیں۔ دریا کی یہ قدیم گذرگاہ دونوں ڈیلٹوں میں سے شمالی ڈیلٹا کے جنوب مغربی حصّہ میں داخل ہوجاتی ہے۔ اِس کا پشتہ ایک گہری کھاڑی کے مشرقی سرے پر واقع ہے جہاں مٹی کے حالیہ ذخائر نے قدیم ڈیلٹا کو محو کر دیا ہے[۱]۔

شمالی اور جنوبی ڈیلٹا

سیستان میں دو ڈیلٹے ہیں۔ شمالی، جہاں اِس وقت ملک کی ساری کاشت کاری اور آبادی مرکوز ہے (اور ہمیشہ مرکوز رہی ہے) اور جنوبی، جو اوّل الذکر سے ایک سطح مرتفع کے ذریعے جُدا ہوجاتا ہے، مغرب کی طرف آگے کو بڑھتا ہے اور ورمال کے موجودہ گاؤں کے تین میل جنوب میں ایک واضح راس کی صُورت میں ختم ہوجاتا ہے۔

شمالی اور جنوبی دونوں ڈیلٹوں کی مشرقی حد ہاموں کا کسی بھی سال کا نشانِ آب ہے۔ شمالی ڈیلٹا کا دہانہ وہاں ہے جہاں ہلمند اِس میں خوابگاہ کے قریب داخل ہوتا ہے۔ جنوبی ڈیلٹا دریا کی قدیم ترین گذرگاہ کی دُم پر ہے جو بندر کمال خان کے عین مغرب کی سمت میں سیدھی چلتی ہے۔

رودِ بیاباں یا تراکُن گذرگاہ

ہلمند کی یہ پرانی گذرگاہ رودِ بیابان کہلاتی ہے۔ اور یہ نام ایک مسوّدے میں اِسے دیا گیا جو سیستان میں ملا۔ مختصر اور آسان تر نام تراکُن گذرگاہ ہے جو اِس متروکہ راستے کے بعض اہم کھنڈرات کی وجہ سے اِسے دیا گیا۔ ہلمند کی تمام پرانی گذرگاہیں دریا کے موجودہ راستے سے اُونچی ہیں۔

ع۱۔ یہ بھی دشت کی ایک شکست و ریخت کی بنا پر۔

دو ڈیلٹے

جنوبی ڈیلٹا ہمیشہ شمالی سے ایک علیحدہ ضلع رہا ہے۔ یہ مؤخر الذکر سے چھوٹا ہے۔ یہ ڈیلٹے ایرانی اور افغانی سیاسی تقسیم سے قطع نظر ہمیشہ جغرافیائی خد و خال سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ادوارِ گزشتہ میں دونوں ڈیلٹے بیک وقت آباد تھے جو ہلمند کے پانی کی تقسیم کے بغیر ممکن نہ تھا۔

فالتو پانی کی گذرگاہیں

تراکن واحد گذرگاہ نہیں ہے جسے ہلمند نے جنوبی ڈیلٹا میں اختیار کیا ہے۔ ایک چھوٹی گذرگاہ (اور ایک قدیم تر) کنکریلے میدان پر موجود ہے جو اس قدیم گذرگاہ کا بایاں کنارہ ہے۔ یہ غالباً فالتو پانی کی نالی تھی اور بڑی گذرگاہ سے نکلتی تھی جو بندر کمالخان کے مغرب میں تھی۔ بندر سے پانچ چھ میل مغرب میں ہی ایک اور نالی بھی جنوب مشرقی سمت میں آتی ہے اور گاودِ زرہ میں گرتی ہے۔ اس کا راستہ زیریں مغربی سطح مرتفع سے گزرتا ہے جب وہ چٹانوں کے دامن کو چھوتی ہے جو گاودِ زرہ کے اوپر کی جنوبی ڈھلان بناتی ہیں اور وادی ہلمند کو اس نشیب[1] سے جدا کرتی ہے۔

تراکن پر سابقہ آبادیاں

یہ سارے کا سارا علاقہ ماضی میں گنجان آبادی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس وقت تراکن گذرگاہ کے کنارے انسانوں سے معمور تھے اور انسانی بستیوں اور دیگر کارناموں کے آثار آج بھی ان پست چٹانوں کے ساتھ ساتھ بکثرت دیکھے جا سکتے ہیں جو اس گذرگاہ کے کنارے تھے۔ ان حدود کے اندر زرخیز مٹی کے فیتے کی چوڑائی مختلف ہے۔ دونو طرف دشت کا حلقہ ہے اور دورویہ چٹانوں کے

---

[1] یہاں مغربی اور اب زیریں سطح مرتفع کے بیٹھ جانے کا عمل ناظر یا مبصر دیکھ سکتا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ تو اس نالی سے ہی ظاہر ہے۔ ہوائی عمل نے اونچی سطح مرتفع کے چہرہ پر خوب نقش و نگار کئے ہیں۔

اندر ایک دو مربع میل زرخیز مٹی ہو سکتی ہے۔ ایک حلقے اور دوسرے کے درمیان دشت کی چٹانیں ہیں جو کنکریلی مٹی کی مقابل راسوں کے درمیان زرخیز پٹی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ان میں ہر حلقہ ایک علیحدہ علاقہ تھا اور یوں ساری قابل کاشت زمین فطرت نے الگ الگ علاقوں میں خود تقسیم کر دی تھی جن کے اپنے اپنے نام تھے۔ انہی حدود کے اندر قدیم ہلمند بل کھاتا ہوا بہتا تھا اور کبھی کبھار وارفتگی یا تبدیلی گذرگاہ کی وجہ سے ان زرخیز قطعوں کو غسل دے جاتا تھا۔

پست چٹانوں کے درمیان اس تنگ وادی کا فرش اس گاد سے بنا ہے جو ڈیلٹا کے سخت اور سفید میدانوں کی علت مادی ہے۔ لیکن جب سے گذرگاہ کو دریا اور انسانوں نے خیرباد کہہ دیا اُس وقت سے زرخیز مٹی ہواؤں کے زور شور کا تختۂ مشق بن کر رہ گئی ہے۔ زمین میں گہری دراڑیں پڑ گئی ہیں اور بعض جگہوں پر تو فرش پایاب گھاٹیوں کا ایک جال سا بن گیا ہے جو پانچ چھ فٹ گہرا ہے۔ جہاں اس قدیم گذرگاہ کے حلقے اس عمل سے محفوظ رہے ہیں وہاں فرش ایک چٹان سے دوسری تک ہموار ہے اور سفید سخت مٹی شاذ و نادر ہی صحرائی تمرسک یا تاگز کا ملبوس پہنتی ہے۔

شمالی صحرائی سطح مرتفع

تراکن گذرگاہ کے شمال کی صحرائی سطح مرتفع ہلمند کے اس پرانے پاٹ کے جنوب کی سطح مرتفع سے زیادہ بلند ہے[۱]۔ سطح کا یہ فرق تراکن کے مغرب میں سب سے نمایاں ہے اور اس سے تھوڑا سا ہی آگے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس فراز کی وجہ یہ ہے کہ سطح مرتفع کے اوپر ایک ہی ساخت کے پتھر کی سلیں پڑی ہیں جو پندرہ بیس فٹ اونچی ہیں۔ مشرقی حصہ بھی موجودہ دریائی گذرگاہ سے بتدریج مغرب کی طرف اوپر کو اٹھتا ہے۔ بغور معائنہ سے پتہ چلتا ہے کہ اونچائی کے یہ درجے ساحل ہیں گویا کہ ان کی پست چٹانوں کو پانی زینہ بہ زینہ تحلیل کرتا رہا ہے۔ ان میں سے ہر زینہ سطح مرتفع کی غرقابی کے ایک دور کا مظہر ہے۔ حتیٰ کہ ہم اس تدریجی غرقابی کے آخری دور میں موجودہ پست چٹان

---

[۱] - رود بیابان بھی ایک دراڑ میں چلتا ہے جیسا فالتو پانی کی مذکورہ نالی یا ہلمند کی شمالی اور موجودہ گذرگاہ۔

کو دیکھتے ہیں جو وادی سے بلند ہے اور جس کے چرنوں میں موجودہ ہلمند بہتا ہے۔ خوابگاہ کے گاؤں کے مغرب کی طرف اور میدانِ سیستان سے قدرے بلند سطح مرتفع پر ہمیں اِن ڈھلوائی چبوتروں اور جزیروں کے نشانات مل سکتے ہیں جن کے ذریعے ہم ہلمند کی متعدد قدیم گذرگاہوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں جو موجودہ خوابگاہ سے پانچ چھ میل اُوپر سے نکلتی تھیں اور اس کے چار پانچ میل مغرب میں جھیل میں آگرتی تھیں۔

ہلمند اور گاڈِ زرہ کی درمیانی سطح مرتفع

دریا کا ایسے بعد دیگرے ہلمند کے آبریز میں گرنا بھی بہت نمایاں ہے۔ موجودہ دشت مرگو کے قدموں میں چلتا ہے جس کی چٹانیں گذرگاہ سے اوپر اُٹھی ہوئی ہیں۔ ایام سیلاب میں پانی کا بہاؤ کبھی کبھار اِن ڈھلوان چٹانوں کا رُخ کرتا ہے اور مٹی کو کاٹ کاٹ کر اُن کی خلاؤں کو بڑھا دیتا ہے اور یوں ہبوطِ ارض پیدا کرتا ہے۔ اِن ڈھلانوں پر پُرانی سطحوں کے نشان واضح نہیں ہیں لیکن آبریز کے دوسری طرف وہ اِتنے واضح ہیں کہ جاذب توجہ بن جاتے ہیں۔ ہلمند کے آبریز میں سے گذرنے والا راستہ بذاتِ خود سطحوں کے ان تغیرات میں سے گذرتا ہے جو شروع میں نامعلوم رہتے ہیں، لیکن جونہی کنکریلے چبوترے سے نچلے میدان میں چند فٹ اترتے ہیں تو اپنے وجود کا احساس دلا دیتے ہیں۔ یہ تدریجی تغیرات تعداد میں قریباً چار ہیں اور اگر کوئی وادی سے جنوبی چبوترہ کی چوٹی پر چڑھے تو وہ کئی چبوتروں کی صورت میں جنوب کو اُوپر اُٹھتے ہیں اور ہر چبوترے کی اپنی ڈھلانیں اور چٹانیں ہیں۔ بلند ترین چبوترہ ایک مسطح قطعہ ہے جس پر گاڑھے بھورے رنگ کے کنکر بچھے ہوئے ہیں اور انہی کی بنی ہوئی جزیرائی سلیں بھی ادھر اُدھر کھڑی ہیں۔ یہ جنوبی چبوترہ بندر کمالخان کے نزدیک کی وادی سے ۱۰۰ فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہے۔

گاڈِ زرہ سے بلند اس کا جنوبی چہرہ بالکل مختلف ہے۔ یہ یک لخت پُرشکن چٹانوں کی ایک قطار میں مدغم ہو جاتا ہے جو گھاٹیوں اور مٹی کی ڈھلانوں کے اُوپر ہیں۔ زرد اور سُرخ مٹی ہوا کے عمل کی وجہ سے عُریاں، ہموار اور کنکروں سے معرّا ہے۔ البتہ کنکر کم کے بعض موٹے ٹکڑوں پر ضرور نظر آتے

ہیں۔ اِس شکستہ و ریختہ زمین کے آر پار گھاٹیاں ہیں جو گادِ زرہ کی طرف جاتے جاتے وادیوں میں بدل جاتی ہیں اور مٹی کے قطعات کی صورت میں زرہ کی تہہ یا فرش بن جاتی ہیں۔

دشت پر مذکورہ چبوتروں کے سِرے ایسے خدوخال سے ملتے جُلتے ہیں جو زمین پر کھود دیے گئے ہوں اور گو آب و ہوائی اثرات اور موسموں کے غیر مساوی عمل کی وجہ سے اِن میں کافی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ تاہم اِن کا بغور مطالعہ ان تغیّرات کی تاریخ کا آئینہ ہے جو موجودہ دَور سے بہت پہلے یہاں رُونما ہوتے رہے۔

دریا میں قدیم بندات کے مقام

دشتِ مرگو کی ڈھلان میں کِم کے افقی قطعے موجود ہیں۔ یہاں بھی پیلی سُرخی مائل مٹی اور پیلی، سبز یا قریباً سفید مٹی باری باری ظاہر ہوتی ہیں۔ ان ذخائر پر نرم سنگریزوں کا غلاف کافی دبیز ہے۔ دریا کے جنوب کی طرف کا ڈھلوان چبوترہ بھی اِسی مواد کا بنا ہُوا ہے اور وقفے وقفے سے کِم کے تودے گذرگاہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور بھنور پیدا کرتے ہیں۔ یہ سخت مٹی زیرِ آب سخت اور مستحکم ہو جاتی ہے اور کِم کے ان تودوں سے ہی سیستان کی قدیم تاریخ میں فائدہ اٹھایا گیا اور دریا کے اندر بند بنائے گئے جن سے ایک نظامِ آبپاشی قائم کیا گیا اور ڈیلٹوں کی ساری قابلِ کاشت زمین کو کسی نہ کسی وقت زیرِ کاشت لایا گیا۔ اُس مواد کی غیر مساوی موٹائی نے دشتِ مرگو کے نقشہ میں بھی عدم توازن پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ یار اُس دریا کی طرف ڈھلان کی چوٹی سے آگے نکل جاتے ہیں اور مشہور و معروف حد نما بن جاتے ہیں۔ مقامی لوگ ایسی بڑھی ہوئی زمین یار اُس کو پُزِ یا ناک کہتے ہیں۔ بندر کمالخان کے کافی اوپر ایک بہت نمایاں راس ہے جسے پُزِ ماشی کہتے ہیں۔ اِس راس کے نیچے کِم کی ایک پٹّی ہے جو گذرگاہ سے گذرتی ہے اور جب دریا میں پانی ، نچلی سطح پر ہو تو ایک تیز رو بناتی ہے۔

تراکن گذرگاہ کے دہانے

تراکن نالہ یا رود بیابان کا پانی ہاموں میں پانچ چھ دہانوں سے گرا کرتا تھا۔ یہ دہانے اب

بھی نظر آتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے بیرونی ملبے کو کاٹ کر جھیل کی سطح تک راستہ بنایا ہے۔ یہ بیرونی ملبہ بھی کنکروں سے ڈھکا ہُوا ہے لیکن اس کے خز فریزے پرانی گذرگاہ کے خز فریزوں سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ پانی نے بیرونی ملبے سے جو راستے کاٹے تھے۔ وہ اب سیلاب آوردہ مٹی کی پتلی لمبی پٹیاں بن گئی ہیں جیسی کہ بڑی ندی کے فرش میں پٹیاں ہیں۔ یہ علاقہ ہُوا کے عمل سے اتنا دریدہ و شکستہ ہے کہ تراکن کے پانچ چھ دہانوں کے تسلسل کا پتہ چلانا آسان نہیں۔ بالخصوص جب وہ نشیبی لہراتے ہُوئے ملبے سے نکل کر گہرے شگافوں اور ہوائی تھپیڑوں کے علاقے میں داخل ہوجائیں۔

تراکن نالہ اور دریائے رواں کے درمیان کی نچلی سطح مرتفع کے مغربی چہرہ کے وہ نقش و نگار نظر آتے ہیں جو ہُوا کے زناٹوں نے ننگی چٹانوں پر اُبھارے ہیں۔ سیستان میں بارش اور اس کے اثرات تو بالکل حقیر ہیں، صرف ہُوا کی کارکردگی ہی قابلِ دید ہے۔ سطح مرتفع کی سطح پر بھی ہُوا کا یہ عمل جاری و ساری ہے۔ ایک بڑی کھاڑی ایسے نشانات سے بھرپور ہے کہ پورا علاقہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ جنوبی سطح مرتفع کا جنوبی سرا پست چٹانوں کی ایک قطار پر مشتمل ہے جو پندرہ سولہ میل چوڑی زرخیز پٹی کے اُوپر واقع ہیں۔ اس علاقے کی مقابل حد کچاکوہ پہاڑوں کا شمالی پشتہ ہے۔ اسی زرخیز پٹی میں شیلا واقع ہے جس کے ذریعے سیستان جھیل کے فالتو پانی گادزرہ میں گرسکتے ہیں، لیکن زرخیز زمین بارکھانوں (ریگِ رواں کے ٹیلے یا ڈھیریاں) سے ڈھکی ہوئی ہے اور زرخیز مٹی کا فرش اس ریت کے ڈھیروں کی کھلی جگہوں سے شاذونادر ہی نظر آتا ہے۔

سُرہ دگال کے قریب کی کھاڑی

جن دنوں تراکن ایک دریا تھا تو اس کے دہانے اپنا فالتو پانی ہاموں یا براہِ راست شیلا میں گراتے تھے جو اُس وقت بلند کا ہی ایک تسلسل تھا۔ جس نقطے پر یہ ڈیلٹا سطح مرتفع کی طرف مڑتا ہے وہاں ایک گہری کھاڑی ہے جو سُرہ دگال[1] کی کھاڑی سے مشابہ ہے اور موخرالذکر سے کم کی ایک تنگ گھاٹی

---

[1]۔ سُرہ دگال یعنی سُرخ زمین بوجہ رنگ نشانات جو گہرا اور گاڑھا ہے اور جو ہاتھی دانت جیسے سفید میدان کا تضاد ہے جس پر یہ لگے ہُوئے ہیں۔

سے جُدا ہوتی ہے جسے یُز سُرہ دگال کہتے ہیں۔ تراکن کے ۔ ہانے پہ بلے سے ملحق یہ کھاڑی بھی ہوائی عمل کے اُنہی اثرات کی منظہر ہے جو شمالی کھاڑی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ سطوح مُرتفع کے طاس بھی ہوائی عمل کے اسی کٹاؤ کے آئینہ دار ہیں۔ یہ عمل مسلسل جاری رہا ہے حتیٰ کہ کم کی کوئی سخت ضمنی تہہ ننگی ہوگئی ہے یا کناروں سے کنکر اکھڑ کر نشیبی جگہوں پر آ ٹکے ہیں اور یوں مٹی کے فرش محفوظ ہو گئے ہیں۔ ان تمام خلاؤں میں ایسے نشانات رہ گئے ہیں جو یہ بتا دیتے ہیں کہ کونسا مواد اُکھڑ گیا ہے۔

انسانی آبادیوں کے آثار

لیکن تراکن کے جنوب کا علاقہ مدّتوں سے آباد رہا ہے۔ تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آبادی کی ابتدا کب ہوئی۔ البتہ نہروں کے آثار بتاتے ہیں کہ یہ موجودہ صحرائے بے آب وگیاہ کسی وقت سیراب وشاداب علاقہ تھا۱۔ اور طاس میں زمین کا کٹاؤ انسانی آبادیوں کے وجود کے بعد وقوع پذیر ہُوا۔ علاقے کے سرسری معائنہ میں کئی دفعہ ظاہر ہُوا کہ ان طاسوں کو سیراب کرنے والی نہروں کے آثار موجود تھے۔ نہر کا وہ حصہ جو سطح مُرتفع کے وسط سے گزرتا تھا اور طاسوں کو تقسیم کرتا تھا، اب بھی اُس مستقل نشان سے پہچانا جاسکتا ہے جو دشت میں کھدائی سے پڑا تھا اور اُس کے دونوں سرے اب مُستقل طاسوں کے موجودہ فرش سے آٹھ یا دس فٹ اُونچے ہوں گے۔

پس کٹاؤ کا آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی تصدیق نشانات سے ہوسکتی ہے جو مٹی کی ایک دو ڈھیریاں ہیں جن کا مواد اتفاقی طور پر ہوائی تھپیڑوں کے باوجود سلامت رہا۔ یہ علاقے ایک دفعہ بے آباد ہونے کے بعد دوبارہ کبھی آباد نہیں کئے گئے لہٰذا ہوائی اثرات بلا روک ٹوک جاری رہے اور نہ ہی اُکھڑے ہوئے مواد کا مداوا ہُوا۔ اور یوں کٹاؤ اور بھرائی میں توازن نہ رہ سکا۔ رودِ بیابان کے جنوب کی طرف اس متروکہ سطح مرتفع میں ایک ماقبل تاریخ تہذیب کے آثار دیکھے جاسکتے ہیں جو غالباً اس افسانوی دور کے ہیں جب سیستانی حکمران ان کارناموں کے

۱۔ یہ دشتِ زرہ کی سطح مرتفع ہے اور اس کا مغربی تسلسل جس کی سطح پر کبھی نہروں کا پانی پھرا کرتا تھا۔ جی۔پی۔ٹی

خالق ہوئے جو فردوسی کے عظیم رومان میں محفوظ ہیں۔

سنارود

سنارود، رودِ بیابان سے بہت مختلف ہے۔ اگر ظواہر پر اعتبار کیا جاسکتا ہے تو یہ کسی مرحلہ پر بھی دریائے رواں معلوم نہیں ہوتا۔ گویہ بیان ایک اناڑی مبصّر کا ہی سمجھا جائے اور اسے قابلِ اصلاح گردانا جائے۔ اس کی پوری گذرگاہ میں یعنی اس کے مغربی پشتہ سے لے کر اس مقام تک جہاں سے اس کی وادی موجودہ وادئ ہلمند سے جُدا ہوتی ہے۔ کوئی ایک نشان بھی انسانی آبادی کا نہیں مِل سکا۔ یہ اس کھاڑی میں داخل ہوتا ہے جس میں علی آباد کا گاؤں واقع ہے اور جس کے چار میل مشرق میں شمس آباد کا موجودہ گاؤں ہے۔ وادئ ہلمند سے علیٰحدہ ہونے کے بعد اس میں غیر معمولی قسم کے خدوخال نہیں ہیں۔ اس کا پُشتہ دلچسپ ہے اور بعض لحاظ سے فرح رود کے دہانہ جیسا ہے۔ سنارود کی ندی جھیل میں ہَوا سے محفوظ رُخ سے داخل ہوتی تھی۔ اس کے داخلہ کے بعد جھیل یا کھاڑی کا پانی گہرا ہوجاتا تھا اور اس کے آرپار نفیس سنگریزوں کی ایک پٹّی پھیل جاتی تھی۔ یہ پٹّی سرہ دگال کے دہانے کی پٹّی سے ملتی جلتی ہے۔ البتہ اوّل الذکر اتنی نمایاں نہیں ہے کیونکہ ہوائی عمل کے کٹاؤ کی جگہ بعد میں گاد کے ذخائر نے لے لی ہے۔ سنارود کے دہانہ کے پاس اس پٹّی کی اونچائی ۱۶ فٹ ہے۔ یعنی دو طرفہ میدان کی سطح سے یہ اتنی بلند ہے۔ یہ صرف تھوڑا سا فاصلہ ہی قائم رہتی ہے۔ یہ دو پُرانے راستوں سے کھُلی وادی سے ملتی ہے۔ گاد اور ریت کے اضافوں نے کافی حد تک جزئیات کو دُھندلا دیا ہے۔

شمس آباد کے گاؤں سے دو میل دور سنارود نے ایک نچلی سطح مرتفع سے ایک تیسرا راستہ بھی نِکالا جو ظاہراً اونچی زمین کی مٹّی، کنکروں اور ملبے سے بنی ہوئی تھی اور یہ رستہ اَب بھی اُس کی بنائی ہُوئی گھاٹی کی صورت میں پہچانا جاسکتا ہے۔ یہ زرخیز مٹّی کی ایک چھوٹی سی سطح مرتفع پر نکلتا تھا جو کنکریلے ساحل کا سہارا لئے ہوئے ہے۔ سنارود کا یہ تیسرا راستہ علی آباد کھاڑی میں داخل ہوتا تھا جو سنگِ کم کی چٹان کے نیچے اور خزف ریزوں کی پٹّی کے اوپر تھی۔ سنارود کا دوسرا راستہ

میدان شمس آباد میں ایک علیحدہ گھاٹی کے ذریعے داخل ہوتا ہے جو گاؤں کے ایک میل جنوب میں ہے۔ یہاں سے دو گذرگاہوں کے نشانات ہیں۔ ایک دائیں یا مشرقی طرف کی، جہاں موجودہ نہر بہتی ہے اور دوسری جو دیہہ خالقداد کے ایک میل جنوب میں کھاڑی میں داخل ہوتی تھی۔ ان دونو کے درمیان پٹی کافی شکستہ ہے اور قریباً ایک تہائی میل چھوڑ کر باقی کی قریب قریب ناپید ہو چکی ہے کیونکہ دریا آوردہ مٹی نے اس کی مشرقی اور مغربی ڈھلانوں کو ڈھانپ لیا ہے۔ جہاں جہاں مٹی کی سطح پر ہوا دخل اندازی کر سکی ہے وہاں خزفریزوں کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے اور مٹی کا ذخیرہ بھی پٹی سے دُوری کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف گہرا ہوتا گیا ہے۔

پٹی یا نفیس سنگریزوں کا ساحل سبزکم کی ڈھیری کی ڈھلانوں کے مشرقی سرے سے پہچانی جا سکتی ہے۔ اور یہ ڈھیری ان چٹانوں تک ہے جو قلعہ نو کے گاؤں کے جنوبی میدان پر حاوی ہیں۔ سبزکم ڈھیری کے شمال مغرب کی طرف کھُردرے کنکروں کا ایک ڈھلوان کنارہ ہے۔ جو ساحل علی آباد کی چٹانوں کے پائے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس کی نشان دہی اس بڑے قبرستان تک کی جا سکتی ہے جو دشت میں واقع ہے اور جس پر ایک نمایاں گنبددار مقبرہ بنا ہوا ہے۔ اس مقام کے بعد دریا آوردہ مٹی اس کنکریلے کنارے کو دبا لیتی ہے۔ قدیم و جدید مٹی کی اس تہہ کی زرخیزی کی وجہ بھی غالباً اعماقِ زمین کے یہی سنگریزے ہیں اور علی آباد اور اس کے آس پاس کے دیہات کی سرسبزی انہی کی مرہونِ منت ہے۔ ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ کنکریلا ساحل مختلف الجسامت دو والو کے صدوف سے پٹا پڑا ہے۔ علی آباد کے قرب وجوار کی زمینیں بھی اسی قسم کی چھوٹی سیپیوں سے بھری پڑی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایکڑوں زمین انہی آثار سے متشکل ہوئی ہے۔ لیکن یہ سب زمانۂ حال کی پیداوار ہیں، جیساکہ آگے ذکر ہوگا۔

شمس آباد کے عقب میں اور اس کے اور مشرق کی طرف کے دشت کی چٹانوں کے درمیان ایک بڑا نشیب یا نادر ہے جس کا نام بَندِک ہے۔ پہلی نظر پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت ستارود کا کوئی نالہ اس میں گرتا ہوگا۔ لیکن اگر کبھی ایسا تھا تو بھی ایک پٹی بن گئی تھی جو پانی کی آمد کو روکتی

تھی۔ گول چوٹیوں کی دو پست فاصلہائے آب بندک کو شمس آباد کے گرد کے نشیبی میدان سے علیحدہ کرتی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک تنگ گھاٹی یا راستہ ہے جس کے ذریعے ایک نہر بندک میں داخل ہوتی ہے اور کچھ آب پاشی ہوتی ہے۔ اس کا پانی ہلمند کی موجودہ گذرگاہ سے نکلنے والی بڑی نہر سے لیا جاتا ہے جو خوابگاہ کے قریب ہے۔

سنارود کے دہانہ کے قریب کی زمین ٹوٹی پھوٹی ہے اور سیلاب آوردہ مٹی کے تازہ ترین اضافہ نے اس حصہ کا ناک نقشہ اتنا بدل دیا ہے کہ علی آباد کھاڑی کی پرانی ہیئت کا صحیح اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ سنارود کا ہلمند سے انفصال کم کے ایک اونچے مینار کے نیچے ہوتا ہے جو ڈھلوان چبوتروں اور چھجوں کی صورت میں ہلمند کی سطح سے ۵۰ افٹ اوپر اٹھتا ہے۔ کم کی اس پہاڑی کی چوٹی اور چھجوں پر ایک چھوٹا سا قلعہ ایستادہ ہے۔ اس کے مینار اور دیواریں ضرورتاً چھوٹے اور پست ہیں جو اسے غیر حقیقی بلکہ ایک پہاڑی قلعہ کا نمونہ بنا دیتے ہیں۔ کم کی ایک ساتھی پہاڑی بھی ہے لیکن زیادہ چھوٹی اور ڈھلوان ہونے کی وجہ سے امکانِ تعمیر سے عاری ہے۔ یہ قلعہ بند چوٹی سے بہت نیچے ہے۔

یہ قلعہ دکِ دیلا یا دِیلا کی چوٹی کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دِیلا نوشیروان عادل کا ایک افسر تھا اور قلعہ اس لئے بنایا گیا تھا کہ ہلمند کے اندرونی بند کی حفاظت کے لئے یہاں ایک دستہ فوج رہ سکے۔ یہ جگہ بندر کمالخان سے ۱۲ میل شمال کو ہے۔ گذرگاہ کا یہ حصہ موجودہ دریا اور سنارود یا رودِ بینا کے درمیان مشترک ہے۔ سیستان کے کیانی ملوک کا آخری پایۂ تخت قلعۂ فتح دکِ دیلا سے ۸ میل نیچے ہے۔ اس کا آئندہ بھی ذکر آتا رہے گا۔

وادیٔ چہار برجک کی سطح مرتفع

بندر کمالخان کے مشرق میں دریا کے دائیں کنارے پر سنگریزوں کی ایک پست سطح مرتفع ہے جس کی مشرقی ڈھلوان چٹان چہار برجک سے قریباً ۲ میل دور ہے۔ موخر الذکر ایک موجودہ گاؤں ہے جو بندر کمالخان کے قریباً ۱ میل مشرق میں ہے۔ موخر الذکر کے دو میل شمال میں اور ہلمند کے

مقابل کنارے پر دیہہ غلام حیدرؒ کا موجودہ گاؤں واقع ہے۔ پست سطح مرتفع اسی کے مشرق میں ہے اور اِس کے قریباً ایک میل شمال میں ایک کھڈ ہے جو دشت کے تنگ حصّہ کو کاٹتی ہے اور اسی کے ذریعہ نہر چہار بُرجک کا آخری حصّہ گاؤں کے کچھ حصّہ کو سیراب کرتا ہے۔ اس کے مزید شمال میں دشت صحیح سالم ہے اور دو میل کے بعد ٹوٹ پھُوٹ جاتا ہے۔ یہاں سے یہ مٹی کے شکستہ وریختہ ٹیلوں اور ریت کے ٹبّوں کا ایک سلسلہ ہے اور دکِ دیلا کی مقابل کِم کی سطح مرتفع کِم کی ڈھیریوں کے اُکھڑے ہُوئے سِلسلہ کا ہی ایک حصّہ ہے۔ اِس سطح مُرتفع پر ایک بہت قدیم احاطہ ہے جس کی دیواریں موسموں کے عمل سے ڈھے پڑی ہیں۔ اِس جگہ اور قلعہ فتح کے درمیان ٹیلے اور ٹبّے غائب ہوجاتے ہیں اور صرف ٹبّے وقفے وقفے سے اُبھرتے ہیں۔ حتیٰ کہ قلعہ فتح کے شمال میں کنارِ دریا کے ساتھ ساتھ یہ پھر ایک قطارِ مُسلسل کی صورت میں نمودار ہوجاتے ہیں۔ اوپر کی الگ تھلگ سطح مُرتفع اور دیہہ غلام حیدر کے مشرق میں اور سطح مرتفع میکی کی پست چٹانوں کی قطار کے درمیان ایک چوڑی گذرگاہ ہے جو پورا ہلمند تھام سکتی ہے۔ اس کا مشرقی کنارہ چہار بُرجک کے اردگرد اور اِس کے مغرب کی دریا آور دہ مٹی پر کھُلتا ہے۔ یہ گذرگاہ ہلمند سطح مرتفع کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ حتیٰ کہ ٹیلے اور ٹوٹی پھوٹی زمین جو اِس کے اور ہلمند کے درمیان ہیں، غائب ہو جاتے ہیں۔ یہاں گذرگاہ بھی ریتلی زمین میں کھو جاتی ہے۔ لیکن مشرق کی طرف سطح مرتفع کے نچلے حصّے آب زدہ اور ہَوا زدہ چٹانوں کی صورت میں ختم ہو جاتے ہیں جو آگے چل کر کِم کے بڑے تودے سے جُدا ہوتی ہیں جس پر قلعۂ فتح بنا ہُوا ہے اور جو اِسی گذرگاہ کے تسلسل پر واقع ہے۔

ترکوہ سطح مُرتفع

جس سطح مرتفع پر قدیم قلعہ بند احاطۂ ترکوہ ایستادہ ہے وہ بھی کِم کا ہی ایک تودہ ہے ہلمند کے علاقہ میں اِس سخت مٹی کو 'سر' کہا جاتا ہے۔ ترکوہ سے ہلمند کے پاٹ کے آرپار اِسی مٹی کی ایک پٹی گذرتی ہے جس پر نیچا پانی لہریں لیتا ہے۔ دِک دیلا کا قلعہ اور اِس کی ساتھی چوٹی کِم کے ایسے چھجّے پر واقع ہیں جس نے ہَوا کی دستبرد اور غارتگری کا مقابلہ کیا ہے۔ دِک دیلا کی چٹان

سے قریباً سوا میل شمال مشرق میں قریباً پچاس فٹ اُونچی ایک الگ تھلگ سطح مُرتفع ہے جو کم کا ہی تودا ہے۔ سخت مٹی کا یہ بڑھا ہُوا حصّہ ترکوہ سے شمال مغربی سمت میں چلتا ہے۔ یہ سطح مرتفع شمال مشرق اور مشرق میں بہت ٹوٹی پھوٹی ہے اور اسی کا ایک پست حصّہ قریباً پون میل لمبا ہے جس کا ایک جزو دریائے سنگھم پر ایک پست لیکن واضح چٹان بناتا ہے۔ دریا کی اِس مغربی چٹان اور اس کے مقابل ترکوہ چٹان کے درمیان دریا کشادہ وادی میں ایک دروازے سے داخل ہوتا ہے جس پر قلعہ فتح واقع ہے۔ کم کے اِس الگ تھلگ تودے کے جنوب و مغرب میں دریا آوردہ مٹی سے اور سنارود کے اِس سرے پر ضلع کیماری کے مغرب تک جانے والی نہر خوب ممتاز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نہر دِک دیلا سے بہت فاصلے سے نکلتی تھی۔ سیلاب کے دِنوں میں اب بھی اِس میں فالتو پانی آتا ہے جو کچھ فاصلے تک چلتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب قلعۂ فتح اپنے عروج پر تھا تو اسی نہر سے وادئ سنارود کا مشرقی سرا سیراب کیا جاتا تھا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہلمند کسی وقت دِک دیلا ڈھیری کے مغرب میں بہتا تھا اور قلعہ کے شمال مغرب میں الگ تھلگ سطح مرتفع کے مغربی سرے سے ہو کر پھر وادی میں آجاتا تھا جہاں یہ اب تین چار میل نیچے بہتا ہے۔

سنارود میں اِنسانی آبادی کے آثار

دریا کی حیثیت سے سنارود کی کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اِس کی گذرگاہ کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں آب پاشی سے فصلیں پیدا کی جاسکتی تھیں۔ جس وادی سے یہ بہتا تھا وہ اب گاڑھے بھورے رنگ کے کنکروں کی تہہ سے ڈھک چکی ہے لیکن اِس میں کئی جگہوں پر زمین اچھی ہے اور ندی کے دھارے سے بھی زیادہ دُور نہیں۔ لہٰذا اِس پر آب پاشی اور کاشتکاری ہو سکتی تھی۔ نہ کوئی کوشش کی گئی اور نہ ہی اِس کے کناروں پر کسی آبادی کے نشانات ملتے ہیں۔ خانہ بدوش چرواہے کبھی کبھار اِس کی وادی میں داخل ہوتے ہیں اور ان کے خیموں کے نشانات اِدھر اُدھر ضرور ملتے ہیں۔ ظروف پارے جو رود بیابان کے ساتھ موجودہ بے آب وگیاہ دشت میں اِتنے عام ہیں، سنارود کے کنارے اِن سے یکسر محروم ہیں۔

پُرانی نہر کی سمت ظاہر کرتی ہے کہ اِس کی تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ ہلمند کا پانی آبپاشی کے لئے ان اضلاع کی زرخیز زمینوں تک پہنچایا جائے جہاں اب مچی اور حصُندار کے کھنڈرات موجود ہیں ۔ غالباً کام ادھورا ہی چھوڑ دیا گیا ۔ شاید اِس لئے کہ یہ بہت مشکل تھا یا ملک میں کسی گڑبڑ نے اِسے پورا نہ ہونے دیا ۔ یا وہ شخص ہی لقمۂ اجل ہو گیا جس کے عزم و پیش بینی نے اِس منصوبے کو شروع کیا تھا ۔ بلاشک وشبہ اِس کی تعمیر کئی صدیاں پہلے شروع کی گئی تھی ۔ ہلمند کی جن شاخوں کی کوئی اہمیت تھی یا جنہوں نے عِلاقے پر کوئی اثر ڈالا صِرف رودِ بیابان اور دریا کا موجودہ رواں نالہ ہی ہیں ۔

قلعۂ فتح کے مشرق میں ڈیلٹے کا بیان

راس قلعۂ فتح

دِک دیلا کی گھاٹی سے نکلتے ہی دریا قریباً بے زنجیر ہو جاتا ہے سوائے مغرب کے، جہاں دشت ایک واضح کنارہ بناتا ہے اور اِس طرف تبدیلیٔ گذرگاہ کی کوشش کو ناکام بنا تا رہتا ہے ۔ مشرق میں سطحِ مرتفع میسکی کی ڈھلان کا اگلا حصّہ پست چٹانوں کی ایک قطار کی صورت میں ایستادہ ہے جو ہلمند سے قریباً ایک میل دُور ہیں اور دریا اِن چٹانوں تک گھوم پھر سکتا ہے ۔ قلعہ فتح سے ۲½ میل شمال میں ایک مقام پر یہ محدود مزاحمت بھی ختم ہو جاتی ہے ۔ اسی مقام پر میسکی کی ڈھلان مشرق کی طرف ہٹتی ہوئی سطحِ مُرتفع کے ساتھ چلتی ہے اور دوبارہ دشتِ مرگو سے جا ملتی ہے ۔ جس کا یہ ایک دور اُفتادہ حِصّہ ہے ۔ جس مقام پر یہ تبدیلیٔ سمت واقع ہوتی ہے وہ آخری پست چٹانوں کی ایک نمایاں راس ہے جو زرخیز میدان کے اوپر ایستادہ ہیں ۔ اِس مقام سے پرے مشرق کی طرف پست ڈھلان کی باقاعدہ اِختتام پذیری رُک جاتی ہے اور دریا آوردہ مٹی کے ذخیرہ کی طرف جُھک جاتی ہے ۔ لیکن اِن دونوں کا سنگم ننگی مٹی کی ٹوٹی پھوٹی ڈھیریوں کے انگر کھنگر سے دھندلا جاتا ہے اور کنکر اور ریت کے غلاف بھی اِسے چھپا دیتے ہیں ۔ یہ راس کسی وقت قلعہ بند کر دی گئی تھی اور قلعہ بندی دو علیحدہ قطعوں میں بانٹ دی گئی تھی جن کے درمیان ایک مصنوعی گذرگاہ بنائی گئی جو ۵۰ فٹ چوڑی نہر کو سنبھال سکتی تھی ۔ یہ گذرگاہ کم کو دریائی مٹی کے ذخیرہ تک کاٹ

کر بنائی گئی تھی۔ جنوبی قلعہ اونچی سطح مرتفع سے آنے والی ڈھلان سے ملا ہوا تھا اور کم کا کٹا ہوا حصّہ زمین سے کچھ اونچا تھا۔

سرگاہ سیستان یا دمبِ رستم

شمالی بلاک ایک چٹان کی صورت میں اپنی سہ طرفہ زرخیز زمین سے پندرہ یا بیس فٹ اونچا ہے۔ اس جگہ کو سرگاہ سیستان یا دمبِ رستم (رستم کی ڈھیری) بھی کہتے ہیں۔ موخرالذکر نام کا مطلب صرف یہ ہے کہ کھنڈرات بہت قدیم دَور کے ہیں اور ان کا ماخذ معلوم نہیں۔ دونوں قلعے جن کے درمیان نہر حائل ہے صرف ۱۰۰ فٹ لمبے ہیں لیکن ان کا محلِ وقوع بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کھنڈرات سیلابی مٹی کے علاقہ کے سر پر واقع ہیں جو ہلمند کے خاتمہ پر تک سیستان کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے مشرق کی طرف کا موجودہ بے آب و گیاہ علاقہ کسی وقت ایک قدیم اور پیش رفتہ تہذیب کا مرکز تھا۔ یہ علاقہ مشرق میں دشتِ مرگو کی سطح مرتفع سے محدود ہو جاتا ہے۔ شمال میں ڈیلٹا ۵۰ میل تک پھیلا ہوا ہے جو بتدریج جھیل کی طرف ڈھلوان ہوتا جاتا ہے جو ملک میں پست ترین سطح کی مالک ہے۔

سرگاہ سیستان کے مشرق میں ہلمند کی پرانی گذرگاہیں

سرگاہ کے ان دونوں قلعوں کو جدا کرنے والی گذرگاہ کے شمال کی طرف کی ڈھیری پر کھڑے ہو کر شمال اور مشرق کی طرف کے زرخیز میدان کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہلمند کسی وقت راس کے نیچے مشرق کی طرف گھومتا تھا جس پر سرگاہ واقع ہے اور میکی سطح مرتفع کی چوٹی سے آنے والی ڈھلان کے متوازی بہتا تھا۔ ہلمند کی اس قدیم گذرگاہ کا یہ دھندلا سا نقش پیپائی کے کھنڈرات تک چلتا ہے جہاں پر یہ اپنا مشرقی راستہ چھوڑ کر شمال کی طرف مڑ جاتا ہے اور مزید مدھم پڑ جاتا ہے۔ یہ بالآخر ریتلی پہاڑیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ لیکن کھنڈرات سے بہت پہلے ہی یہ سخت سیلابی مٹی کے ہموار میدان میں غائب ہو جاتا ہے جس پر بارکھان (ریگِ رواں کی پہاڑیاں) کھڑی ہیں۔

قلعۂ فتح کے شمال کی وادیٔ ہلمند

موجودہ ہلمند شمال کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ سرگاہ سے گزرتا ہے اور پھر ارباب دوست محمد کے موجودہ گاؤں کو پیچھے چھوڑتا ہے۔ یہ گاؤں سرگاہ سے قریباً ۲½ میل شمال کو ہے اور دریا کے کنارے سے صرف آدھ میل ہے۔ ہلمند کے اس کنارے پر خاصے اونچے ریت کے ٹیلوں کا سلسلہ ہے جو فرح رود کے کناروں کے سلسلہ سے ملتا جلتا ہے۔

اس سرگاہ کے قریباً دو میل شمال تک زرخیز میدان کنارِ دریا کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف کی زمین کی سطح پر ہی چلتا رہتا ہے۔ اس کے شمال میں زمین آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی ہے۔ لیکن دوست محمد گاؤں تک پہنچتے پہنچتے یہ بلندی کافی حد تک کنکر آلود ہو جاتی ہے۔ بیسائی کھنڈرات کے شمال مغرب اور گاؤں کے نواحیات میں زمین کے ایسے قطعے نظر آنے لگتے ہیں جو کنکر آلود ہیں۔ گویا یہاں تہہ میں کنکر ہیں جن پر دریائی مٹی کی چادر بچھ گئی ہے۔ کہیں کہیں یہ مٹی اکھڑ گئی ہے کیونکہ کٹاؤ ہوا ہے مزید مشرقی ڈھیریاں کنکروں کی علیحدہ علیحدہ سطوح مرتفع معلوم ہوتی ہیں اور کہیں کہیں مٹی در آئی ہے لیکن یہ الگ تھلگ ٹکڑے جلد ہی غائب ہو جاتے ہیں اور ان پر کافی اونچی ریگِ رواں جلد ہی غالب آجاتی ہے جو مشرقی سمت کے کھنڈرات کو نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے۔ یہ کھنڈرات موجودہ قلعہ نادعلی تک پھیلے ہوئے ہیں جو ہلمند کے دو دھاروں کی تقسیم سے ورے واقع ہے۔ ریگِ رواں سے دبے ہوئے کھنڈرات زیادہ تر دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں کے بڑے بڑے اور اہم ڈھیر ہیں جنہیں خشک صحرائی ہوا نے مکمل تباہی سے بچا لیا ہے لیکن ان کے اور ہلمند کے موجودہ ڈیلٹا کے درمیان دیوارِ ریگ اتنی اونچی ہے کہ سفیدک کی زمین سے ۹۰ فٹ اونچی ڈھیری سے بھی ان کھنڈرات کی کوئی جھلک نہیں دیکھی جا سکتی۔ ان میں سے کچھ کھنڈرات ۱۶ میل سے زیادہ دور نہیں ہیں اور درمیانی علاقہ میں اور نادعلی کے پرے ترس کی جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اس جگہ سے آگے سدِ ریگ کی اونچائی کم ہونا شروع ہو جاتی ہے اور بالآخر کئی کنکریلے ڈھلوان چبوتروں میں ختم ہو جاتی ہے جو ہاموں کی مشرقی حد آشکن کے جنوبی سرے پر واقع موجودہ گاؤں

مینُو کے پانچ چھ میل جنوب مغرب میں ایستادہ ہیں۔

گاؤں خوابگاہ سے آگے اور اُس کے مشرق میں دشت کے کچھ الگ تھلگ قطعے ہیں جو مذکورہ دیوارِ ریگ کے دُور افتادہ حصّے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے مختلف چوڑائی کی دریائی مٹی کی پٹیوں سے جُدا ہوتے ہیں۔ دیوارِ ریگ کی سمت میں ہلمند کی سالانہ طغیانیوں سے متاثر ہونے والا علاقہ بہت محدود ہے۔ صرف زمین کی ایک تنگ سی پٹّی نہروں یا طُغیانی کے پانی سے سیراب ہوتی ہے۔ اِس کی وجہ وہ اونچی زمین ہے جو سروتار اور غلغلہ کے علاقہ کو ڈیلٹا سے جُدا کرتی ہے۔

سروتار اور اُس کی آب پاشی کا بیان

ساروتار اور غلغلہ کے علاقے ان نہروں پر منحصر تھے جو اپنا پانی قلعہ فتح کے پاس دریا سے اخذ کرتی تھیں۔ ان نہروں کو رواں رکھنے کے لئے بہت توجہ اور حفاظت درکار تھی۔ جس سے کبھی گریز نہیں کیا گیا۔ پُرانی نہروں کے آثار اِس پر دال ہیں۔ ان میں سے کچھ راس سرگاہ سے ورے اس شگاف سے گزرتی تھیں جس کے ساتھ ساتھ ہلمند کبھی بہتا تھا۔ باقی نہریں کھنڈرات کے پاس ایک مقام سے نکلتی تھیں جنہیں اب قلعہ گاوک کہا جاتا ہے۔ سروتار اور غلغلہ کی خوشحالی انہی کا تحفہ تھی۔ اِس وسیع نظامِ آب پاشی پر کسی آفتِ ارضی و سماوی کا حملہ ان علاقوں کو بنجر بنا سکتا تھا۔ حالات نے ان علاقوں کی کماحقہٗ، چھان بین کی اِجازت نہیں دی، لیکن ہندوستانی عملہ کے ممبروں نے اِس علاقے کا جائزہ لیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ ماضی میں یہ علاقے بہت گنجان آباد تھے۔

کھنڈرات کی نوعیت

اِن علاقوں میں بھاری بھرکم عمارتوں، قلعہ بند دیوان خانوں، دفاعی چوکیوں، گنبدیں مقبروں اور اُمراء کی رہائش گاہوں کے بے شمار کھنڈرات ہیں۔

جب بادِ صدوبیست روز چلتی ہے اور بارکھانوں کی رفتار تیز کر دیتی ہے جو اپنی منزلِ مقصود، دشت ہرگو کی وادیوں اور خوفناک علاقہ موسومہ بہ جہنّم کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں تو نرم و نازک ریت کی ہر حرکت پر باغات کے آثار اور کاشت کاری کے شواہد نظر آتے ہیں۔ دشتِ ہرگو اِس

علاقے کا کوڑے دان ہے۔ یہاں نشیب کے اردگرد ڈھلوان چٹانوں کے مقابل ریگ رواں کے جمع شدہ تودے ملتے ہیں۔ کھنڈرات میں نہروں اور ان گنت آبی گذرگاہوں کے نشانات شامل ہیں۔ باغات میں آب رسانی کے لئے نالیاں تھیں اور خمدار نلیوں کے پل بھی ملے ہیں۔ نہروں اور گذرگاہوں میں پانی کی تقسیم کے لئے مستقل اور پختہ اینٹوں کے انتظامات تھے تاکہ پانی نالیوں میں جاری و ساری رہے۔ پانی کا عمل روکنے کے لئے چونے کا گارا استعمال ہوتا تھا۔ ہوائی عمل مقبروں کو چیرتا پھاڑتا ہے تو انسانی ڈھانچے کلّی یا جزوی طور پر نظر آتے ہیں جو ان مقبروں میں مدفون تھے۔ بلوچ اس علاقے کی تباہی کو کسی وبا یا قتلام سے اسی لئے منسوب کرتے ہیں کہ ہوا زدہ زمین کی سطح پر یہ ڈھانچے نظر آتے ہیں۔

انہی کھنڈرات سے دفینہ جو پارتھوی اور ساسانی بادشاہوں کے سکّے، ابتدائی اسلامی مسکوکات، منقش ہیرے اور مہریں، جن میں سے بعض پر انسانی سر بھی بنے ہوئے ہیں اور بعض پر صرف کتابت کندہ ہیں اور جن میں سے کچھ پر قدیم حروف ہیں اور کچھ پر عربی حروف، عقیق سنگ سلیمانی اور بلّور کے بنے ہوئے دانہ ہائے تسبیح اور کئی قسموں کے دیگر نوادرات لے آتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان علاقوں کے لوگ دورِ قدیم میں مہذّب اور متمدّن تھے۔ یہ علاقے جو اب صحرا میں ہیں شاید ان مراحلِ تہذیب کے مراکز تھے جن سے سیستان گذرا ہے۔ تاریخِ ماضیہ کا علم صرف گیارہ یا بارہ سو سالوں تک ہی محدود ہے۔ عرب فتح سیستان سے پہلے کی ہر چیز افسانوی اور زیادہ تر غیر یقینی ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اس فتح کے بعد ہلمند کبھی اس رکاوٹ کے مشرق کی طرف نہیں گذرا جو سیستان کے ان اضلاع اور موجودہ شمالی ڈیلٹا کے درمیان سدّراہ ہے۔ اسی لئے قدیم تہذیب کے نوادر سطح زمین پر موجود ہیں۔

شمالی ڈیلٹا، ایک مدفون تاریخ

ہلمند نے صدیوں میں متعدد بار گذرگاہیں تبدیل کی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شمالی ڈیلٹا میں اتنی گاد جم گئی ہے کہ تاریخ کے نقوش ملک کی موجودہ سطح کے نیچے دب کر رہ گئے ہیں۔

شمالی ڈیلٹا ملک کی آبادی اور کاشت کاری کی آماجگاہ رہا ہے، لیکن موجودہ عوامل نے سابقہ تہذیبوں کے آثار و شواہد مٹا دیئے ہیں۔

دیوارِ ریگ کے مشرق کی طرف قدیم اضلاع کی آبادی صرف نہروں کا ثمرہ معلوم ہوتی ہے۔ ہلمند سے براہِ راست اسے پانی نہ ملتا تھا۔ یہ بات کھنڈرات کی نوعیت سے ثابت ہو جاتی ہے جہاں پرانی نہریں ضلع میں داخل ہوتی تھیں وہاں یہ آثار بہت زیادہ ہیں لیکن جوں جوں یہ دشت مرگو اور خاشں رود کے ڈیلٹا کی طرف جاتی تھیں کھنڈرات بھی خال خال ملتے ہیں اور ان کے اہم تر قطعوں کے درمیان کھلی اور خالی زمین بھی کافی ملتی ہے۔

عربوں کی فتح کے بعد ہلمند کے ڈیلٹا کا نقشہ اُبھارنے سے پہلے یہ مفید ہوگا کہ ہم موجودہ جغرافیائی کوائف کا بیان مکمل کرلیں جو اُس دَور سے قریباً جُوں کا توں ہے۔ قدیم کوائف انہی نقوش کے مطابق ہونے چاہئیں کیونکہ جو مفروضات اِن نقوش سے رَد ہو جائیں اُن کے حق میں پیش کئے جانے والے سب دلائل باطل ہو جائیں گے۔

شاہرستان کے قریب کی سطح مرتفع بمعہ طاس یا شق الارض

خوابگاہ گاؤں سے تھوڑا سا آگے مغربی سطح مرتفع دریا سے جدا ہوتی ہے اور قریباً سات میل تک چلتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ شاہرستان کے موجودہ گاؤں سے ایک میل رہ جاتی ہے۔ اس شمالی مقام سے دشت یک لخت جنوب مغرب کو مُڑ جاتا ہے اور اپنے سابقہ راستے سے قائمہ سے کم زاویہ بناتا ہُوا ڈیلٹا کے میدان کے مقابل ۲۷۰ درجے کا بڑا زاویہ بناتا ہے۔ چٹانوں کی قطار میں یہ تبدیلی علی آباد کھاڑی کی ایک حد ہے۔ شمالی مقام اور سارود کے دہانہ کے درمیان یہ قطار مُسلسل نہیں ہے۔ دشت کی زمین کئی جگہ سے شق ہوئی ہے اور ان میں سے ایک بے قاعدہ شکل کی وادی بن گئی ہے جو جنوب مشرقی سمت میں ہلمند تک جاتی ہے۔ اِس وادی کی تہہ پر کئی طاس یا نا ورہیں جن میں سے مشرقی سرے کے طاس وادی کے مغربی فرش سے اُونچے ہیں۔ اِس کے جنوب میں اَور بھی درزیں ہیں۔ اِن کے علاوہ جنوب مغرب اور ہلمند کے قریب کئی چھوٹے اور

خشکی بند طاس ہیں ۔ ہلمند کی طرف جاتے جاتے یہ رقبہ اور گہرائی میں کم ہوتے جاتے ہیں ۔ حتیٰ کہ دک دیلا کی الگ تھلگ سطح مرتفع سے چھ سات میل دور طاسوں کا یہ سلسلہ ختم ہوجاتا ہے ۔ ابتداً میں ان کا ماخذ کچھ بھی ہو ، یہ یقینی ہے کہ اِن کی مزید کھدائی قریب قریب ہُوا کا کارنامہ ہے ۔ ہُوا کی نقش گری کے آثار اِن چٹانوں سے صاف طور پر واضح ہیں جو ان کے کناروں پر کھڑی ہیں ۔ اور ان الگ تھلگ ڈھیریوں سے بھی عیاں ہیں جو ان کے پاٹوں میں کہیں کہیں امتیازی نشانات کی طرح ایستادہ ہیں ۔ ان کی سمت وہی بادِ صد و بیست روز کی سمت ہے ۔

نشیب چاہ نیمہ

اس وقت نشیب چاہ نیمہ زیرِ کاشت ہے ۔ آبپاشی ایک نہر سے ہوتی ہے جس کا پانی رودِ سیستان کے بڑے دھارے سے آتا ہے جو بذاتِ خود خوابگاہ سے قریباً ایک میل شمال میں ہلمند سے برآمد ہوتا ہے ۔ یہ نہر نشیب کے سِرے تک چلی جاتی ہے جو خوابگاہ کے پاس کنارِ دریا کے مغرب میں صرف ۲½ میل کے فاصلہ پر واقع ہے ۔

نشیب چاہ نیمہ کی کاریز

کسی وقت ایک بہت قدیم کاریز کی تعمیر کی گئی تھی تاکہ ہلمند کا پانی براہِ راست نشیب چاہ نیمہ میں لایا جا سکے ۔ کاریز کی گذرگاہ اب بھی دشت کی سطح پر سفید مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیروں سے پہچانی جا سکتی ہے جو اُس مٹی کا بچا کھچا حصہ ہے جو گڑھوں سے کھودی گئی تھی اور جو اب بھی موجود ہیں ، گو وہ بادآوردہ گرد و غبار سے کسی حد تک اَٹے ہُوئے ہیں ۔ یہ کاریز مکمل نہ ہوسکی اور یہ اُس نشیب کے مُنہ تک نہ پہنچ سکی جسے سیراب کرنا مقصود تھا ۔ آخری گڑھا نشیب کے مشرقی اور بلند ترین حصّہ سے قریباً ایک میل دُور ہے جو اِس مقام پر بہت کم گہرا ہے ۔ آخری گڑھے اور نشیب کے درمیان اور کوئی گڑھا نہیں اور نہ ہی کوئی اور شگاف ہے جس سے پانی نشیب میں آسکے ۔ اگر ایسا ہوتا اور کاریز نے مکمل ہو کر کام شروع کر دیا ہوتا تو سطحِ زمین پر کوئی نشان پڑا ہوتا جسے مرورِ زمان کاملاً نہ مٹا سکتا ۔ شگاف بہت گہرا ہوتا اور یہ دشت پر

آخری گڑھے سے کئی سو گز پرے ہوتا۔ جہاں تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے یہ کاریز نچلی سطح مرتفع کی نہر سے نکلی ہوتی جو اپنی جگہ سیستان کے موجودہ نظام انہار سے سات میل اوپر دریا سے برآمد ہوئی ہوتی۔ جس مقام سے کاریز دشت سے چاہ نیمہ کی طرف نکلتی تھی وہ خوابگاہ سے تین میل کے قریب دُور ہے۔

نہر کو ترک کرنے کا واحد سبب یہ تھا کہ اُس وقت کی سطحیں اس کے لیئے سازگار نہ تھیں۔ آخری گڑھے کا نشیب سے فاصلہ بہت کم ہے۔ اور اگر سطحیں سازگار ہوتیں تو تھوڑا سا مزید کام اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا تھا۔ لہٰذا ڈیلٹا کی موجودہ اور اُس وقت کی سطح میں فرق یقیناً بہت زیادہ ہوگا۔ ڈیلٹا کے نچلے یا جنوبی اضلاع پانی کے لئے ہمیشہ ایک نہر کے محتاج رہے ہیں۔ وادی چاہ نیمہ کے قابلِ کاشت رقبہ کا سرا اُس کے زیر اثر نہ آ سکتا تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کاریز کی کھدائی ہی شروع نہ کی گئی ہوتی۔ موجودہ اور اُس وقت کے ڈیلٹا کا فرق کئی فٹ کا ہوگا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ موجودہ سطح کو بلند کرنے کے لیۓ کتنی صدیاں درکار ہوتیں۔ کیونکہ ہلمند کے پانی میں گاد کا عنصر اتنا کم ہے کہ معمولی سی سالانہ صفائی موجودہ نہروں کا کام تسلی بخش رکھ سکتی ہے۔ نشیب کے دہانے پر ایک حصّہ زمین کو سیراب کرنے کی ایک اور کوشش بھی کی گئی تھی، لیکن اسے بھی خیرباد کہہ دیا گیا۔ اگر ظواہر کچھ معنی رکھتے ہیں تو یہ دونو قبل از وقت کوششیں ایک ہی دور میں کی گئیں یا ان میں زیادہ سالوں کا وقفہ نہ ہوگا۔ یہ کاریزات واحد نشانات ہیں جو تراکُن کے شمال میں دشت کی سطح پر نظر آتے ہیں۔

نشیب

چاہ نیمہ نشیب کے دروازے سے پرلی طرف کی وادی کی ہیئت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ ایک تنگ گذرگاہ ہے جو نیم نہر اور نیم شیلا یا دریا کی پُرانی شاخ ہے۔ چاہ نیمہ کے موجودہ گاؤں کا کچھ حصّہ نہر نما ہے جبکہ مزید مغرب کی طرف یہ گذرگاہ ہر لحاظ اور وضع سے دریا کی ایک شاخ ہے جو اُنیسویں صدی کے اوائل میں ہاموں کی طرف جاتا ہُوا جنوبی سمت میں وادیٔ علی آباد میں پہنچا تھا۔ چاہ نیمہ کے گاؤں میں نہر کے آرپار ایک چوڑا بند ہے جو اُس کے پانی کو مسدود کر دیتا ہے۔

ورنہ مشرق کی طرف جب اِس بند کی بلندی کم ہونا شروع ہو جاتی ہے اور نشیب وسیع ہو جاتا ہے تو نہر کا پانی یہاں جمع ہو جاتا اور ایک جھیل بن گئی ہوتی ۔ تھوڑا سا پانی ایک نالی سے داخل ہوتا ہے جس سے ایک حصّہ نشیب میں فصلیں ہوتی ہیں ۔ ایک اور حصّہ میں پانی پایاب گڑھا بناتا ہے جہاں عملِ تبخیر سے پانی خشک ہونے کے بعد گڑھے کی تہہ پر غلیظ نمک کا ایک گہرا ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے ۔ مقامی لوگ مٹی کو علیحدہ کر کے نمک کو استعمال میں لے آتے ہیں ۔

زیارت مرتضٰی علیؓ کے قریب کا نشیب

وادیٔ چاہ نیمہ کے جنوب میں ایک اور نادریا نشیب ہے جو نمک مہیا کرتا ہے ۔ یہ حضرت علیؓ کے مزار سے زیادہ دُور نہیں ہے اور پیغمبرِ اسلامؐ کے داماد کا فیض سمجھا جاتا ہے ۔ اس نمک کے منبع کو حضرتِ علیؓ کے نام سے منسوب کرنا بہت دور اندیشی کی بات تھی ، کیونکہ اِس طرح یہ ایک غیر جانبدار علاقہ بن گیا اور مخالف فرقوں کے لیے یکساں طور پر کھلا رہا جنہوں نے مدتوں سے سیستان کو تین حصّوں میں بانٹ رکھا تھا ۔

بندک نشیب اور مذکورہ دو نو نشیب مل کر دشت کا سب سے بڑا طاس بن جاتے ہیں اور اِن تمام کا تعلق کسی وقت علی آباد کھاڑی سے تھا جب یہ سیستان کی پُرانی جھیل کا حصّہ تھی ۔

شمالی ڈیلٹا میں ہونے والی تبدیلیوں کو کسی حد تک وثوق سے بیان کرنے کے لئے مذکورہ بارِ خاطر پیرے ضروری تھے ۔ اب صرف چند معمولی نکات ہیں جو اگلے ابواب سے پہلے بیان کرنا مفید ہیں ۔

رمک اور قلعہ نو کے قریب کی سطح مرتفع

دشت کی شمالی مغربی راس ہلمند کے زرخیز ڈیلٹا سے زیادہ بلند ہے اور اسی سمت میں قریباً ڈھائی میل آگے الگ تھلگ اور پست سطوحِ مرتفع کا ایک تکونی قطعہ ہے جو کھنڈرات سے پٹی پڑی ہیں اور ایک دوسرے سے دریائی مٹی کی پٹیوں سے جدا ہوتی ہیں ۔ راس اور وادیٔ چاہ نیمہ کے درمیان زمین ٹوٹی پھوٹی ہے لیکن ڈھیریوں اور الگ تھلگ سطوحِ مرتفع

کے بیچ میں سے پست زرخیز مٹی کی ایک پٹی گذرتی ہے جو دشت کے دامن میں ہے اور جس پر موجودہ گاؤں کنگ (چھوٹا کم) واقع ہے۔ اِس کے بعد یہ علی آباد کے میدان میں داخل ہو جاتی ہے۔ اسی سمت میں مٹی کی اونچی ڈھلوان چٹان ہے جس کے مشرقی حصہ میں قلعہ نو کا گاؤں تھا جسے ریگِ رواں نے ہڑپ کر لیا۔ یہ ایک اہم امتیازی نشان ہے۔ اِس چٹان کے شمال میں ایک ایسی ہی الگ تھلگ اُونچی سطح ہے جو کنگ سے بمشکل ایک میل مغرب میں ہے اور اِس کی چوٹی پر بہت قدیم کھنڈرات ہیں۔ یہ آتشکدہ کے کھنڈرات ہیں اور انہی کے ساتھ سیستان کے موجودہ ڈیلٹا کے اہم نقوش کا بیان مکمل ہو جاتا ہے۔

باب چہارم

سیستان کے بحار و انہار پر اصطخری کا بیان

مندرجہ ذیل اقتباس سر ایچ۔ رالنسن کے تذکرہ سے لیا گیا ہے۔ یہ الاصطخری سے ماخوذ ہے جنے سیستان کے بحار و انہار کا بہت حقیقت پسندانہ خاکہ کھینچا ہے۔ وہ رقمطراز ہے :

"اس علاقے کا سب سے بڑا دریا ہند مند ہے جو غور کے عقب سے نکلتا ہے اور ارّدخ اور ضلع داتور کی سرحد پر ظاہر ہوتا ہے۔ پھر یہ بست کو جاتا ہے اور سیستان میں جھیل زرّہ میں گر جاتا ہے۔"

"ہند مند بست سے ایک ہی گذرگاہ میں بہتا ہے اور سجستان سے ایک منزل فاصلے کے اندر اس سے نہریں نکالی جاتی ہیں۔ پہلی نہر تیسم ہے جو کئی اضلاع کو سیراب کرنے کے بعد نشک کی سرحد پر پہنچتی ہے۔ دوسری نہر نشرود ہے جو کئی اضلاع کی آبیاری کرتی ہے۔ پھر سینارود نکلتی ہے جو سجستان سے ایک فرسخ تک بہتی ہے۔ یہی وہ ندی ہے جس پر بست سے سجستان تک کشتیاں چلتی ہیں، بشرطیکہ دریا طغیانی پر ہو کیونکہ تبھی دریا کشتی رانی کے قابل ہوتا ہے۔ شہر سجستان کی تمام ندیاں سینارود سے ہی ماخوذ ہیں۔ پھر جب ہند مند نشیب میں آتا ہے تو نہر شعبہ نکلتی ہے جو تیس دیہات کو سیراب کرتی ہے۔ اس کے بعد نہر رلی ہے جو بہت سے اضلاع کی آب رسانی کرتی ہے۔ مزید نیچے نہر زالک بھی ہے جو ایک بڑے علاقے کو پانی مہیا کرتی ہے۔ ہند مند کا باقی پانی ایک دریائی گذرگاہ میں جاتا ہے اور اس کا نام کرک ہے۔ اسے بھی جھیل زرہ

میں گرنے سے روکنے کے لئے ایک بند ہے جو طغیانی کے وقت ٹوٹ جاتا ہے اور فاضل پانی جھیل میں جاگرتا ہے۔"

ہلمند میں طغیانی کے وقت پانی کے ریلے کی رفتار قریباً چار میل فی گھنٹہ ہے۔ اس وقت کشتی رانی ہوتی ہے بشرطیکہ ان کا بار کم ہو۔ لیکن سردی میں پانی تھوڑا اور پایاب ہونے کی وجہ سے کشتی رانی نہیں ہوسکتی۔ اور پرانے وقتوں میں دریا میں بند باندھے جاتے تھے تاکہ نہروں میں پانی کی معقول سطح رہ سکے۔ لیکن کسی دائمی بند کا ذکر نہیں ملتا جیسا کہ بعد میں ملتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو چھوٹی سے چھوٹی ناؤ بھی نہ چل سکتی۔

نہر تیئم

اگر سرگاہ سیستان (دمب رستم) کے کھنڈرات کو سیستان کا نقطۂ آغاز سمجھا جائے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے تو الاصطخری میں مذکور پہلی نہر کا منبع اس سے ایک منزل اوپر موجودہ گاؤں چہار برجک کے پاس ہوگا۔ اب بھی یہاں ایک ۲۰۰ فٹ چوڑی نہر کی نشاندہی ہوسکتی ہے گو یہ شکستہ و ریختہ اور جزوی طور پر بعد کی نہروں سے مٹ گئی ہے۔ اس سے نہر تیئم واقعی ان اضلاع کو پانی دے سکتی تھی جو اس کا مقصد تھا۔ قدیم و عریض نہر کے نشانات غالباً اسی نہر کے ہیں۔ یہ میکی سطح مرتفع کے دامن اور پست دشت (جو موجودہ دریا کو پرانی گذرگاہ سے جدا کرتا ہے) کے درمیان قدیم گذرگاہ سے گذرتی ہوگی۔

قلعہ فتح کے بالکل قریب چھوٹی چھوٹی موجودہ نہروں کا ایک جھنڈ بھی نکلتا تھا جو اب تباہ ہو چکی ہیں۔ لیکن انہوں نے دشت یا فراز کے سوا نہر تیئم کی قدیم راہگذر کو محو کر دیا۔ وہ شگاف جو سرگاہ کے کھنڈرات کو دو علیحدہ قلعوں میں تقسیم کرتا ہے نہر کے گذرنے کے لئے بنایا گیا ہوگا تاکہ یہ دشت کے اگلے حصے کو آغوش میں لے کر سارو تار کے قریب پسیائی اور تکالہ کے کھنڈرات کے اردگرد کی زمینوں کو سیراب کر سکے۔

زورکن اور زرکن نہریں

قدیم نہریں زورکن اور زرکن جو منسوب بہ نوشیروانِ عادل تھیں یا تو سرگاہ کے کھنڈرات سے ورے یا اغلب طور پر ڈھیری موسومہ بہ دمب کلاں سے پرے جُدا ہوتی تھیں۔ اس وقت صحیح مقامِ انفصال کا پتہ چلانا مشکل ہے کیونکہ ان کے آثار پر حالیہ گاد کی تہیں جم گئی ہیں لیکن روایات بتاتی ہیں کہ دونو جگہیں قلعہ بند تھیں تاکہ اس پشتہ کی حفاظت ہو سکے جہاں سے ان نہروں کا پانی مختلف اضلاع کو تقسیم کیا جا سکے۔ یہی قرینِ قیاس بھی ہے۔ یہ دونو نوشیروان کے ابتدائی دَور کی تعمیر بتائی جاتی ہیں اور ہلمند میں بنائے جانے والے مختلف بندات کے بیان میں ایک اور قدیم کارنامے کا بھی ذکر ہے۔ اسخری نے نہرِ تیمؔ کے متعلق جو کچھ رقم کیا ہے اور زورکن اور زرکن کے نشانات جو ہِشک کے قریب ختم ہوتے ہیں، ان کے بغور مطالعہ سے یقین ہو جاتا ہے کہ موخرالذکر دونو نہر تیمؔ کے راجباہ تھے۔ زورکن پشتہ کے مغرب کی طرف بہتا تھا اور گرداکے مسمار قلعہ کے مغرب سے گزرتا تھا۔ زرکن نسبتاً نشانات کی شہادت پر بڑا تھا اور شمال مشرق کی طرف بہتا تھا اور ایک گہرے شگاف کے ذریعے قلعہ گاوک کے جنوب مشرق کی طرف بہتا تھا اور پھر دشت کے دیگر شگافوں اور عام نالیوں کے ذریعے اپنا پانی ضلع غلغلہ اور چہل برج کے شمال مشرقی علاقوں میں پہنچاتا تھا۔ زیارت امیران سے پانچ چھ میل شمال میں زورکن زرکن کی طرف مڑتا تھا اور یہاں سے یہ دونو پہلو بہ پہلو بہتے تھے اور ان کے درمیان صرف کناروں کا ہی فاصلہ تھا۔ گذرگاہ کی اس یکلخت تبدیلی کا فوری سبب یہ تھا کہ یہاں قدیم اور اب متروک دریائی گذرگاہ موسومہ بہ دوُرؔ کے ڈیلٹا کا نکھا پھیلا ہُوا تھا جو زیارت

ع[۱] جُدائی یا دور ۔ رودِ بیابان سے زیادہ چوڑا ہے اور اس کی گذرگاہ پر دشت کی پست چٹانیں تھیں۔ فرش سخت اور سفید سیلابی مٹی کا ہے۔ شنڈ کے کنوئیں وغیرہ اسی میں واقع تھے۔ گو اس میں خزف ریزے اور دیگر باد آوردہ مواد بھی موجود ہے۔ آب آور تہہ خزف ریزوں کی ہے جسے بلوچی میں شنڈ کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس قدیم گذرگاہ میں کسی وقت ہلمند بہتا تھا اور پھر وہ گرہشک سے آگے دوسری طرف مڑ

ایران کے شمال مشرق میں سیستان ڈیلٹا میں داخل ہوتا ہے اور جو زرکن راجباہ کی دسترس سے باہر تھا۔

اِن توام نہروں کی گذرگاہوں کا تسلسل مُرورِ زمان کے ساتھ خاشش رود نے توڑ دیا۔ لیکن اِس ہنگامی مسئلے کی پیش بندی کی گئی تھی۔ ابھی تک چکین سُر کے جنوب میں دہانہ نامی ایک جگہ ہے جو اِس کے پانیوں کو روکنے کا پُشتہ تھا کیونکہ یہاں ایک پُل کے نشانات ہیں جس کے ذریعے اِن نہروں کا پانی دریا کے اُوپر سے گذارا جاتا تھا تاکہ سیلاب رخنہ اندازی نہ کر سکے۔ اینٹوں کے فرش کے آثار موجود ہیں اور دریائے خاشش کو مصنوعی ذرائع سے اِس کے قریب رکھا جاتا تھا تاکہ سیلابی پانی کا نکاس ہو سکے۔

زورکن اور زرکن کے آثار اِستخری کے بیان پر پُورے اترتے ہیں۔ جو تھوڑا بہت اضلاع غلغلہ اور سارو تار اور ریگ بستہ زمین کے متعلق ہم جانتے ہیں اُس کی بناء پر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہی اضلاع رسالک کہلاتے تھے اور سیستان کا اناج گھر تھے۔ توام نہروں کی گذرگاہ شروع تا آخر، اِس کی سمت اور محلِ وقوع کی جو پہچان کی گئی ہے وہ بیان کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا نہر تیمؔ جو چہار بُرجک کے قریب بلند سے جُدا ہوتی تھی اِن نہروں کا سرچشمہ تھی اور راس سرگاہ کے شگاف کے ذریعے مشرقی سمت میں بہتی تھی۔

ارباب دوست محمد گاؤں سے ایک میل شمال میں قدیم نہر زرکن کی ۳۰۰ فٹ لمبائی اب بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اور اِس سے آگے جہاں اِس کا کنارہ ایک قدرتی ڈھیری کی شکل اختیار کرتا ہے وہاں پتھروں کا ایک ڈھیر کھڑا ہے جو ایک بلوچ غلام نامی سے منسوب ہے۔ اِس سے بھی آگے

گیا۔ ورنہ اِس بے آب و گیاہ علاقے میں اتنی چوڑی گذرگاہ چہ معنی دارد؟ یہ علاقہ ہنوز نامعلوم ہے۔ گنگروں آب آور تھیا پانی کی موجودگی کی اور کونسی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ سوائے اِس کے کہ پرانی گذرگاہ میں چمن یا پست چراگاہ سے نمی رِستی رہتی ہے۔ خاشش رود بھی زمینداور کی پہاڑیوں سے بیچ میں پڑتا ہے۔ تھوڑی اور غیر یقینی بارش کی وجہ سے دور کی گذرگاہ کے پانی کو مقامی چشموں سے منسوب نہیں کیا جا سکتا (جی۔ پی۔ ٹی)

شمال میں اور مسمار قلعۂ گردو کے آگے اس کی گذرگاہ انتہا تک شناخت ہو سکتی ہے کیونکہ یہ علاقہ ہلمند کی تگ و تاز اور نتیجتہً گاد سے محفوظ رہا ہے۔

اس کے آثار کے پاس ہی ایک موجودہ گاؤں دیہہ نیاز خان ہے اور اس سے آگے پختہ اینٹوں کے دو ستون ہیں جو دونوں کناروں کی چالیس فٹ لمبائی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ آب جُو کو ۱۵ فٹ رستہ دیتے ہیں اور یہاں نہر ۸ فٹ گہری ہے۔ یہ ستون جزوی طور پر ایک ڈھیری کے نیچے دبے ہوئے ہیں جو کسی قدیم گاؤں یا عمارات کا مقام ہے اور اس ڈھیری پر خستہ و شکستہ جھونپڑیوں کا جھنڈ ہے۔ اس سے آگے اور کوئی ایسی چیز نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ ہم اس پُل کے آثار تک پہنچتے ہیں جس کا پہلے بیان ہو چکا ہے۔

نشرُود

دوسری نہر نشرُود ہے جو غالباً بائیں کنارے سے نکلتی تھی، کیونکہ دائیں کنارے سے دو بڑی نہروں کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ یہ فرض کرنا بھی عین قدرتی ہے کہ جنوبی ڈیلٹا کو پانی کی فراہمی کی کوشش کی جاتی تھی۔

اس وقت چہار برجک سے قریباً تین میل اُوپر ایک ڈھلوان چٹان پر ایک تباہ شدہ قلعہ چہل مریز ایستادہ ہے جو روایتاً چالیس تقسیم گاہوں یا کسی ایسی نہر کی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا جس کا پانی چوبیس چوبیس گھنٹوں کے چالیس حصّوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ 'مِی' شبانہ روز کا مترادف ہے اور چوبیس گھنٹوں یا دن رات کے حصّہ آب کو بیان کرتا ہے۔ غالباً نشرود دریا کے اتنے اُونچے مقام سے نہ نکلی ہوگی۔ یہ غالباً بندر کمالخان کے پاس سے نکلی ہوگی اور شاید جُوئے گرشاسپ کے آثار میں ہی استخری کی یہ نہر ملفوف ہو۔ یہاں بہت سی نہریں تھیں۔ نشرود رودِ بیابان کی آخری زمینوں کو سیراب کرتی تھی اور دوسری نہریں گذرگاہ کے جنوب میں دشت کی زمینوں کو۔ غالباً نشرود کا نام آج بھی رودِ نصرُو کے نام میں محفوظ ہے جو ہلمند کی بہت بعد کی گذرگاہ کو دیا گیا ہے۔ سینارود کے علاوہ اسی قدیم نہر کا نام ہنوز زندہ ہے۔

سینا رود

اگلے نمبر پر سینارود آتی ہے اور یہ بیان کہ یہ دارالحکومت[1] سے ایک فرسخ کے اندر بہتی تھی، موجودہ سینارود کو اس کا جانشین ثابت نہیں ہونے دیتا۔ سطح زمین کے آثار کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلند اور اس نہر کا مقام انفصال غالباً وہاں تھا جہاں اب ہفتار کنڈ کے کھنڈرات ہیں جو خوابگاہ سے سات میل اوپر ہیں۔ سینارود اس گاؤں سے سوا دو میل جنوب مشرق کی طرف کے قطعۂ دشت میں بہتی تھی اور موجودہ گاؤں دنتنو سے گذر کر اور قلعہ محمود سے گذرتی ہوئی موجودہ گاؤں دیوالک کے پاس نشیب میں آجاتی تھی جس کے ذریعے اس کا پانی چنگ دراز گو میں چلا جاتا تھا۔ یہ سارا علاقہ ایک دلدلی تہہ ہے اور اس وقت کے نواحیات و باغات سے مل کر یہ شہر کے قرب وجوار سے چھ میل سے بھی کم دور ہوگی۔ اگر ہفتار کنڈ سے نہیں تو یہ خوابگاہ سے سوا دو میل مشرق میں دشت کی ڈھلانوں سے نکلتی ہوگی۔ ان ڈھلانوں کی مغربی چٹانوں پر بہت قدیم کھنڈرات ہیں جو سینارود سے اونچے تھے۔ یہ متبادل گذرگاہ دنتنو کے پرے پہلی سے مل جاتی تھی۔ غالباً بلند موجودہ قلعہ کوہک تک اپنی موجودہ گذرگاہ میں بہتا تھا اور پھر بائیں یا مغرب کی طرف چکر کھا کر خواجہ احمد کے آستانہ کے پاس سے گذرتا تھا اور پھر اسی گذرگاہ پر آجاتا تھا یا اس راستے پر آنکلتا تھا جو قریباً ساٹھ سال پہلے دریائے علمدار کا تھا اور دارالحکومت کے قریب ہی مغرب کی طرف نکل جاتا تھا۔

بندر کمالخان کے ورے دریا کے مغرب سے کوئی نہر نہیں نکل سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ دشت میں کوئی گہرا راستہ ہو لیکن اگر ایسا ہوتا تو اس کا نشان رہتا اور وقت اسے نہ مٹا سکتا۔ ایسا کوئی نشان موجود نہیں حتیٰ کہ موجودہ بلند پر ماشی سے آگے نشان ہے۔

نہر شعبہ

فہرست کی اگلی نہر شعبہ تھی اور یہ موجودہ رود سیستان کی پیشرو تھی۔ شعبہ کا مطلب ہے

---

[1] بنلئے کے یا شہر خسرو بمقام نادعلی اسخری کے وقت سیستان کا دارالحکومت تھا۔ دیکھئے حصہ سوم۔

زیریں یا جنوبی نہر، اور یہ انہی علاقوں کو سیراب کرتی تھی جنہیں اب رود سیستان کرتی ہے۔ اصلی نہر کے بائیں طرف کا ضلع شعب آب (پانی کا جنوب) کہلاتا ہے اور غالباً اسی وجہ سے اس قدیم نہر کا نام شعبہ پڑا۔ یا شاید اس لئے یہ نام رکھا گیا کہ یہ سیستان کے جنوبی اضلاع کی آبرسان تھی۔ نہر شعبہ عام نہروں سے کافی مختلف تھی۔ استخری کے لکھتے وقت بلند سے اس کا اصلی سرچشمہ وہ مقام تھا جو گاوک کے کھنڈرات کے مقابل تھا اور جسے اب ماشی کہتے ہیں۔ یہ عین مغرب کے دشت کو ایک کاریز سے عبور کرتی ہے جس کے گارے کے ڈھیروں کا سلسلہ کافی اونچا ہے۔ یہ زمین مغرب کی سطح مرتفع سے ایک نشیب کے ذریعے جدا ہوتی ہے جو کسی وقت ہلمند کی گذرگاہ تھی۔ اس مختصر وادی کا شمالی سرا سیلاب آوردہ مٹی سے بھرا ہوا ہے۔ اور جونہی کاریز اس تنگ میدان میں آتی ہے تو اس کے پیچھے پیچھے ایک کھلی نہر آتی ہے جو ۱۵ فٹ چوڑی ہے اور جو اس زرخیز زمین کو مغربی دشت کے آغاز تک پار کرتی ہے۔ یہاں سے یہ ایک زمین دوز سرنگ کی صورت میں مغربی دشت کو عبور کرتی ہے اور اس میں وقفے وقفے سے عمودی ستون کھڑے ہیں۔ گویا یہ پھر ایک کاریز بن جاتی ہے اور خوابگاہ سے ذرا آگے شگاف تک چلتی ہے۔ جس کے بعد یہ پھر ایک کھلی نہر بن جاتی ہے۔ کوئی ڈیڑھ میل آگے دشت کی ایک راس کو پھر ایک زمین دوز کاریز کے ذریعے عبور کرتی ہے اور یہ دشت کے شمال میں پھر ایک کھلی نہر بن جاتی ہے نہر شعبہ کے پہلے دس بارہ میلوں میں کھلی نہر اور کاریز کی باری باری آمد خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نہر کو زیادہ سے زیادہ اونچی سطح پر رکھا جاتا تھا تاکہ اسے پانی پر زیادہ دسترس حاصل رہے۔ اسے کھودنے میں بہت محنت صرف ہوئی ہوگی۔ اس کے کاریزی حصوں کی ایک اور دلچسپ بات بھی ہے۔ ان کے ستون اب بھرے ہوئے ہیں لیکن ان کے گارے کی ڈھیریاں موجود ہیں جو چھوٹی تو ہوگئی ہیں لیکن سرنگ کی راہگذر کی رہنما ضرور ہیں۔ وہ دشت کے موجودہ سرے کے اتنی قریب ہیں کہ وہ بے سود ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان میں سے بہت سی تو غائب بھی ہوگئی ہیں۔ گھاٹیوں نے بتدریج دشت کو کاٹ دیا ہے۔ نہر کے بعض حصوں کو کاریز بنانا اور آگے بڑھتے ہوئے حصوں کو ان کے ذریعے

عبور کرانے کا مطلب یہ ہے کہ تعمیر کے وقت دشت مشرق اور شمال مشرق کی طرف بہت زیادہ تھا اور کاریزیں ہی ایک بہتر راگہذر تھیں۔ جو کاریز نشیب چاہ نیمہ کی آبپاشی کے لئے شروع کی گئی اور پھر ادھوری چھوڑ دی گئی اُس قدیم نہر شعبہ کی دوسری کاریز کی شاخ تھی۔ قدیم نہر کا تسلسل دَرمال کے جنوب کی راس میں ایک کاریز (جس کے آثار موجود ہیں) کے ذریعے قائم رکھا گیا اور یوں یہ سیستان کے جنوبی ڈیلٹا کے شمالی حصہ تک پہنچی۔ دشت کے بڑھے ہوئے حصّوں کو کھلی نہر اور کاریز کے ذریعے عبور کرانے سے وہ حصّے محفوظ رہ گئے ہیں اور ایک ہزار سال گذرنے کے بعد بھی کام کی وسعت اور راگہذر کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کوہک کے مشن کیمپ کے شمال مغرب میں یہ قدیم نہر دشت کے ایک نادر یا نشیب میں داخل ہوتی ہے جسے بوجہ رنگِ زمین جائے سُرخ کہتے ہیں۔ دشت میں ایک بڑا شگاف ہے جو اِس طاس کا شمالی کنارہ بناتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ذخیرۂ آب کا کام کرتا ہو اور یہاں کا پانی کئی نالوں میں تقسیم ہوتا ہو۔ اب بھی نشیب رودِ سیستان کے فالتو پانی سے بھرا رہتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ موجودہ نہر خوابگاہ کی گذرگاہ کے اندر کسی قدیم پُل یا بند کا پشتہ دونوں کناروں میں دبا ہُوا پایا گیا۔ یہ کنارے پختہ اینٹوں کے بنائے گئے اور چونکہ محراب غائب ہے، لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تعمیراتِ عامہ کی کونسی قسم سے تعلق رکھتے تھے۔ اِس حصّۂ ملک میں ہَوا کی دستبرد نے ایک بُہت قدیم نظامِ آب پاشی کا پتہ دیا ہے جس کی نہریں یا آبی گذرگاہیں زمین کی موجودہ سطح سے ڈھائی فٹ نیچے مدفون ملی ہیں۔

انہار زالک

اِس کے بعد استخری کی فہرست میں زالک کی نہریں ہیں۔ زالک کا ضلع غالباً ملک کا وہ حصہ تھا جو مغرب میں بُنجار اور قاسم آباد کے پُرانے دیہات اور شمال اور مشرق میں جلال آباد اور رکارکو کے درمیان واقع تھا۔ عین ممکن ہے کہ اِس کی شمالی حدُود جلال آباد سے بھی آگے ہوں اور اِس میں سادری شاہ کی سمت میں کوہک ڈھیری تک کا علاقہ شامل ہو۔ نہر زالک غالباً شریف آباد کے موجودہ گاؤں کے

پاس سے ہی نکلتی تھی ۔ اس سے آگے اس کی گذرگاہ شمال مغرب کی طرف تھی جہاں اب پریُون کی آبی گذرگاہیں ہیں اور اس کی راہگذر غالباً وہی تھی جو پُرانی نہر ہرگو کی جو اپنے وقت کی اہم نہر تھی اور جس کے آثار اب بھی جلال آباد اور کرکُو کے درمیان موجود ہیں اور موخر الذکر سے قریب تر ہیں ۔ چہار دری کے کھنڈرات کی ہیئت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دورِ زاہدان کے ہیں ۔ لیکن یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا قدیم نواحی نہر بھی اسی دَور کی ہے یا نہیں ۔ ٹپّہ کوہلک کے شمال اور مشرق میں ایک بڑی نہر کے آثار ہیں جو شمال مغرب کو جاتی تھی اور رساوری شاہ کے پرانے قصبے کی زمینوں کو سیراب کرتی تھی ۔ اس کی گذرگاہ اب بھی ڈھیریوں کی قطار سے پہچانی جا سکتی ہے جو اس کے گارے کے اونچے کناروں کے بچے کھچے حصّے ہیں جنہیں پُرآب ہونے کے موسم میں بھی اونچے سرکنڈے نہیں چھپا سکتے ۔ اکبرآباد کی بڑی ڈھیری اور دیواروں کے بے شمار ٹکڑے اور اینٹوں کی بھٹیاں اس کی گذرگاہ کا پتہ دیتی ہیں اور اس کے کناروں کی قدیم آبادیوں کے آثار ہیں ۔ بعید ترین ڈھیری ٹپّہ برنجک ہے جو اسی نام کی جنگل میں ایستادہ ہے جو ہاموں میں سرکنڈوں کی عظیم ترین دلدل ہے ۔ ٹپّہ کوہلک کے اردگرد کی زمین نہروں اور عمارتوں کے آثار سے بھری پڑی ہے جو پریُون کے سالانہ سیلابوں سے اب قریب قریب ناپید ہو رہے ہیں ۔ یہ آثار یا ڈھیریاں اس دلدل میں چھوٹے چھوٹے جزیرے بنے رہتے ہیں جو کوہلک کو سال کے آٹھ نو مہینے گھیرے رکھتی ہے ۔ البتہ کوہلک ڈھیری کے اردگرد کے آثار موجودہ وقتوں کے ہیں ۔

دریا کا ڈیلٹا میں داخلہ ، ایک مقررہ مقام

سیستان کے بحار و انہار کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہیئے ۔ وہ یہ ہے کہ دریا کا شمالی ڈیلٹا میں داخلہ ہمیشہ ایک مقرّرہ مقام سے رہا ہے ۔ جو اگر تھوڑا سا بھی بدلا ہے تو بہت تنگ حدود کے اندر ، جس میں تبدیلی کی گنجائش بہت ہی کم ہے[1] ۔ اسخری کے دَور سے لے کر دریا ہمیشہ

---

[1] ۔ جن حدود میں تبدیلی ممکن تھی وہ ایک متساوی الساقین تکون کے رقبہ سے ظاہر ہے جس کی ہر طرف چھ میل لمبی اور قاعدہ (چوٹی کے شمال کی طرف) چار میل سے زیادہ چوڑا نہیں ۔

اسی مقام سے ڈیلٹا میں داخل ہُوا ہے اور جب کبھی اُس کی گذرگاہ ایک ہزار سال پہلے کی گذرگاہ کے آس پاس چلی گئی ہے تو ساتھ ہی نہروں کی راہگذر بھی قدیم نہروں کی راہگذر کی طرف واپس چلی گئی ہے بشرطیکہ فراہمی آب اور دریا پر موہوم سا قابو بھی رکھا گیا ہو۔ لہٰذا آثار نما نہریں قدیم نہروں کی راہگذر پر ہی ہیں یا دو تین فٹ گاد میں دبی ہوئی پُرانی نہروں پر ہی کھڑی ہیں۔ موجودہ حالات میں نہروں کی موجودہ راہگذر کا دریا سے وہی تعلق ہے جو ایک ہزار سال پہلے پُرانی نہروں کا ہلمند سے تھا۔

نہر ہلی

نہر ہلی غالباً موجودہ قلعہ کوہک کے پاس سے ہی نکلتی تھی۔ اس کا رُخ بھی شمال مغرب کو تھا اور کاچیان کا موجودہ گاؤں نہیں تو کم از کم قاسم آباد اور تُجار دیہات کی بیشتر زمینوں کو سیراب کرتی تھی۔ اِس نہر اور اِس کی تقسیم گاہوں کا کام اب موجودہ حُسَینکی نظام انہار کے سپُرد ہے نام عجیب وغریب ہے یعنی متعلق بہ میل۔ غالباً اِس کا پانی میل قاسم آباد تک جاتا تھا۔ اگر مینار موجود ہوتا تو وجہ تسمیہ آسان ہوتی۔

باب پنجم

دریا نہروں کا سرچشمہ تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ اِن آبی گذر گاہوں کے لیۓ کوئی ہیڈ ہو۔
یہ بندات کے ذریعے کیا گیا اور اب انہی مستعمرات اور دریا کی گذر گاہ میں تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جائے گا۔

بندِ کوشک

سرِفہرست قدیم ترین بند تھا جو اوّلین خاندان کے مشہور افسانوی اور ماقبل تاریخ بادشاہ جمشید سے منسوب ہے۔ یہ اتنا قدیم تھا کہ اِس کا نام بھی فراموش ہو چکا ہے۔ یہ بندِ کوشک کہلاتا ہے۔ کیونکہ یہ خوابگاہ سے چار میل اوپر اور کوشک نامی کھنڈر سے دو میل اوپر دریا پر پھیلا ہُوا ہے۔

یہ کھنڈر ایک کھاڑی کے دہانہ پر دشت کی ایک ڈھیری پر ایستادہ ہے جو دشت کے ایک چوکور قطعہ میں ہے جس کا وتر عین شمالی اور جنوبی سمت میں ہے۔ اِس کا جنوبی زاویہ موجودہ ہلمند کے اوپر ہے اور مشرقی زاویہ ہنفار کنڈ کے کھنڈرات کے اوپر۔ یہ واضح نہیں کہ آیا بند گذر گاہ کے آرپار تھا جب دریا اسی جگہ بہتا تھا جہاں اب ہے یا جب یہ دشت کے مشرقی زاویے کے پاس سے گذرتا تھا۔ روایات تمام اہم کوائف میں مبہم ہیں۔ لیکن دریا جہاں کہیں بھی ہو ہنفار کنڈ کے کھنڈرات کے شمال میں چار بہت پرانی نہروں کے آثار ہیں جن کی گزرگاہ ان کے گارے کے کناروں سے پہچانی جاسکتی ہے۔ ان میں سے دو بڑی تھیں۔ یہ دریا سے اُس وقت نکالی گئیں جب یہ قریباً اپنی موجودہ جگہ پر تھا اور مقامِ انحراف ہنفار کنڈ کے کھنڈرات سے قریباً ڈیڑھ میل اُوپر ہوگا۔

چکنی مٹی کی زمین میں بہت نفیس سنگریزوں کا عنصر ہے اور جب ایک نئی نہر کے کنارے باندھے جاتے ہیں تو پتھر نظر نہیں آتے۔ لیکن مرورِ زمان کے ساتھ ہوا اس مٹی کو اُڑا لے جاتی ہے جو گرمی اور سردی کی باری باری آمد اور نمی اور شور کے مشترکہ عمل سے ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ سنگریزے باقی رہ جاتے ہیں اور اِس طرح مٹی غائب ہو جاتی ہے اور صرف سنگریزوں کے ڈھیر رہ جاتے ہیں جو باقیماندہ مٹی کو بچاتے ہیں۔ اِس حالت میں ٹوٹے پھوٹے کنارے غلطی سے قدرتی ڈھیریاں سمجھ لئے جاتے ہیں بشرطیکہ وہ اکیلے اکیلے ہوں۔ لیکن اگر کئی پرانی نہریں متوازی بہتی رہی ہوں یا ان کی گذرگاہیں ایک ہی قسم کے پیچ و خم سے گذری ہوں تو یہ الگ تھلگ ڈھیریاں گڈمڈ ہو جاتی ہیں اور تماشائی کو اپنی اصل راگذر کا پتہ دے دیتی ہیں۔

جب دریا شمالی ڈیلٹا کی طرف مڑ جاتا تھا تو اس کے پشتہ میں تبدیلی کا امکان کم ہو جاتا تھا اِس لئے ممکن ہے کہ موجودہ ملبند اسی گذرگاہ میں بہتا ہو جس میں وہ بندِ جمشید کی موجودگی میں بہتا تھا۔

ترکوہ اور رک دیلا کے درمیان بندِ نوشیرواں

دوسرے نمبر پر بندِ نوشیرواں ہے۔ یہ دریا میں کئی میل اوپر تھا۔ روایت کے مطابق یہ رکم کے پتھریلے کنارے پر بنایا گیا تھا جو دریا کے دائیں کنارے پر واقع چٹان سے دریائی گذرگاہ کے پار پھیلا ہوا ہے۔ یہ چٹان ترکوہ کہلاتی ہے۔ حروف 'ر' اور 'ل' اکثر آسانی سے ادلے بدلے جا سکتے ہیں اور ترکوہ اور تلک کوہ ایک ہی ہیں اور حرف 'گ' ساکت ہے یا حذف کر دیا جاتا ہے۔ تلک ایک بہت پرانا لفظ ہے بمعنی قبر اور زیادہ مانوس فارسی لفظ گورکی بجائے اکثر استعمال ہوتا ہے۔ اس چٹان یا ڈھیری کو ایک قبرستان کے آثار بتایا جاتا ہے اور لسپت چٹان کے چہرے پر قدیم قبریں مٹی میں کندہ ہیں۔ رک دیلا کا قلعہ نوشیرواں کے ایک عامل نے بند کی حفاظت کے لئے بنایا تھا۔ یہ مرمت کی بھی بروقت اطلاع دیتا تھا۔ اِس بند اور اِس کے مقصد کے لئے روایت بہت لمبی ہے۔ زورکن اور زرکن کی نہریں (جن کا ذکر ہو چکا ہے) دائیں کنارے یا بند کے خاتمہ کی ایک گذرگاہ سے نکلتی تھیں تاکہ اِن اہم نہروں کے لئے ایک آبی ہیڈ قائم رہے

اور رودِ سینایا سینارود میں بھی پانی رواں رہے۔ دائیں کنارے کی نہر کا سیرابی علاقہ اب ایک صحرا ہو چکا ہے لیکن نہر اپنے خاتمہ تک دیگر زمینوں کی بھی آبیاری کرتی تھی۔

زرکن اور زورکن کی تشریح

زرکن اور زورکن کی وجہ تسمیہ یوں ہے پہلے زورکن بنی جو بیگار سے بنوائی گئی۔ لہٰذا زورکن کہلائی۔ بعد میں زرکن بنی جو اُجرت کی وجہ سے مزدوروں نے خوشدلی سے بنائی۔ اور یہ دونو میں بڑی بھی تھی[1]۔ بندات جمشید و نوشیرواں کو روایت کے مطابق سیلاب بہا کر لے گئے۔

شاید روایات میں کوئی جزو صداقت ہو کیونکہ بندات کے موجود ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔ بند نوشیرواں کو دریا کے کافی اُوپر بنانا ضروری تھا کیونکہ دریا اپنے ڈیلٹا کو گاد سے بھرتا جا رہا تھا اور متروکہ رود سینا کو بھی رواں کرنا مقصود تھا۔ سیلاب بُردی کی بجائے اغلب تر یہ ہے کہ دریا نے اپنی گذرگاہ بدل لی اور رود بیابان یا کسی اور گذرگاہ میں بہنے لگا جو تراکن کے جنوب میں مٹی ہوئی ملتی ہیں۔ شمالی ڈیلٹا میں اس کی واپسی تک ایک نئی راہگذر یا ایک نیا نظام انہار ضروری ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ درمیان میں کئی صدیوں کا تفاوت ہو گا۔ خسرو اوّل یعنی نوشیرواں عادل نے ۴۸ سال حکومت کی اور ۵۷۹ء میں فوت ہوا۔ الاسحزی دسویں صدی عیسوی کے وسط میں رقمطراز ہوا۔ گویا اس کی موت کے قریباً ۴۰۰ سال بعد۔ لہٰذا ان دونو واقعات کے درمیان سیستان کے تیموری حملے (جو زاہدان کی تباہی اور اس کے حکمران ملک قطب الدین کو سزائے قید پر منتج ہوا) اور آج کل کے درمیان بُعدِ زمانی سے زیادہ بُعد ہے۔ ۳۶ھ اور ۴۳ھ میں عرب عساکر کی نقل و حرکت کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ہلمند شمالی ڈیلٹا میں تھا۔ اور یہ ناممکن نہیں ہے کہ بند نوشیرواں بہت بعد میں بنا ہو اور صحیح علم کے فقدان کی وجہ سے روایت نے اُس سے منسوب کر دیا ہو۔ دونو مشہور نہروں کا قصہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ دارالحکومت کی موجودگی اس کا واضح ثبوت ہے کہ دریا اپنے

---

[1] زور: طاقت لہٰذا جبر، زر: سونا لہٰذا اُجرت

شمالی ڈیلٹا میں مدّتوں سے بہہ رہا تھا پیشتر اِس کے کہ عربوں نے اِسے شہر پہنچنے کے لئے عبور کیا۔ بندِ نوشیرواں کو بندِ چشمکہ بھی کہتے تھے۔

عبیداِبن زیاد نے زَرَنج سے بُسْت جاتے ہُوئے سینارود عبور کرنے کے بعد جو ئے کہنہ کے ساتھ ساتھ سفر کیا جو یقیناً زورکن تھی اور نوشیرواں سے منسوب نہروں میں سے مغربی تھی۔ یہ معلومات سر ہنری رالنسن کے تذکرہ سے ہیں جو اُس نے بلاذری سے ترجمہ کی ہیں۔ اسطخری کے وقت نہرِ تیبؔم دریا میں کافی اوپر بن چکی تھی لیکن اُس نے اسے ذرا نیچے اِن دو نو نہروں کی آبرسان دکھایا یہ دو نو نہریں بالکل وہی علاقہ سیراب کرتی تھیں جو اسطخری نے بیان کیا اور یہ آثار سے بھی ثابت ہے۔ نہر زرکن کی راہگذر بشرطِ صفائی و روانی دشت میں سے گذرتے وقت ۱۰۰ فٹ تھی۔ آثار کے لحاظ سے یہ پُرانی نہر شعبہ سے بڑی معلوم ہوتی ہے جس کے آثار بھی موجود ہیں۔ دشت میں اِس کے گارے کے کنارے دو مختلف ادوار کے ہیں جن میں سے بالائی اور متاخر قدیم تر کناروں پر کھڑے ہیں۔

بندِ رُستم

ہلمند کا تیسرا بند، بندِ چشمکہ سے بھی اُوپر ہے۔ اِس کی روایت زیادہ قطعی ہے۔ یہ بعد میں تعمیر ہُوا اور تواریخ میں اِس کا تذکرہ اس کے وجود کا ضامن ہے۔ روایات حالیہ ہونے کی وجہ سے قطعی ہیں اور بہت سی قرینِ قیاس جُزئیات پر مشتمل ہیں۔ جس ترتیب سے یہ بند مختلف ادوار میں موجود دکھائے گئے ہیں، وہ بھی مُلک کی ہیئت اور جغرافیہ کے مطابق ہے۔ بندِ رُستم کی کہانی مناسب جگہ پر تحریر میں لائی جائے گی۔

الاسطخری میں مذکور رام شاہرستان کی تباہی غالباً ہلمند کی شمالی ڈیلٹا میں ناگہانی واپسی کی وجہ سے ہوئی۔ ہوسکتا ہے یہ نسبتاً حالیہ دَور میں ہوئی ہو جب اِسی بناء پر قلعہ فتح کو خالی کرنا پڑا اور دارالحکومت منتقل کرنا پڑا۔

الاسطخری میں مذکور ہلمند کا بند جو پانی کو ہاموں میں ضائع ہونے سے روکتا تھا تختِ پُل سے ورے یا اِس کے شمال مغرب میں واقع ہوگا۔ یہ محتاط مصنّف کے مطابق ایک عارضی تعمیر تھا اور

غالباً تمرس کی شاخوں کے گٹھوں سے بنایا گیا تھا۔ اس سے بہت کاشتکاری ہوتی تھی اور بہت سا علاقہ سرسبز ہو گیا تھا جہاں اب سرکنڈوں کی بہتات ہے یا وہ کئی فٹ پانی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ قصبہ ساوری شاہ کا ہاموں میں وجود اسی آبادی کا نتیجہ تھا۔ یہ کھنڈر بہت پرانی جگہ پر ہے اور اس کی بقا دریا کو قابو رکھنے پر منحصر تھی جو اس کی تعمیر و حفاظت منسوبہ بہ دیو مالائی بادشاہ جمشید اور تاریخی نوشیروانِ عادل سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہلمند کی خشکی پر ہاموں ساوری میں فرح رود کا فالتو پانی زرعی آبادی کا سہارا تھا اور کنوئیں گھریلو استعمال میں آتے تھے۔ ہلمند کے دہانہ کے قریب اور پل سے چند میل کے اندر بند کا وجود گذرگاہ کو پار کرنے کے لئے کسی ذریعہ کی ضرورت کا جواز تھا کیونکہ بند سے پرے پانی رُک کر بہت گہرا ہو جاتا تھا۔ کارکوشاہ اور نادعلی کے درمیان اور کوئی پل نہیں ملا گو ممکن ہے کہ کوئی اور پل تمرس سے ڈھکا ہوا یا گادسے دبا ہوا کھنڈر کی صورت میں موجود ہو۔

سیستان پر تیموری حملہ

سیستان پر تیموری حملے نے بالآخر اس صورت حال کو ختم کر دیا جو الاصطخری کے وقت سے موجود رہی تھی بلکہ شاید بہت ہی معمولی تغیر کے ساتھ قائم رہی تھی جب سے سیستان ساسانی سلطنت کا ایک صوبہ بنا تھا، تبدیلیاں ہوئی تھیں لیکن وہ تدریجی اور فلاحی تھیں۔ ملک قطب الدین کے دور سے پہلے ہی ہلمند شمالی ڈیلٹا چھوڑ کر جنوبی میں آ گیا تھا اور رودِ بیابان سے بہتا ہوا ہاموں میں گرتا تھا۔

ہلمند کا بند

اس تبدیلی گذرگاہ کے اثرات کو کسی حد تک بندِ ہلمند کی تعمیر نے کم کر دیا اور بند شمالی ڈیلٹا کے اضلاع کی آب پاشی کا ذریعہ بنا۔ یہ بند رکمالخان سے پرے دریا میں بنایا گیا تھا۔ تبدیلیٔ گذرگاہ اور تعمیرِ بند کی تواریخ کا حتمی تعین ممکن نہیں۔ ۷۸۵ھ (۱۳۸۵ء) میں تاریخ میں یہ بند رستم کہلاتا ہے اور اس وقت یہ قدیم سمجھا جاتا تھا۔ روایات کے مطابق اس وقت زاہدان ۴۳۰ سال پرانا تھا اور بندِ رستم آنا پرانا تو ہو گا جتنا زاہدان۔ ایشیائی یادداشت بہت طویل ہوتی ہے اور دو سو سالہ یا تین سو سالہ روایات اکثر مبنی بر حقائق ہوتی ہیں اور بہت قیمتی معلومات سے مملو۔ لہٰذا

اگر اُس وقت بند محض دو سو سال پُرانا ہی ہوتا تو اِس کی عُمر کی کوئی قطعی روایت موجود ہوتی لیکن یہ ممکن ہے کہ تبدیلیٔ گذرگاہ پر یہ بند کسی پُرانے بند کے ملبے پر بنایا گیا ہو اور پُرانے بند کی روایات اِس کی تجدید سے منسوب کر دی گئی ہوں اور اِس کی اپنی تاریخ فراموش کر دی گئی ہو۔ جمشید اور نوشیرواں سے منسوب بندات کی جگہوں کا آج بھی پتہ دیا جاتا ہے اور اگر آج کل اِن دونوں کو بنانا ضروری ہوتا تو گنوار لوگ اِنہیں محض قدیم مستعمرات کی تجدید ہی گردانتے۔ لہٰذا بندِ رُستم تیمور کی تباہ کاری سے کم و بیش ۲۰۰۰ سال پہلے موجود رہا ہوگا۔ نظامِ آبپاشی کے سلسلہ میں روایت واضح اور بہت قیمتی ہے۔ اس کے مطابق بند کے عقب میں جمع ہونے والے ذخیرۂ آب سے نہریں نو ماہ تک پانی سے بھرپور رہتی تھیں۔ سیلاب کے تین ماہ میں فاضل پانی بند سے اُچھل کر رودِ بیابان سے ہوتا ہُوا ہاموں بلکہ گاؤ زرہ میں پہنچ جاتا تھا۔ کیانی بجا طور پر اپنے آبا و اجداد پر فخر کر سکتے ہیں جب اِن میں ایسے حکمران تھے جو ایسے عظیم کارنامہ کے اہل تھے اور ایک بڑا اور پیچیدہ نظامِ آبپاشی سنبھال سکتے تھے۔

<u>بندِ رُستم کی تباہی</u>

سیستان میں تیمور کا آخری کام بندِ رُستم کی تباہی تھی۔ روایت اِس بند کو بندر کمالخان سے چار میل دُور دریا میں واقع بتاتی ہے۔ یہاں دریا کا پاٹ تنگ ہو جاتا تھا اور اِس میں کم کی ایک پٹی تھی اور دو طرفہ کنارے اس کی وجہ سے معیّن اور چٹان نما تھے۔ اِسی جگہ پر کسی قدیم حکمران نے ایک بند بنوایا تھا۔ جب ہلمند نے گذرگاہ تبدیل کر کے رودِ بیابان میں بہنا شروع کیا تھا۔ یہ دارالحکومت کے اردگرد خوشحالی قائم رکھنے کے لئے بے حد ضروری تھا۔ روایت یہ بھی بتاتی ہے کہ بند کا ذخیرہ آب اِس سیلاب آور وہ زمین کو ڈبو دیتا تھا جو چہار بُرجک گاؤں اور اِس کے مغرب کی سطح مرتفع کے درمیان واقع ہے۔ اِس طرح شمالی ڈیلٹا میں ہلمند کی پُرانی گذرگاہ پانی سے زندہ و روندہ رکھی جاتی تھی۔

<u>بندِ رُستم کے متعلق روایت</u>

کہا جاتا ہے کہ یہ بند پختہ اینٹوں کے چُونے اور سروج سے بنا تھا اور اِس کے اُوپر مٹی کے

پائپ لگے ہوئے تھے جو سیلابی پانی کو مغرب کی طرف منتقل کر دیتے تھے۔ اس کا نام بندیکاؤ بتایا جاتا ہے اور یہ بندِ یکاؤ اور بندِ رستم دونوں ناموں سے یکساں طور پر مشہور تھا۔ رودِ بیابان کے اوپر کی ڈھلانوں کے کھنڈرات اس کی تباہی سے پہلے کے دور کے ہیں جب موسم گرما میں سیلاب کی اچانک آمد اس قسم کی تعمیر کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ شیلا کے کناروں کے اضلاع زیرِ کاشت اور آباد تھے اور فاضل سیلابی پانی کوہِ خواجہ کے جنوب میں ہامونِ سیستان میں چلا جاتا تھا اور ایک جھیل اور نئے زار کو وجود میں لے آتا تھا۔

اس بند کا معمار کاکہ قبیلے سے بتایا جاتا ہے لیکن اس کا اپنا نام اور اس کے مربی بادشاہ کا نام محو ہو چکے ہیں۔ بند کے دونو پہلوؤں پر دو قلعہ بند چوکیاں تھیں جن میں مستقل فوج رہتی تھی تاکہ دفاع کر سکے اور متوقع مرمت کی قبل از وقت اطلاع دے سکے۔

قدیم ادب میں بند کا تذکرہ

شرف الدین علی یزدی اور ملفوظات صاحبقران میں ایک ہی بند کا ذکر ہے اور اس میں ایک دلچسپ بات ہے جو روایت کی صداقت پر دال ہے۔ طاق کی تباہی کے بعد تیمور آگے بڑھا اور بلمند پر خیمہ زن ہوا اور بند کی تباہی شروع کرائی گئی۔ حتیٰ کہ اس کا نام و نشان نہ رہا۔ بلمند طاق سے کچھ فاصلے پر تھا اور دارالحکومت کے آس پاس نظر نہیں آتا تھا۔ ثانیاً مکمل تباہی کے لئے پڑاؤ ڈالنا ضروری تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ بند عارضی نوعیت کا نہ تھا۔ گو کسی بھی بند کو تباہ کرنا آسان نہیں ہوتا جو پانی کا وزن اور ریلا برداشت کر سکتا ہو سوائے اس کے کہ دریا خشک ہو۔

اس انتقامی کارروائی نے شمالی ڈیلٹا کے نظام آبپاشی کو ختم کر دیا۔ اس وقت جنوبی ڈیلٹا کا رقبہ ہی زیرِ کاشت ہوگا اور شمالی ڈیلٹا کی آبادی بھی رودِ بیابان کی تقسیم گاہوں کے آس پاس منتقل ہو گئی ہوگی۔ وادیٔ بلمند کا کچھ حصہ قلعہ فتح تک بھی مقامی نہروں سے زیرِ کاشت رکھا گیا ہوگا۔

ملک قطب الدین سمرقند میں ۸۰۷ھ کی فصلِ بہار تک رہا۔ تیمور نے حملۂ چین کا عزم کیا تھا۔ جہاں منگ خاندان کے بانی نے قبلائی خان کے جانشینوں کو تخت و تاج سے محروم کر دیا تھا۔ چنگیز کی

معزز نسل کے نمائندہ کو سہارا دینے اور کافر و غاصب کو لگام دینے کے لئے وسط ایشیائی فوجیں منظم کی گئیں اور سردی کے خاتمہ کے ساتھ ہی شاہی خیمے اُترآر کے پار نصب کر دیئے گئے لیکن کمزور اور جنگ زدہ جسم نے اس عظیم مجاہد کی بہادر رُوح کا ساتھ نہ دیا اور مہم کی رفتار اس کی بیماری کی وجہ سے رُک گئی۔

ملک قطب الدین اُس کی موت کی خبر سُنتے ہی بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور ہرات پہنچا جہاں مرحوم کا بیٹا حکمران تھا۔ شاہ رُخ میرزا نے سیستان کیانی کو واپس کر دیا، لیکن اُسے اپنے محسن کا باجگزار رہنا پڑا۔ ملک نے حکومت سنبھالتے ہی قلعہ فتح تعمیر کروا کر اسے اپنا دارالحکومت بنایا اور ملک کی خوشحالی کی بحالی پر مرکوز ہوگیا۔ واپسی کے تھوڑے عرصہ بعد ہی حاکم بالا نے مطالبہ بڑھا دیا۔ کیونکہ اُسے بھتیجے کو زیر کرنا تھا جو ماوراالنہر میں آزاد ہوگیا تھا۔ اس پر قطب الدین نے بغاوت کر دی۔ شاہرُخ حملہ آور ہُوا، لیکن ملک رُو برُو ہو کر نہ لڑا لہٰذا حملہ بے اثر رہا۔ صُلح کر لی گئی اور شاہرُخ قندھار کی سمت میں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لئے بڑھا[1]۔

دارالحکومت کا قلعہ فتح میں قیام ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہلمند اس وقت شمالی ڈیلٹا میں نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو قطب الدین اس مقصد کے لئے کوئی اور جگہ منتخب کرتا۔ اور پھر اپنے محل کے لئے دریا سے اتنی اونچی جگہ کا انتخاب بھی ضروری نہ تھا۔ سرچشمۂ آبپاشی کی قربت کی وجہ سے ہی ملک قطب الدین نے اپنا دارالحکومت اور محل قلعہ فتح میں بنوایا۔ اگرچہ تیمور نے سیستان کی دُرگت بنا دی تھی۔ تاہم اُس نے ملک کو نیست و نابود ہی نہیں کر دیا تھا اور شاہ شہاں نے اپنے ۱۲ سالہ دَور میں اس کی خوشحالی کو بحال کرنے کے لئے بھی بہت کچھ کیا تھا۔

---

[1] یہ حملہ ۸-۱۴۰۷ء میں ہُوا۔ تین بند رُستم سے منسوب تھے: بندِ رُستاک، بندِ شہر اور بندِ بلغان (ابوالغنی؟) آخری، تینوں میں سے مضبوط ترین (یا عظیم ترین) تھا۔ سب تباہ ہو گئے لیکن دارالحکومت پر قبضہ نہ ہو سکا۔ شاہرخ نے ۲۶ جنوری ۱۴۰۸ء کو سیستان چھوڑ دیا۔

بندِ بُوالبقا

ملک قطب الدین کی واپسی تیسرے بندِ سیستان کا پیش خیمہ بنی - یہ کم کی ایک پٹی پر بنایا گیا جو پُزماشی کے نیچے دریا کے پاٹ سے گزرتی ہے۔ اِس بند کو روایات بندِ بُوالبقا کہتی ہیں۔ اِس کا معمار بھی کاکہ قبیلے کا بتایا جاتا ہے۔ یہ بند کافی حد تک ایک دائمی تعمیر تھا اور احتیاط سے بنایا گیا تھا - پہلے پاٹ پر تمرسس کے کھونٹوں کی ایک قطار رکھی گئی اور پھر اسی کے شاخوں کے چوکھٹے اسطوانوں کی صورت میں ان کے مقابل ایک دُوسرے کو چھُوتے ہوئے رکھے گئے۔ ان کو خرزریزوں اور سنگپاروں سے بھرا گیا جو پاٹ سے ملے گئے۔ تمرسس کی شاخوں اور تنوں کے گٹھے بالائی اسطوانوں میں رکھے گئے اور ان میں کنکر اور سنگپارے دونوں طرف ڈالے گئے۔ یہ بند سیلاب اور پایابی میں کام کرتا رہا اور اِس سے نہریں نکالی گئیں جو قلعہ فتح بلکہ ضلع نشک تک کے علاقہ کو سیراب کرتی تھیں۔

زورکن اور زرکن کی بحالی

یا زورکن اور زرکن بحال کی گئیں اور یا نئی نہریں تعمیر کی گئیں تاکہ رکاوٹ کے مشرق میں غلغلہ کے کھنڈرات تک پانی پہنچایا جاسکے - مارچ ۱۹۰۵ میں غلغلہ اور قلعہ کُردُو کے درمیان کسی کھنڈر سے ایک انتسابی کتبہ کا ٹکڑا ملا - یہ ایک بدروغن ٹائل تھی جس کے حروف نیم عربی اور نیم فارسی رسم الخط میں بدنوشتہ تھے - یہ صرف ایک ٹکڑا تھا لیکن اس پر تاریخ ۸۳۱ھ (۹-۱۴۲۸ء) صاف پڑھی جاتی تھی۔ اِس قسم کے ٹکڑے ایک قبرستان کی چھوٹی سی ڈھیری پر ملے جو ممکن ہے کسی مقبرے کا اثر باقیہ ہو - یہ غیر اغلب ہے کہ کوئی لاش تدفین کے لئے صحرا میں لائی گئی ہو اور مرحوم اسی قبر کے پاس رہتا ہو اور یہ جگہ ایک نہر سے قابلِ رہائش بنائی گئی ہو[۱]۔

چکان سُر کے اردگرد کا علاقہ خاش رود سے سیراب ہوتا تھا اور جنوبی ڈیلٹا کا ضلع اور

---

[۱]. یہ غالباً اُس دارالحکومت کی جگہ تھی جو زاہدان کی تباہی کے بعد تعمیر کیا گیا تھا۔ جسے ریت کے تھپیڑے اُڑا لے گئے تھے اور لوگوں کو اِسے ترک کرنا پڑا۔

قلعہ فتح کے نواحیات میں کاشتکاری زوروں پر تھی۔ شمالی ڈیلٹا میں سنڈ ریگ کے مغرب میں ملک حیدری کے گاؤں یا زاہدان تک کاشت کاری ہوتی تھی۔ لیکن موجودہ ہاموں کی طرف کے علاقے بڑے بنجر اور چٹیل تھے۔

ملک حمزہ خان کے وقت کاشتکاروں کی تعداد

اس سمت میں ملک حمزہ کے دور میں بلندی نہروں کی سیرابی جھگنی کھنڈرات تک ختم ہو جاتی تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس جگہ اور دارالحکومت کے درمیان زراعت اور نہروں اور نالیوں کی حفاظت کے لئے ۲۰۰۰ پگاؤ یا مزدوروں کے ٹولے درکار تھے۔ پوست گاؤ اور خواجہ سُرجُو کی طرف کی زمینوں کے لئے مزید ۱۰۰۰ پگاؤ مطلوب تھے تاکہ خاش رود سے کاشت کاری ہو سکے۔

اگر یہ معلومات صحیح ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدح کے قریب خاش رود سے نکلنے والی نہریں بمشکل ۳۰۰ سال چالو رہیں۔ اِسی لئے ان کے گارے کے کنارے مٹی کی سطح ہے اور کنکروں کے ڈھیر نہیں ہیں۔ ہوکاٹ کو فرح رود سے سیراب کیا جاتا تھا اور اِس طرح ملک حمزہ کو ملنے والا ورثہ قیمتی اور ترقی پذیر تھا۔

حوضدار علاقہ

اُس وقت تراکن رام رود اور حوضدار کے علاقے (جو اب صحرا ہیں) بھی شاداب و آباد تھے۔ رودِ بیابان کا پانی مختلف راستوں سے نکلتا تھا اور ان میں سے ایک پُز سرہ دگال کے جنوب کی گہری کھاڑی میں آتا تھا جہاں اس کے آثار موجود ہیں۔ یہ راستے اُسی وقت پُر آب ہوتے تھے جب سیلاب کا پانی ماشی کے بند سے اُچھلتا تھا۔ سردی کے مہینوں میں پانی کافی گھٹ جاتا تھا اور اسے قابو کرنا آسان ہو جاتا تھا۔ قلعۂ مقصود اور زیارت شاہ مرداں کے اردگرد کا علاقہ بھی شاداب و آباد تھا اور اِس میں آج تک دریا کے انتہائی جنوبی راستے کی آبی نالیوں کے آثار موجود ہیں۔ جب دریا طغیانی پر ہوتا اور فالتو پانی ہاموں اور شیلا میں آجاتا تو شیلا سے گادِ زرہ میں پہنچ جاتا تھا۔ شیلا کے پاٹ میں سرکنڈے بافراط تھے، کیونکہ ۱۸۹۶ء میں بھی

گذر شاہ پر زیارت کے قریب پانی کے گڑھوں میں اُن کے ایک دو لہلہاتے ہوئے جھنڈ تھے۔ گادِ زرہ جو اب شور کی وجہ سے مُضرِ صحت علاقہ ہے اُس وقت بہار و خزاں میں ایک چراگاہ ہوتی تھی، کیونکہ ہاموں کا سیلابی پانی سرکنڈوں اور بنوں گھاس کی آبیاری کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان دنوں میں یہاں ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار پگاؤ تک مغرب کے تراکن اضلاع میں مصروفِ کشت و کشار ہوتے تھے۔ یہ اعداد و شمار بالکل صحیح نہ ہوں تو بھی واحد معلومات کی وجہ سے اتنے قیمتی ہیں کہ نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

ملک حمزہ کی موت سے ایک سال پہلے قلعہ فتح بطورِ فدیہ دے دیا گیا اور ہندوستانی فوج کے ایک دستے نے بندِ بُوالبقا کو تباہ نہیں کیا تو اسے نقصان ضرور پہنچایا۔ یہ دستہ وادیٔ ہلمند میں داخل ہو گیا تھا۔ لیکن روایات کے مطابق قلعہ فتح کا دورِ عروج ۲۳۰ سال تھا اور زوال کوئی ۲۴۰ سال پہلے شروع ہوا۔ یہ مدتیں تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتیں لیکن صرف ۲۶ سال کا فرق رہتا ہے اور تاریخی لحاظ سے عروج و زوال کے دونوں ادوار قریباً برابر تھے اور ۴۹۶ سالوں پر محیط تھے۔ اب اس کا ستارہ گردش میں تھا اور فتح علیخان کے وقت ہلمند نے اپنی گذرگاہ رودِ بیابان سے بدل لی۔ اُس کا دَور ۳-۱۶۹۲ سے ۲-۱۷۲۱ء تک تھا۔ اس تبدیلی کے آثار پہلے ہی ظاہر ہو گئے تھے۔ رودِ بیابان کے چھ سات راستے جو پہلے ہی تنگ تھے گاد سے بھر گئے تھے اور پاٹ اُونچا ہو گیا تھا۔ سابقہ ملوک کے ادوار میں شیلا یا پاٹ باغوں اور قلعہ فتح کے خوشگوار قرب و جوار کے پاس سے گذرتا تھا لیکن کچھ عرصے سے بتدریج سیلابی فاضل پانی کی زد میں آتا جا رہا تھا اور یوں ہلمند کی آمد آمد کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اسی راہگذر سے پانی باہر نکلتا تھا جس کی بدولت ملک حیدر نے زاہدان کے جنوب میں اپنے نام کا گاؤں بسا دیا۔

نوٹ: ایک پگن یا پگاؤ سات آدمیوں کی جماعت یا شراکت ہوتی ہے جو کاشت کاری کے لئے زمین لیتے ہیں اور اُس کے خرچ اور منافع میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر پگو ۷ خاندانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور اگر خاندان کی اوسط نفری ۵ رہی ہو تو پگو ۳۰ افراد کا نمائندہ ہوا، جو ایک معتدل اندازہ ہے۔ جی۔پی۔ٹی

باب ششم

ملک فتح علی کے زمانے میں یہ عظیم تبدیلی واقع ہُوئی۔ روایاتِ ثقہ کے مطابق یہ سال بہت بڑے سیلاب کا موقع تھا۔ ہلمند پُوری شدّ ومدے سے نیچے اترا۔ پانی کا ریلا بند کُرا البقا کو توڑتا پھوڑتا ہُوا دیگر پُشتوں کو بھی خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ رودِ بیابان کے نیم مسدود راستے اِس غضبناک پانی کو کسی دُوسری طرف منتقل نہ کر سکے جو آن کی آن میں شمالی ڈیلٹا کی پرانی گذرگاہ میں گھس آیا۔ دریا دونو کناروں پر پھیل گیا اور چونکہ وادی کے مغرب کی دائیں طرف کا دشت ایک ناقابلِ شکست رکاوٹ تھا لہٰذا سیلاب نے قلعہ فتح کے مضافات کو اپنا نشانہ بنایا اور قصبے کے اندر دندنانے لگا۔ دارالحکومت کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ شمالی ڈیلٹا میں ۱۱ میل اوپر زاہدان کے جنوب مغرب میں ایک جگہ منتخب کی گئی جو رام شاہرستان سے بھی اتنے ہی فاصلہ پر تھی اور نئی گذرگاہ سے کچھ دُور ایک کھلے میدان میں قصبہ کُندارک تعمیر کیا گیا۔

رودِ بیابان کی نہر اور عمارات کا بیان

رودِ بیابان کے فرش پر پائی جانے والی عمارات بھی اسی دور تبدیلی کی ہیں۔ نئی گذرگاہ بہت جلد پرانی پر محیط ہو گئی اور اُن نہروں کی تعمیر ضروری ہو گئی جن کے نشانات پرانے دریا کے پاٹ میں ملتے ہیں۔ اِس کے بعد لوگ اپنی پرانی رہائش گاہیں چھوڑ کر پاٹ کے جنوب میں آ گئے اور نہروں کے کنارے اور اُن کے آس پاس اپنے گھر بسا لیے۔ اسی لیے پُرانے گنا کے کھنڈرات رودِ بیابان کے اُوپر ڈھلوان چبوترے میں پائے جاتے ہیں جو گنبد دار مقبروں میں محصور ہیں اور

سابقہ نسلوں کے مُعزّز خاندانوں کے قبرستان ہیں۔ اِس جگہ کو خیر باد کہہ کر رئیس نے قدیم دریائی پاٹ
پر اپنی رہائش گاہ کے لیے موجودہ قلعہ گیا بنوایا۔ اور کاشت کار بھی اُس زرخیز زمین پر بسنے اور
کاشت کاری کرنے لگے جو واگذار ہوئی تھی۔ وہ سیلاب کے خوف سے محفوظ تھے اور جب تک
مزدور ٹولیاں نہر اور گذرگاہ کو صاف رکھتیں وہ خراب موسم اور قحط سالی سے بھی محفوظ تھے۔
ہلمند کی تبدیلیٔ گذرگاہ لازماً نقلِ آبادی پر منتج ہوئی۔ شمالی ڈیلٹا کی وسیع زمینیں زرعی مزدوروں کو
کھینچ لائیں اور لوگ وادیٔ ہلمند اور قلعہ فتح کے آس پاس کی مختصر زرعی ملکیتیں چھوڑ کر جوق در جوق
یہاں آ گئے۔ مزدور بھی بڑی تعداد میں منتقل ہو گئے۔ تبدیلی نے جنوبی ڈیلٹا کی کاشت کاری بھی ختم
کر دی اور دریا کی متبادل نہرے شیلا اور رود بیابان کے آس پاس کی زمینوں کو پانی کی فراہمی
برائے نام رہ گئی جو حدّت زدہ ہو کر پانی کے لئے ترسنے لگیں۔

رودِ ناصرو

ہلمند شمال کی طرف رودِ ناصرو کے راستے بڑھا جو اب تقریباً فراموش ہو چکی ہے۔ زاہدان
کے مشرق کی پرانی گذرگاہ مرورِ زمان کے ساتھ ریت کے تودوں اور دیگر رکاوٹوں سے بھر گئی تھی
جو دریا کے وارفتہ دھارے کے کام کی نہ تھی۔ لیکن دریا نے ڈیلٹا میں ہی ایک چھوٹی سی ساحلی
جھیل بنا دی جو پانچ چھ میل لمبی اور قریباً دو میل چوڑی تھی۔ یہ حصّہ اب بھی گرمی میں نہروں کے فالتو
پانی سے زیرِ سیلاب آتا ہے اور روایت ہے کہ کیانیوں کے وقت یہ ایک نئے زار تھا۔ اِس نشیب
کے عین جنوب میں ملک حیدری کا گاؤں اور شمالی سِرے پر جلائی کا گاؤں ہے۔ رودِ ناصرو اِسی
سے نکلتا ہے اور زاہدان کی اونچی زمین کے پاس سے ہوتا ہُوا کوہ ملک ڈھیری کے جنوب میں
موجودہ ہاموں میں پہنچتا ہے۔

جب دریا شمالی ڈیلٹا میں جم گیا تو دوسری شاخ بھی نکلی۔ یہ بھی اسی نشیب سے برآمد ہوئی جس
سے رودِ ناصرو ہُوا تھا لیکن موخرالذکر کا رُخ شمال مغرب کو تھا اور دُوسری شاخ کا مغرب کو۔ یوں
یہ نشیب ڈیلٹا کا ذخیرۂ آب بن گیا اور دونوں شاخوں کے درمیان موجودہ میاں کنگی جتنا علاقہ گھر گیا۔

اِس علاقہ میں اب تیسری گذرگاہ کی نشاندہی بھی ہوسکتی ہے جو مذکورہ شاخوں کے بیچ میں تھی اور جلائی سے ایک میل مشرق اور دو میل جنوب سے ہوکر بنجار گاؤں کے مغرب سے ہوتی ہوئی نصیرآباد کے موجودہ گاؤں کے پاس ہاموں میں پہنچتی تھی۔ یہ درمیانی گذرگاہ ہلمند کی پرانی جنوبی شاخ سے قریب ہے۔ بہ نسبت رود ناصرو اور یہ ہاموں کے ایک پست بازو میں سے گذرتی ہے جو الہ آباد میان شیلا کے قصبے کے کھنڈرات کے عین شمال میں ہے۔ دیہات جلائی اور ملک حیدری کے درمیان نشیب کے اردگرد منڈیروں کی قطاریں تھیں اور گو یہ کسی حد تک آبی عمل سے تباہ ہوچکی ہیں تاہم کہیں کہیں ان کے زود میں نشانات موجود ہیں۔ یہ ہلمند کے سیلابی پانی کو نشیب سے اُچھل کر اردگرد کے علاقے کو محفوظ رکھنے کے لئے ضروری تھیں۔ اسی طرح نشیب سے نکلنے والی جنوبی گذرگاہ پر بھی ایسی ہی منڈیروں کے آثار ہیں۔ یہ صرف زیرِ کاشت زمینوں کو ہی نہیں بلکہ قریب ہی دارالحکومت کنڈارک کے لئے بھی حفاظتی بند کا کام کرتی تھیں۔ دریا کا رُخ لازماً مغرب یا ڈیلٹا کے جنوب کی طرف تھا۔ لہٰذا ان منڈیروں یا بندوں کا بنانا ضروری تھا اور قصبہ کنڈارک کی تعمیر کے فوراً ہی بعد ان کی ضرورت کا احساس ہوگیا ہوگا۔

قلعہ فتح کا حشر ہر سیستانی دارالحکومت کے لئے کابوس بنا رہا۔ بنائے کے اپنی پستی کی وجہ سے ہمیشہ معرضِ ہلاکت میں تھا اور عمرو بن لیث کے بعد کے انتشار و خلفشار کے دوران شہر نے دریا کی دستبرد سے کافی نقصان اٹھایا۔

کنڈارک

کنڈارک ملک فتح علی خان کی موت کے ایک قرن بعد تک دارالحکومت رہا اور لوگوں اور دریا کے درمیان جان کی بازی لگی رہی۔ مذکورہ حفاظتی بندات اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں جب دریا شہر کو زد میں لینے کی کوشش میں تھا۔

موجودہ قلعہ نصیرآباد کی تعمیر

ملک محمد نصیر خان کے وقت کنڈارک اور اللہ آباد میانِ شیلا کو سیلابوں نے تباہ کر دیا تو

گاؤں حسین آباد کے بالکل پاس موجودہ قلعہ نصیر آباد تعمیر کیا گیا - اسے قلعہ بند بھی کیا گیا - لیکن اس کی دیواریں اب قریباً گر چکی ہیں۔ ہلمند رود ناصرو سے انتہائی جنوبی ڈیلٹا تک پہنچنے کے لئے زمین پر پھیل جاتا تھا - لہٰذا نصیر آباد کو بلندی پر بنا کر اسے سیلابوں سے محفوظ رکھا گیا - یہ غالباً ۱۱۹۶ھ اور ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ - ۱۷۸۲ء) کے درمیان بنایا گیا - جب ہلمند اپنی انتہائی جنوبی حد تک پہنچ گیا تھا جہاں دشت ایک ناقابل عبور رکاوٹ بن کر حائل تھا - نئے دارالحکومت کے مغرب کی طرف سخت اور چوڑی مٹی کی ایک کُرگ یا سطح مُرتفع ہاموں کی طرف سے پانی کو روک لیتی تھی - انہی حالات کی وجہ سے نصیر خان کیانی نے موجودہ دارالحکومت بنایا جس کا محل و قوع بھی آج کل تو مثالی نہیں کہا جا سکتا - لیکن اس کی تعمیر کے وقت دریا کافی دُور تھا اور اس کے دُور رہنے اور شہر کے بچنے کے معقول امکانات تھے - یہ بھی برسبیل تذکرہ لکھتا چلوں کہ صدر مقام کا نام نصیر آباد ہے نصرت آباد نہیں۔

بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں ہلمند شمالی اور جنوبی ڈیلٹا کے درمیانی دشت کے اگلے حصّے میں بہہ رہا تھا اور یہ کافی عرصہ یہیں ٹِکا رہا - حتیٰ کہ ایک دفعہ پھر مشرق کی طرف مُڑنے کا وقت آ گیا - سیاسی حالات ایسے تھے کہ اس تبدیلی کا کوئی تدارک نہ کر سکتے تھے - لہٰذا تیرھویں صدی ہجری میں اس تبدیلی کے متعلق ملنے والی معلومات نہایت محدود اور مشکوک ہیں - موجود انسانی زندگی کے دوران جو گذرگاہی تبدیلیاں ہوئی ہیں - اُن کی تفصیلات موجودہ انسانوں کو یاد نہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضلع کے باشندوں کی توجہ اپنے اُوپر مرتکز نہ کرا سکیں۔

اس کی کئی وجوہات تھیں - بدانتظامی اور ابتری اتنی تھی کہ بدقسمت لوگ سیلاب کے ریلوں سے تباہ ہونا اور اُن سرداروں کے گماشتوں سے تباہ ہونا ایک ہی جیسا سمجھنے لگے تھے جو کیانیوں کے ورثے پر باہم دست و گریباں تھے - دونوں کا نتیجہ ایک ہی تھا - سوائے چند دیہات کے جہاں سادات طاقت ور تھے اور زمینوں کے مالک تھے اور جہاں جان و مال محفوظ تھے جو کسی وقت حکومت کا امتیازی نشان تھا، باقی ہر جگہ مخدوش تھی - اپنے عزیز و اقارب کو ہلمند کے گرداب ہائے بلا کی نذر ہوتے دیکھنا یا ابراہیم خان سنجرانی کے گماشتوں اور سربندی اور ناہروئی سرداروں کے کارندوں کا نشانہ

سسٹم بنا ایک ہی جیسا تھا۔ لہٰذا دریا بے تحاشہ اور بلا مزاحمت آگے بڑھتا رہا اور انسانی مشاہدے کی قوتیں دیگر واقعات پر ہی مرکوز رہیں۔

لیکن ملک بہرام خان کی زندگی تک نظم و نسق کا بھرم قائم رہا۔ اپنے خاندان کا یہ آخری با اختیار ملک کافی انتظامی اہلیت و قابلیت کا مالک تھا۔ اُس نے تخت نشین ہوتے ہی سیستان کی خوشحالی بحال کرنے کی پوری کوشش کی اور چونکہ سدّوزئی حاکمانِ بالا اپنے اقتدار میں مست تھے لہٰذا وہ اپنا سکہ جمانے میں کامیاب بھی ہوا اور وہ یقیناً ملک کو خوشحال کر دیتا اگر وہ متصادم عناصر کو دبا لیتا جو ملک بھر میں سر اٹھا رہے تھے لیکن اُسے کوئی خاندانی پشت پناہی نصیب نہ ہوئی۔ نادر کے سفاک ہاتھوں نے کیانی نسل کی جو قطع و برید کی اُس نے اُس کے جوہر کو ہی تلف کر دیا اور نونہالانِ خاندان قوت و ہمت سے عاری ہو گئے۔ لہٰذا ملک بہرام کا دار و مدار حاکمِ بالا کی مدد پر ہی رہا جو سدّوزئیوں اور اُن کے سرداروں کے درمیان روز افزوں اختلافات کی وجہ سے پہلے جزوی اور غیر مسلسل رہی اور پھر ختم ہی ہو گئی۔

ملک بہرام خان اور آب پاشی

بہرام خان کے دور کا آغاز بہت خوش آئند تھا۔ شجرۃ الملوک کے مطابق اُس کے تین کارنامے اہم تھے۔ ایک تو رودِ بیاباں میں نہر کی بحالی تھی۔ دوسرے اُس نے نہرِ حُسینکی کو بھی ازسرِنو رواں دواں کیا۔ اُس نے دو شاخہ نہر بھی بنوائی، جس کی دو شاخیں تھیں۔ ایک جو ٹے علمدار شمال کی طرف اور دوسری شمال مغرب کی طرف بہتی تھی۔ پہلی زیارت خواجہ رباط اور گرگی کی ڈھیرلوں کی زمینوں کو سیراب کرتی تھی اور دوسری جلال آباد اور کوہلک ڈھیری کے علاقوں کی آبیاری کرتی تھی۔ ایک زمانے میں یہ زمینیں ملک کے قبضے میں تھیں اور بہت شاداب تھیں۔ نہرِ حُسینکی حمزہ آباد (کاچیان) اور بُنجار کو سیراب کرتی تھیں۔ حمزہ آباد کی زمینیں اُس کے چھوٹے بیٹے حمزہ کی ملکیت تھیں۔ بُنجار کو میروں اور مُلّا خسرو کے خاندان میں برابر برابر تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مُلّا خسرو نے اُس مذہبی ادارے کی بنیاد ڈالی جہاں عابد و زاہد ملک تاج الدین اوّل

نے میل (عیار) قاسم آباد تعمیر کروایا۔

ترا کن دھارے کی نہر

رود بیابان کی نہر مرمت طلب ہو چکی تھی اور ملک بہرام نے اسے دوبارہ چالو کیا لیکن اس کا وجود ایک مستحکم حکومت پر منحصر تھا جو اس کے سرچشمہ کو افغانوں سے بچا سکے جو شارکی اور ارباب آبادی کو ڈیلٹا کی طرف دھکیل رہے تھے اور وادئ ہلمند پر اپنی گرفت بڑھا رہے تھے۔ اس کی روانی اس بند پر منحصر تھی جو کچھ فاصلے پر وادی میں بنایا گیا تھا اور یہ رامرود اور حوضدار کے اضلاع کو پانی مہیا کرتی تھی۔ شجرۃ الملوک کے مصنف نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے، جب وہ بتاتا ہے کہ دو دنوں کی مسافت کے برابر زمین کا قطعہ خوب اور دوبارہ سرسبز و شاداب بنا دیا گیا تھا۔

چھوٹی چھوٹی نالیاں گنا اور بزی کے اضلاع کو سیراب کرتی تھیں اور رود بیابان کے مختلف تنگ راستوں کے فرش کی زرخیز زمین بھی انہی کی بدولت زیر کاشت تھی۔ رامرود اور حوضدار کو سیراب کرنے والی دو نہریں ایک نمایاں مقبرے سے دو میل مشرق میں ایک دوسرے سے جدا ہوتی تھیں جو رود بیابان کے پرانے راستوں سے محصور ایک جزیرۂ دشت پر ایستادہ تھا۔ یہ مقبرہ یک گنبد کہلاتا ہے۔ دونو نہریں ایک بند پر جدا ہوتی تھیں جو ہلمند کی پہلی تبدیلئ گذرگاہ پر بنایا گیا تھا اور جو اُن کے لئے ذخیرۂ آب کا کام کرتا تھا۔ اس بند کی موجودگی کا پتہ اتفاقیہ چلا۔ وہاں پرانی گذرگاہ قریباً ۵۵ فٹ چوڑی ہے اور وہاں کم کی ایک پٹی بھی ہے جس پر یہ تعمیر ہو سکتا تھا یہ تیس فٹ لمبا اور پانچ چھ فٹ چوڑا تھا۔ دو قسم کی اینٹیں استعمال کی گئیں - ۱۲ انچ مربع اور ۱۲ × ۶ انچ، لیکن دونو کی موٹائی قریباً دو انچ تھی۔ بند کو دو فٹ گہرائی تک ننگا رکھا گیا تاکہ اس کا معائنہ ہو سکے ورنہ تو یہ باد آوردہ ریت اور جھاڑیوں سے ہی چھپ گیا ہوتا۔ اینٹیں بہترین قسم کی سروج سے بنائی گئیں اور ان کو سنبھالنے والی تہیں بھی بے حد مضبوط تھیں۔ بند کے سوراخ بھی سروج سے پلستر کئے گئے اور نشیب میں فرش بھی بنائے گئے۔ دائیں اور بائیں سے نہریں نکلتی تھیں۔ دائیں نہر کوئی ۱۵ فٹ چوڑی اور بائیں قریباً ۱۰ فٹ چوڑی تھی اور یہ دونو

رامرود اور حوضدار کی آب رسان تھیں۔ نہر رامرود کے گارے کے کناروں پر آج بھی کھردری درگ گھاس کی جڑیں موجود ہیں جو اِن پر خوب جڑی ہوئی تھی کیونکہ اِدھر کی زمین نرم ہے اور دُوسرے کنارے کی سخت ہے۔ لہٰذا گھاس کے آثار بھی نہیں ہیں۔ دائیں نہر کے سرچشمہ سے قریباً ۱۵ فٹ دُور کنارے چوڑے ہو جاتے ہیں۔ اور پرانی گذرگاہ کی طرف کا کنارہ اینٹوں کا بنا ہوا ہے یہیں ایک تقسیم گاہ بھی تھی جو اصلی نہر کے متوازی بہتی تھی اور مقامی کاشت کاری کے لیے کام دیتی تھی جو یک گنبد کے شمال میں کی جاتی تھی۔ نہر حوضدار کے آثار آج بھی واضح ہیں کیونکہ یہ مضبوط زمینوں سے گذرتی تھی۔ یہ حوضدار کے مشرق کی ماشی زمینوں اور گندار اور شہرِ رُستم (یا زِ زنگار) کی زمینوں کو سیراب کرتی تھی۔

نہر رامرود رودِ بیابان کے ایک بڑالی نامی راستے سے بہتی تھی اور اِس کا پانی پرانے دریا کے تمام آس پاس کے راستوں سے بہتا تھا۔

اِن نہروں کے محدُود حجم اور عملِ تبخیر کی وجہ سے اِن کا پانی زیادہ اور مسلسل نہ تھا۔ لہٰذا لوگوں کو کنوؤں پر اِنحصار کرنا پڑتا تھا۔ رقبہ زیرِ کاشت بھی زیادہ وسیع نہ تھا۔ لیکن جنوبی ڈیلٹا کے بعض حِصّوں کو شاداب رکھنے کے لیے ملک بہرام خان کی یہ ایک گرانقدر کوشش تھی ان کے اثرات دائمی نہ تھے اور پہلے رامرود اور پھر شمالی ضلعے خشک ہو گئے اور چھوڑ دیئے گئے۔ گو حوضدار اور ماشی سربندی سردار کے تحت کچھ سرسبز و شاداب رہے۔

نہر دوشاخہ

ملک بہرام کا دوسرا کارنامہ نہرِ دوشاخ یا دہ شاخ بھی ناپید ہوگیا۔ جوئے علمدار کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ یہ مینار علمدار کی زمینوں کو سیراب کرتی تھی جو موجودہ افغان علاقے میں گاؤں جان محمد کے پاس واقع تھا۔

اٹھارھویں صدی میں دریا کے پاٹ

بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی کا ربع آخر) کے شروع میں ہلمند اپنے عظیم ترین

جنوبی جھکاؤ پر آگیا تھا جہاں یہ کئی سال تک رہا۔ یہ بُرجِ سربند کے گاؤں کے پاس جنوب کی طرف مُڑا اور بَل کھا کھا کر قلعۂ نو کے مشرق میں پہنچنے لگا جہاں اِس کا پاٹ اب بھی واضح ہے یہ دشت کی چٹانوں سے گذرتا ہُوا دَشتک کے گاؤں سے مڑتا تھا۔ یہاں سے دو میل کے فاصلے پر یہ مغرب کو چلا جاتا تھا۔ اِس کے بڑے دھارے کا پانی کوہِ خواجہ کے عین جنوب میں شیلائے کافری کے ذریعے ہاموں میں پھیل جاتا تھا۔ اُس وقت علی آباد کی زمینیں زیادہ تر زیرِ آب رہتی تھیں۔ ڈیلٹا کا سرچشمہ محمد آباد کے موجودہ گاؤں سے دُور نہیں تھا۔ یہاں سے ایک شاخ جنوب مغرب کو جاتی تھی اور قدیم قلعۂ سام کے پاس سے گذر کر ورمال گاؤں کے قریب ہاموں میں گر جاتی تھی ایک اور شاخ شمال مغرب سے ہو کر افضل آباد کے پاس ہاموں میں گرتی تھی۔ اِن دونوں کا درمیانی علاقہ کم و بیش ایک نے زار تھا اور صیاد اِن زمینوں پر اپنی کشتیاں چلاتے تھے اور ماہی گیری کرتے تھے جہاں اب رَستے بستے گاؤں ہیں۔

قلعۂ کہنہ اور قلعۂ نو کے دیہات کے اِردگرد کی زمین جو اَب ایک ننگا یا ریتلا میدان ہے اُس وقت تمرسک سے بھری پڑی تھی جن کے درخت اِتنے موٹے تھے کہ بعض زندہ اصحاب کے بموجب بمشکل اِنسان اُنہیں اپنے دونوں بازوؤں میں لے سکتا تھا۔ نہرِ حُسینکی پُرانے گاؤں کَوَد سے نکلتی تھی اور نہرِ دُوشاخ کا منبع کلوخی گاؤں کے پاس تھا۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے شروع میں گاؤں برج سربند[1] بسایا گیا تا کہ نصف میل دُور بند کی حفاظت کی جا سکے جہاں سے یہ نہریں نکلتی تھیں۔

کیپٹن کرسٹی ۱۸۱۰ء

اپریل ۱۸۱۰ء میں کیپٹن کرسٹی ایران جاتے ہوئے سیستان آیا۔ اُسے اور اس کے ساتھی لیفٹننٹ پوٹنگر کو خان قلات کی ریاست اور ایران کے درمیانی علاقوں کی چھان بین پر مامور کیا

۱۔ بُرجِ سربند: مینار بند۔ یہاں شرکی آباد ہیں جو کاشت کار ہیں۔

گیا تھا۔ وہ نوشکی میں ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہوئے۔ اوّل الذکر ملند کو گیا اور ۱۰ منزلیں طے کرکے وادیٔ رودبار پہنچا۔ دریا طغیانی پر تھا اور اسے پار کرنے کی دو کوششیں ناکام ہوگئیں تیسری دفعہ وہ رودبار کے قریب اسے پار کرگیا اور دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ سیستان آیا۔ وہ بالآخر علمدار (جلال آباد سے ۱۰ میل) آیا۔ جہاں وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور ملک بہرام خان سے ملنے کے لئے جلال آباد روانہ ہوا۔ کرسٹی ایک جگہ پلگی (جو یقیناً پلنگی تھی) کے مقام پر دریا کو بہم گز چوڑا اور بہت گہرا بتاتا ہے۔ اس کے مطابق "پلگی ایک کھنڈرات کا شہر ہے" اور یہ یقیناً پلنگی کے آس پاس کے کھنڈرات تھے جو وہ بیان کرتا ہے۔ کرسٹی کا علمدار یہاں سے ۲۲ میل اور جلال آباد سے ۱۰ میل تھا۔ ان فاصلوں کی بنیاد پر یہ جہان آباد تھا نہ کہ برج علمدار، کیونکہ یہ ان جگہوں سے بہت دُور ہے۔ اور یہ جگہیں اب بھی موجود ہیں اور ان کا محلِ وقوع شک و شبہ سے بالا ہے۔

جوئے علمدار جہان آباد کے پاس سے گذرتی تھی اور کرسٹی کا سفر اسی کے کناروں پر تھا جو اس قصبے کے قریب تھی اور اسی لئے وہ نہر کے نام کو ایک میل دُور قصبے سے گڈمڈ کرگیا۔

اسی طرح اُس نے جلال آباد سے کیا جو شجرۃ الملوک کے مطابق نہر دو شاخ سے سیراب ہوتا تھا۔ لیکن کرسٹی نے یہ نام شہر کے قریبی اور نمایاں کھنڈرات کو دے دیا۔

کرسٹی کا سفر نامہ کنیئر کی کتاب "جیوگرافیکل میموائر آف دی پرشین ایمپائر" میں بھی مندرج ہے اور سر ناموں کے تعارف میں مؤلف نے سیستان کو ۱/۲ ۴ صفحے دیئے ہیں۔ اس تذکرہ کے صفحہ ۱۹۲ پر لکھا ہے" دوشاخ کا قرب وجوار کشادہ علاقہ ہے، سیراب و شاداب ہے اور اتنی گندم اور جَو پیدا کرتا ہے کہ ہرات کو برآمد کیا جاتا ہے۔ چارہ بھی وافر اور خوب ہے۔" یہ جلال آباد کی زمینوں کی موجودہ حالت سے بہت مختلف ہے۔ اس قصبہ کو ایک قدیم شہر کے کھنڈرات میں واقع بتایا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ چھوٹا لیکن گنجان آباد اور کھنڈرات میں محصور ہے۔ آبادی بہت، بازار اچھا اور لوگ ایرانی طرز میں ملبوس اور دیگر" پٹھان اور بلوچی چرواہوں جو خانہ بدوشی کی زندگی

گذارتے ہیں اور پرانے مقامات کے کھنڈرات میں خیمہ زن رہتے ہیں" سے زیادہ شائستہ ہیں۔

دو شاخ سے کرسٹی جوین گیا اور چند الفاظ لکھ کر ہی ٹال گیا۔ وہ اکبر اور دولت آباد کے دیہات سے گذرا۔ پھر ایک ننگے سخت صحرا" کے اوپر سے پیشاوران (کھنڈر) سے ہو کر جوین گیا۔ ننگا سخت صحرا یقیناً ہاموں کا خشک فرش تھا اور یہ کئی سالوں سے خشک پڑا ہوگا کیونکہ سرکنڈے ختم ہو چکے تھے۔ اکبر غالباً عارضی جھونپڑیوں کا کوئی جھرمٹ تھا جو محو ہو چکا ہے البتہ دولت آباد کی جگہ موجود ہے۔ سفید مٹی کی ایک ڈھیری "پٹہ دولت آباد" اس کا پتہ دیتی ہے۔ اس پر ایک بوسیدہ عمارت میں کیانی خاندان کے کچھ افراد رہتے ہیں اور اردگرد چھپروں میں کاشت کار رہتے ہیں۔ جلال آباد اب بھی موجود ہے اور اس میں کاخ بلند آج بھی نشان امتیاز ہے جو ملک بہرام نے اپنے بڑے بیٹے کے لئے بنوایا تھا۔ یہ دور سے بہت پرشکوہ معلوم ہوتا ہے اور قریب آکر اس کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ ایک موجودہ عمارت ہے جو بدنما انداز میں بنائی گئی ہے۔ محل اور چھوٹا سا قصبہ کوئی دس سال سے بے آباد پڑے ہیں اور سیلابوں نے اردگرد کی زمین کو تباہ کر دیا ہے اور شہر کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ باغات کے آثار موجود ہیں اور کسی وقت جلال آباد پھلوں کے لیے مشہور تھا۔ سیلابوں نے انگوروں کی بیلیں ختم کر دی ہیں۔ اکا دکا انار کے درخت ہیں۔ چند شہتوت کے درخت ہیں جو ثمردار ہیں اور جن کے تنے پانی کی گہرائی کا پیمانہ ہیں۔ جلال آباد کے اردگرد کی زمینوں کی سابقہ بھرپور کاشت کے آثار موجود ہیں پرانی گذرگاہیں اور بند اس کے نشانات ہیں۔ لیکن اب یہاں صرف کانٹے، جھاڑیاں اور تمرس ہیں جو چھائے ہوئے ہیں۔

۱۸۷۲ء میں جب سر فریڈرک گولڈسمٹ کا مشن سیستان سے گذرا تو حالات تقریباً وہی تھے جو کرسٹی کے سفرنامے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ہاموں بالکل خشک تھی اور یہی حال جلال آباد کے شمالی اور پٹہ کوہک کے اردگرد کے علاقہ کا تھا۔ اکتوبر ۱۹۰۳ء میں اس ڈھیری تک پہنچنے کے لئے تقریباً ، میل دلدل سے گذرنا پڑا اور جلال آباد کی زیرِ کاشت زمینیں اب سیستانی

مکھی اور دیگر بے شمار حشرات کی پرورش گاہیں بنی ہوئی ہیں۔

اِس قابلِ معافی غلطی کی وجہ سے 'دوشاک' کو سیستان کا پُرانا دارالحکومت سمجھ لیا گیا ہے اور تاریخ وجغرافیہ ملک پر تمام مقالات میں ایسا ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ دوشاک یا داشاک کا نام شجرۃ الملوک کے تکملہ میں آیا ہے اور یہ جلال آباد کو سیراب کرنے والی نہر کے لئے استعمال ہُوا ہے اور آج کل بھی اِسی مفہوم میں آتا ہے۔ ملک بہرام نے اپنے بڑے بیٹے جلال الدین خان کی وجہ سے شہر کو یہ نام دیا۔ ملک بہرام اُس وقت حاکم سیستان بنا تھا جب انقلاب فرانس عروج پر تھا اور کیپٹن کرسٹی کی آمد پر وہ پندرہ سال سے زیادہ حکومت کر چکا تھا اور بوڑھا ہو چکا ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنے بڑے بھائی اور اُس کے نابالغ بیٹے کی مَوت کے بعد برسرِ اقتدار آیا تھا۔ اور اس کے بعد بھی اس کی ماں کو حاکم سیستان بنادیا تھا اور خود نائب بننے پر ہی قناعت کرلی تھی۔ وہ شاہِ مشہد ملک محمود خان کیانی کی بڑی بیٹی تھی۔ اور اِسی وجہ سے ملک بہرام نے اِس بُردباری اور ایثار کا ثبوت دیا جو ایک ایشیائی شاہی خاندان میں کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

ملک بہرام خان کے وقت سیستان کا مالیہ

کینئر نے اپنی توزک میں صفحہ ۱۹۲ پر لکھا ہے کہ ملک بہرام خان کا مالیہ "۸۰,۰۰۰ روپے سے زیادہ" نہ تھا۔ بین الواوین اُسی کے الفاظ ہیں اور وہ مزید کہتا ہے کہ ملک کے پاس ۳,۰۰۰ جنگ آزما تھے۔ روپے سے مُراد آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کا روپیہ ہے جس کی قیمت موجودہ سے دوگنی تھی گویا سیستان کا مالیہ قریباً ۱,۷۰,۰۰۰ روپے یا موجودہ ایرانی سکّہ کے مطابق ۶۸,۰۰۰ تومان تھا۔ اِس کا مطلب ہے کہ سنجرانی اور سربندی سرداروں کے تحت گروہ بندی کے باوجود ملک بہرام نے سیستان پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا اور روایات اِس پر صاد ہیں۔

کرسٹی کے وقت دریا کا محلِ وقوع

ہلمند کو 'ٹنگی' کے پاس بتانے کے بعد صرف ایک دفعہ اور کرسٹی نے اس کا ذکر کیا ہے دریا بجائے خود جلال آباد سے کچھ فاصلے پر تھا لیکن رودِ ناصر میں ہلمند کی طغیانی کا پانی آتا تھا۔

کرسٹی اپنی گذرگاہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جب وہ دریا کو شہر سے آٹھ میل دور بتاتا ہے اور شہر اور نہرِ علمدار پر اپنے خیمہ کے درمیان اِسے عبور کرنے کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کا بتایا ہُوا فاصلہ رودِ ناصرو پر مین منطبق ہوتا ہے۔ اب بھی اس کے کناروں پر ایسے لوگ موجود ہیں جو غلّہ اور تربوز اگاتے ہیں اور کرسٹی کی آمد اور ملک بہرام کی موت کے بہت بعد بھی اس میں کچھ فالتو پانی آنے کی تصدیق کرتے ہیں۔ علی آباد کے شمال اور مغرب میں اس کے آثار بوجہ حفاظتی بندات موجود ہیں۔ اس کے اِردگرد کی زمینوں کو دوبارہ زیرِ کاشت لایا گیا تھا اور برُجِ سربند کے جنوب میں اب بھی وہ ٹوٹا پھوٹا بند ہے جو پانی کو روکتا اور علی آباد کی زمینوں کو سیلاب سے بچاتا تھا۔

اسی قسم کے دیگر کارناموں نے دریا کو اپنے پرانے پاٹ میں مقیّد رکھا۔ اسی لئے میر عالم خان نے اِن زمینوں کو محفوظ پاکر قبضہ کیا تھا۔ خوابگاہ اور برج سربند کے درمیان بھی ایسی ہی رکاوٹیں تھیں، اس لئے گاد صرف ایک محدود علاقے پر پھیلی اور وہ ڈیلٹا بنا جس پر چلنگ، دولت آباد اور دیگر کئی قصبات و دیہات بسائے گئے۔

۱۸۳۰ء کی دریائی تبدیلی

ہوتے ہوتے بندات کی وجہ سے مقیّد دریا اور سیلابوں نے بند کے ایک کمزور حصّے سے راستہ بنایا اور ہامون تک ایک نئی راہگذر نکال لی۔ تنولی کے مطابق یہ تبدیلی ۱۸۳۰ء میں ہوئی۔ یہ پتہ نہیں کہ مزید درمیانی تبدیلیاں ہوئیں یا نہیں۔ روایات اور بوڑھوں کی کہانیاں سب کشت و خون کے باسی قصّے ہیں اور بہت مشکل سے ہی انہیں حزبِ مخالف کے ہاتھوں کشتگان کی لمبی فہرست بیان کرنے ... ہے۔ اس وقت سربندی اور سنجرانی سرداروں نے اپنی اپنی جگہ اپنے ذاتی اغراض کو چھپا کر ملک کے ایک ایک بیٹے کے دعاۃ کا روپ دھار لیا تھا۔ اس سازش اور قتل و غارت کے بھنور میں دریا ذہنوں سے اُتر گیا اور صرف اسی وقت جالبِ توجّہ ہُوا جب اس پر یا اس کی کسی پرانی گذرگاہ پر تشدّد کا مظاہرہ ہُوا اور یوں اتفاقیہ سیستانی آبیات پر مدّھم سی روشنی پڑ گئی۔ تنولی کو ۱۸۳۹ء میں معلوم ہُوا کہ تقریباً نو سال پہلے

ایک خلافِ معمول بڑے سیلاب نے ملک کا نقشہ ہی بدل دیا - ہلمند کا بڑا دھارا پرانا پاٹ چھوڑ آیا اور اس چھوٹی سی شاخ میں پھیل کر بہنے لگا جو خواجہ احمد سے دک تر تک جاتی تھی"۔ تنزلی کا مذکورہ خواجہ احمد مشہور و معروف جگہ ہے ۔ یہ کسی پرانی عمارت کے ملبہ کی ڈھیری ہے جو شاید ایک قلعہ بند محل یا ڈیوڑھی تھا جو قلعہ کوہک سے دو میل شمال میں واقع ہے اور جس پر بنیاد خان بلوچ نے حالیہ دور میں ایک عمارت بنوائی تھی جو قریباً ناپید ہو چکی ہے ۔ ہلمند کی مذکورہ چھوٹی شاخ غالباً وہ نشیب تھی جس میں افغانی سیستان کی نہر جھرو کی واقع ہے جس میں نہر سلطانی اور دریا کا فالتو سیلابی پانی بھی آتا ہے ۔ یہ پرانا پاٹ اپنے نشیبی حصہ میں دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے جو آشکن میں گرتی ہیں - دایئں یا مشرقی موجودہ گاؤں پینر کے مشرق میں کوئی دو تین میل دور ہے اور بایئں دوالک گاؤں کے عین مغرب میں ہے ۔ اس علاقے کے آخری آٹھ یا دس میل غالباً سینارود کی شیلا ہیں جو سیستان کی داستان ہائے باستان میں امتیازی طور پر مذکور رہے ۔

نادعلی سے آگے جو پانی اسے ملتا ہے وہ بڑی بڑی ساحلی جھیلیں بناتا ہے اور اس نشیب کی رہگذر پر تمرسں کا اداس جھاڑی بن ہے جو اس کے اردگرد اور تنگ لمبی پٹیوں پر بھی چھائی ہوئی ہیں ۔ تاریخ سیستان میں اس دریا نے ایک دفعہ بہت اہم کردار ادا کیا جب سدوزئی شاہ کامران نے ہرات سے اس پر حملہ کیا گو اس کا خاندان کابل بدر ہو چکا تھا ۔ اس وقت دریا موجودہ دیہہ کریم داد کی جگہ پر بہتا تھا اور اس کا عام رخ شمال مشرق کی طرف تھا اور ایک اونچی ڈھیری دریا کے اوپر آگے کو بڑھی ہوئی تھی ۔ ۱۸۳۵ء کے قریب ملک جلال الدین کو اس کی رعایا نے سیستان بدر کر دیا ۔ وہ ہرات چلا گیا اور شاہ کامران کو اپنی بحالی کے لئے سیستان پر حملہ پر آمادہ کر لیا ۔ حملہ آور فوج کا سن کر سیستان کے مخالف گروہ متحد ہو گئے اور مشترکہ فوج لا کر اس دریا کے کنارے پر جم گئے ۔ شاہ کامران کی فوجوں نے دیکھا کہ دریا بہت چوڑا تھا اور سیستانی مقابل کنارے پر مجتمع تھے ۔ لہٰذا دریا کو عبور کرنا مشکل تھا ۔ شاہ نے اپنی سپاہ کو دریا پر روک دیا اور ڈیرے ڈال دیئے ۔ خیمہ کے اردگرد تعمیرات کی گئیں ۔ ایک نئی ڈھیری کھڑی کی گئی یا پرانی سے

فائدہ اٹھایا گیا اور اُس پر کامران کے لیے نشست رکھ دیا گیا۔ یہ ڈھیری اب بھی موجود ہے اور دک شاہ یا شاہ کی ڈھیری کہلاتی ہے۔ اُس وقت دریا اُتر رہا تھا اور گو بہت عریض تھا اور دشوار گذار معلوم ہوتا تھا تاہم یہ قابلِ عبور تھا۔ لیکن افغان یہ نہ سمجھ سکے اور نہ ہی اُس کے پتن دریافت کر سکے۔ کچھ عرصے تک فوجیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑی رہیں۔ حتیٰ کہ شارک کے معتبر غلام شاہ کے نوجوان بیٹے اصغر نے ظاہر کر دیا کہ دریا قابلِ گذر تھا۔ اُس نے اس "مذبذب" سے تنگ آ کر اپنے ہی جیسے چند جذباتی رفقاء کے ساتھ افغانوں پر حملہ کا تہیہ کر لیا۔ اُس نے دریا عبور کیا اور افغانوں پر ٹوٹ پڑا لیکن حملہ ناکام رہا۔ اس لیے کہ کمک نہ ملی اور حملہ آوروں نے یہ دیکھ کر کہ دریا محض رکاوٹ کا فریب تھا فوراً اسے عبور کیا اور سیستانی آدمیوں کو بھگا دیا۔

اس موقع پر دریا کے تاریخی کردار نے اسے جزوِ تاریخ بنا دیا اور اس کا محل وقوع معلوم ہو گیا۔ دک شاہ اب بھی موجود ہے اور اُس سے ۱۸۳۶ء میں یا اس کے لگ بھگ دریا کے دھارے کی صحیح جگہ متعین ہو سکتی ہے اور سطح زمین پر اس کے چھوڑے ہوئے نقوش اپنی صحیح تاریخ سے منسوب کیے جا سکتے ہیں اور ہمسایہ علاقوں میں پرانے دریاؤں کے ایسے ہی نقوش کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ اس دھارے نے مغرب کی طرف کے دھارے کو دبوچ لیا جو قریب قریب ایک دریا ہی تھا۔ زیرِ آب زمینیں خشک ہوئیں تو قصبہ چلنگ کی بنیاد پڑی اور ایک دو اور بستیاں اُبھریں اور زمین آہستہ آہستہ زیرِ کاشت لائی گئی۔

دھارے کی تبدیلیاں ۱۸۳۹ء میں

یہ بتانا ناممکن ہے کہ دک شاہ کے پاس بہنے والی شاخ ہلمند کب سوکھنا شروع ہوئی لیکن یہ شاہ کامران کے مذکورہ حملہ کے آس پاس ہی ہوئی ہوگی۔ جب یہ شاخ مسدود ہو گئی اور ہلمند کا نکاس بند ہوا تو اُس نے شمال کی طرف ایک اور گذرگاہ بنالی۔ تبدیلی موجودہ گاؤں کلوخی کے مقام پر ہوئی اور ہلمند جوئے علمدار میں گھس گیا اور چکن سر کے مشرق کی طرف آشکن اور ہامونِ پزہ میں بہنے لگا۔ اس گذرگاہ کی تفصیلات یقینی ہیں۔ تین مقامات پر اس دھارے

کی گذرگاہ متعین ہو سکتی ہے۔ پہلا موجودہ کلوخی کے پاس اس کا مقام تقسیم ہے۔ موجودہ گاؤں دیہہ جہانگیر بھی جو ئے علمدار کے پاٹ میں تھا۔ بیلا رعلمدار کے نیچے سے دھارا بہتا تھا اور پھر دو شاخوں میں بٹتا تھا۔ لبعد میں علی خان کے وقت جب جلال آباد کی زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے نہر دو شاخہ کو زندہ کیا گیا تو وہ دیہہ جہانگیر کے پاس سے نکلتی تھی جہاں نہر علمدار بہتی تھی۔ اِس جگہ پر ایک بند بھی ذخیرۂ آب کے لئے بنایا گیا تھا۔ جہان آباد کا پرانا قصبہ برج علمدار کے جنوب میں دریا کے ایک میل مغرب میں تھا۔ یہ ندی موجودہ دیہہ عیدو سے گذرتی تھی اور شیلائے رودِ گشتہ میں اس کے آثار موجود ہیں۔ یہ قدرتی، گہرا اور چوڑا پاٹ غالباً علمدار کے دھارے کو اس کی زندگی کے آخری دَور کا مظہر ہے۔ ڈیلٹا کا سرا اُس وقت موجودہ دیہہ لُچ کے پاس تھا۔ گو اس کا صحیح مقام متعین نہیں ہو سکتا۔ یہاں سے نیچے دریا بکھر جاتا تھا۔ چار گذرگاہیں تھیں۔ اِنتہائی مغربی دیہہ لُچ کے پاس سے نکلتی تھی اور شیلائے شمشیری کی شکل میں موجود ہے۔ دوسری دیہہ گل شاہ کے پاس سے گذرتی تھی۔ تیسری اب بھی پہچانی جاتی ہے بشرطیکہ توجہّ دلائی جائے اور یہ موجودہ دیہہ بہلول کے مشرق میں تھی۔ چوتھی برج علمدار کے پاس دو شاخوں میں بٹ جاتی تھی جن میں سے ایک الگ تھلگ سطح مرتفع کے عین مغرب میں بہتی تھی جس پر زیارت خواجہ رباط واقع تھی۔

ڈاکٹر فاربس کا قتل و مدفن

دوسری شاخ شیلائے اِنگلیسی تھی اور اِس سطح مرتفع کے مشرق میں تھی۔ یہ اِس لئے شیلائے اِنگلیسی کہلائی کہ یہاں بدبخت اور اُجڈ سیّاح ڈاکٹر فاربس کو اس کے میزبان اور مخبوط الحواس سنجرانی سردار ابراہیم خان نے قتل کر دیا۔

اِس سیّاح کو بار بار سردار لاشں اور معتبرین چاپنگ نے متنبّہ کیا تھا کہ وہ سنجرانی سردار سے نہ ملا کرے۔ لیکن وہ اِنتباہ کے باوجود ابراہیم خان کے مستقر جہان آباد چلا گیا۔ موخرالذکر ایک پُرجوش کھلاڑی تھا اور اس کا میہمان آبی پرندوں کے نمونے جمع کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دونو ایک

کشتی میں بیٹھ کر ابراہیم آباد کی طرف چلے۔ وہاں سے وہ اسی کشتی میں شیلا گئے۔ جہاں اس وحشی سردار نے قاتلانہ جنون کے کسی فوری دورے کے تحت دیدہ و دانستہ اپنے مہمان پر گولی چلا دی۔ اس کے بعد ابراہیم خان اپنے گھر واپس آیا اور تاریکیٔ شب میں دو تین گماشتوں کے ذریعے مقتول کی لاش تلاش کروائی تاکہ اسے مناسب طور پر دفن کر سکے اور جرم کے آثار کو چھپا کر بدنامی سے بچ سکے۔ اگلے دن لاش ملی تو اُسے زیارت خواجہ رباط کے ارد گرد قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ یہ جگہ نامعلوم ہے کیونکہ یہ سب کچھ رازداری سے کیا گیا اور دفن کرنے والے بھی شہرِ خموشاں میں چلے گئے۔

چار گذرگاہوں کے علاوہ پانچویں بھی تھی جو محض فالتو پانی کے لیے تھی اور کارکو کے پاس سے گذرتی تھی۔ اس کے آثار کارکو تک موجود ہیں اور اب خرِ گشتہ کہلاتی ہے۔

علمدار کے پانی نے ہامونِ پُزہ دکِ تِرہ اور آشکِن کی زمینوں کو چکان سَر اور جنگِ خرگوشگی تک تہہ آب کر دیا۔ نے زار قلعہ کنگ تک پھیلا ہوا تھا بلکہ موجودہ دیہہ دوست محمد سارونی سے دو تین میل دُور تھا۔ تختِ شاہ، گرگی، شارکی اور کَودِ گازکی ڈھیریاں جزیرے تھے جو پانی اور دلدلوں سے محصور تھے۔ موجودہ بستیوں خانک اور ملکی کی طرف اور کارکو ڈھیری کے شمال مغرب کا علاقہ بھی نے زاروں پر مشتمل تھا۔

ان دنوں ابراہیم خان سنجرانی نے نیزار میں قلعہ ابراہیم آباد بنوایا تھا۔ کیونکہ پاس ہی اس کی پسندیدہ شکارگاہ تھی اور وہ اسے دلدلوں اور سالانہ طغیانیوں کی وجہ سے ناقابلِ تسخیر سمجھتا تھا۔

جنرل فیریئہ

۱۸۴۵ء میں مشہور و معروف سیاح جنرل فیریئہ جہان آباد آیا۔ اس نے بُرجِ علمدار پر آب دریا کی تقسیم کا ذکر کیا ہے اور چونکہ اُس نے بھی ہلمند کی دُوسری شاخ کو عبور کیا جو علی آباد سے قریباً ڈیڑھ میل تھی اور اس کے مطابق چوڑی اور گہری تھی۔ لہٰذا شاخِ علمدار میں ابھی تک ہلمند کا پورا پانی شامل

نہیں ہُوا تھا۔

رود تاج محمد

اگلے چند سالوں میں یہ غائب ہو گئی۔ مغربی گذرگاہ ناکام ہو گئی تو زمینوں کی سیرابی کے لئے تاج محمد سربندی نے ایک بڑی نہر تعمیر کروائی جو اسی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نہر جلائی اور ملک حیدری کے درمیان واقع نشیبی علاقہ سے نکلتی تھی اور جلائی کے جنوب سے گذر کر بہرام آباد گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ اس وقت کبھی کبھار سیلاب کا پانی رودِ ناصرو میں بھی آتا تھا تو اس سے جلائی گاؤں کے شمال کی زمینوں پر تھوڑی سی کاشت ہوتی تھی جو پاٹ کے آس پاس تھیں۔

علمدار گذرگاہ میں پانی کے اضافہ سے اُس کے دہانے پر گاد کا ذخیرہ روز بروز بڑھنے لگا اور چند سالوں بعد ایک اور تبدیلی گذرگاہ کا راستہ ہموار ہو گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ تبدیلی مشرق کی طرف ہوئی۔ دریا تھوڑے سے فاصلے کے لئے ۱۸۳۰ کی گذرگاہ کے پاس بہتا تھا اور بنائے گئے[1] کھنڈرات میں سے ہو کر نکلتا تھا جو اُس سال کی گذرگاہ اور علمدار کے پاٹ کے درمیان تھے۔ اس قدیم پایۂ تخت کے کھنڈرات اس وقت تک ریت کے تودوں کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ لیکن اِس کے بعد وہ پانی کے براہِ راست عمل کی زد میں آ گئے۔ موجودہ باغ رستم خان کے پاس (جو اندرونِ شہر کے جنوب مشرقی کونہ کے پاس ہے) نئی گذرگاہ دو شاخوں میں بٹ گئی۔ دائیں شاخ مشرق کو چلی گئی اور سفید دِک کی بڑی ڈھیری کے پاس سے گذر کر گاؤں دیوالک کے پاس آشکِن کی زمینوں میں داخل ہونے لگی۔ یہ بڑی شاخ تھی اور اِس کا پاٹ اب بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ دوسری شاخ سُرہ دِک ڈھیری کے مغرب کی طرف کو نکلی اور یہ آشکن میں اس مقام پر پہنچتی تھی جہاں موجودہ نہر چرخ اپنا فالتو پانی بکھیرتی ہے۔

---

[1] یعنی نادِ علی۔

۱۸۶۶ء میں

جب سیستان کی دیرینہ لاقانونیت ختم کرنے کے لئے مظفر الدولہ ایک ایرانی فوج لے کر سیستان داخل ہوا تو دریا اس محل وقوع پر تھا۔ ۱۸۶۶ سیلابوں کا سال تھا اور دریا نے اپنی گذرگاہ بدلی اور وہاں آگیا جہاں یہ قریب قریب اب بہہ رہا ہے۔ یہ ۱۸۷۲ء کے باؤنڈری کمیشن کے وقت کا بلند تھا اور یہ تقریباً ایسا ہی رہا تھا۔ اب اس کی دو شاخیں ہیں۔ سکر شاخ جو ۱۸۶۶ کے پاٹ پر رواں دواں ہے اور پریون شاخ جو نسبتاً حالیہ دور کی پیداوار ہے۔ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں جب سرحد کے دونوں طرف ایک مستحکم حکومت موجود ہے۔ یہ صورت حال بلاشک و قائم رکھی جائے گی، کیونکہ اسی میں سب متعلقین کا فائدہ ہے۔

نوٹ: ارباب سیف الدین سے مروی ایک ثقہ روایت کے مطابق علمدار گذرگاہ ۱۹۰۴ سے ۶۵ سال پہلے یا ۱۸۴۰ کے موسم گرما یا موسم بہار میں تشکیل پذیر ہوئی۔ قلعہ فتح بہہ گیا۔ اس کی مغربی اور شمال مغر دیواریں تباہ ہوگئیں یا بہہ گئیں اور ان کے اندر کے مکانات بھی نذر آب ہو گئے اور یوں اس متروکہ ارگ کی بربادی مکمل ہوگئی۔ اس کے بعد رود ماہی خشک ہونے لگی جو تنولی نے ۱۸۳۹ میں بلند کی مشرقی شاخ نام دیا (ص ص ۴۰-۱۷۳)۔ خشک ہونے کا عمل ایک دو سال میں مکمل ہوا لیکن یہ خطر پسند سیاح فیریئر سیستان آمد سے پہلے ہو چکا تھا (ص ۱۷۶)۔ سیلاب کی یہ تاریخ جس نے علمدار گذرگاہ کو وجود دیا، ارباب سیف الدین کی مرہون منت ہے اور گو یہ بلاشک و شبہ صحیح ہے تاہم اسے حرف آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ اس تاریخ کے دو تین سال کے اندر اندر ہوا ہو۔ تنولی کی ۱۸۳۹ میں آمد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ۱۸۳۹ کے بعد کا ہے۔ ۱۸۴۰ء کی گرمی کا موسم غالباً قرین قیاس ہوگا یا غالباً ۱۸۴۵۔ جب فیریئر سیستان آیا تو علمدار گذرگاہ پوری طرح قائم ہو چکی تھی۔

جے پی ٹی